MUSHFIQ KHAWAJA BA-HYSIYAT-E-TANZ-O-MIZAH NIGAR

(MUSHFIQ KHAWAJA AS A HUMARIST AND SATIRIST)

A THESIS SUBMITTED TO THE UNIVERSITY OF HYDERABAD IN PARTIAL FULFILMENT OF THE REQUIREMENT FOR THE AWARD OF DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN URDU.

SUBMITTED BY

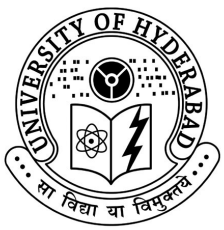
ISMAIL KHAN

M.A,M.Phil

Supervisor By

Dr.Arshia Jabeen

Assistant Professor, Dept. of Urdu,University of Hyderbad



DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES.
UNIVERSITY OF HYDERABAD
(P.O) CENTRAL UNIVERSITY, GACHIBOWLI
HYDERABAD - 500046.
Andhra Pradesh , India

2012

مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

۲۰۱۲ء

نگران

ڈاکٹر عرشیہ جبین

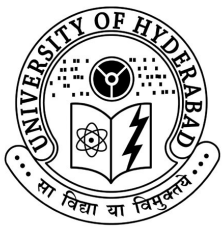
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

اسمٰعیل خان

ایم اے، ایم فل



شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

DECLARATION

I ***ISMAIL KHAN*** here by declare that this thesis entitled "**MUSHFIQ KHAWAJA BA-HYSIYAT-E-TANZ-O-MIZAH NIGAR,*(MUSHFIQ KHAWAJA AS A HUMARIST AND SATIRIST)***". Submitted by me under the gurdance and supervision of Assistant Professor ***Dr.Arshia Jabeen*** is a Bonafide research work. I also declare that it has not been submitted preveiously in part or in full this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Name: ***ISMAIL KHAN***

Date:

Signature of the Student

Regd.No.06HUPH07.

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"MUSHFIQ KHAWAJA BA- HYSIYAT-E-TANZ-O-MIZAH NIGAR,*(MUSHFIQ KHAWAJA AS A HUMARIST AND SATIRIST)*"**. Submitted by ***ISMAIL KHAN*** bearing **Reg.No. 06HUPH07** in partial fulfillment of the requirements of the award of Doctor of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by her under my supervison and guidance.

The thesis has not been submitted previously in part or in part of in full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Date:

Signature of the Supervisor

Countersigned

Head of the Department

Dean of the School

مشفق خواجہ



کمالِ بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

مشفق خواجہ

فہرست

ابتدائیہ i

باب اول: 1

پاکستان کے نمائندہ مزاح نگار! ایک تعارف

باب دوم: 35

سوانح و شخصیت

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

باب سوم: 127

اردو میں مزاحیہ کالم نگاری

(الف) کالم کی تعریف و خصوصیات

(ب) مزاحیہ کالم کا آغاز و ارتقاء

باب چہارم: 157

مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کا تعارف

باب پنجم: 182

مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار

(الف) موضوعات

ادب، اصنافِ ادب، غزل، نثری نظم، ہائیکو، علامتی افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفر نامہ آپ بیتی، ترجمہ نگاری، دیباچہ نگاری، فلیپ نگاری، شاعری، ادیب، شاعر، کثیر التصانیف مصنفین، ادبی شخصیات، تضمین، ادیبوں کی تقریر، ادیبوں کے خطوط، ادیبوں کے انٹرویوز، ادبی معرکے، تنقید اور تنقید نگار، محقق، تحقیق اور تحقیقی مقالے، کالم نگاری، ادیبوں کی سیر و سیاحت، ادبی انعامات، غالب شناسی، اقبال شناسی، جوش شناسی، اردو کتابوں کی صورتِ حال، ادبی کتابت کی غلطیاں، کتابوں کی قیمت، ادبی کتابوں کی قیمت، ادبی کتابوں کی تقریب رونمائی، چند ادبی کتابیں، ادبی اجلاس، ادبی رسائل، کی صورتحال، صحافت، ادب اور صحافت سرکاری علمی و ادبی ادارے، ترقی پسند ادب اور ادیب، مشاعرے، قاری۔

(ب) اسلوب و تکنیک

موازنہ، لفظی بازیگری، مزاحیہ صورت واقعہ، لطیفہ گوئی، چٹکلہ بازی، خود برداشتہ مزاح، بذلہ سنجی، مزاحیہ کردار، تحریف، محاورے اور ضرب الامثال، تراکیب، اشعار و مصرعوں کا برمحل استعمال، تشبیہات، زبان و بیان

باب ششم: 486

اختتامیہ

کتابیات 505

***

ابتدائیہ

عصر حاضر کے طنز و مزاح نگاروں میں مشفق خواجہ کی شخصیت نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ ایک طرف انہوں نے بحیثیت محقق، شاعر اور صحافی کے اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں تو دوسری طرف اردو ادب میں معروف طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی مزاح نگاری ان کی انتھک محنت، گہرے مطالعے اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے عناصر سے مرکب ہے، مشفق خواجہ کی مزاح نگاری کے موضوعات جدّت پسندی کے حامل ہیں۔ انہوں نے دیگر مزاح نگاروں کی طرح کسی سماجی و سیاسی مسائل کو اپنے مزاح کا موضوع نہیں بنایا بلکہ، ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں، ادب، ادیب، اور ادبی ناہمواریوں کا احاطہ کرتی ہیں خالص ادبی ناہمواریوں کو ان سے پہلے کسی مزاح نگار نے باقاعدہ موضوع نہیں بنایا تھا۔ ادب سماج کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کا مصلح بھی ہوتا ہے، یہی وجہ رہی ہے کہ مشفق خواجہ نے ایک ذمہ دار ادیب کی حیثیت سے سماج کو سدھارنے کے لیے پہلے ادب کو سدھارنا ضروری سمجھا اسی لیے انہوں نے ادب، ادیب اور ادبی سرگرمیوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کے اس طنز و مزاح کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ ادب اور ادیب دونوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کے طنز و مزاح کا اول و آخر مقصد رہا ہے۔

مشفق خواجہ کے اسلوب میں کڑی تنقید، تیکھا طنز اور کڑوا مزاح ضروری ہوتا ہے لیکن اس کو پڑھنے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کے ظریفانہ اسلوب میں اعلیٰ تنقید کے تمام اجزاء پائے جاتے ہیں جیسے غیر جانبداری، حقیقت پسندی، تحقیق کی روشنی میں خامیوں اور خوبیوں کا یکساں محاسبہ کرنا وغیرہ اور تنقید کا یہ

سارا کام وہ شگفتہ اسلوب میں کرتے ہیں تا کہ قاری ان کے اسلوب سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ فن پارے کے تنقیدی محاسبوں سے بھی واقف ہوجائے اس طرح سے قاری ان کے مزاحیہ کالموں کے ذریعہ بیک وقت تنقید اور ظرافت دونوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ وہ جب کسی موضوع کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں تو طول طویل مباحث سے گریز کرتے ہوئے مختصر لیکن جامع انداز میں موضوع کو اپنے طنز کی گرفت میں لیتے ہیں یہ ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے طنز کے ذریعہ ادیبوں اور شاعروں پر اس طرح کاری ضرب لگاتے ہیں کہ ضرب کھانے والا شخص درد کیساتھ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اسلوب میں بلاغت و اعجاز کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے تمام اسالیب پائے جاتے ہیں یہ اور اپنی بعض اہم خصوصیات کی بدولت یہ عصر حاضر کے بلند پایہ طنز و مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

تحقیق میں سب سے اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنی نگراں سے طنزیہ و مزاحیہ ادب سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا، میں نے ایم فل میں حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار طالب خوندمیری کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر تحقیق کی تھی۔ اسی دوران طنز و مزاح سے میری دلچسپی بڑھی۔ میری نگراں نے ''اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں عصری مسائل'' کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس موضوع پر تمام اساتذہ کی متفقہ رائے نہ ہونے کی وجہ سے موضوع کے انتخاب میں تاخیر ہوئی، صدر شعبہ اردو پروفیسر بیگ احساس نے مشفق خواجہ کی مزاح نگاری پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میری نگراں نے اس موضوع پر منظوری دی اس طرح میری پی، ایچ، ڈی کا موضوع ''مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار'' قرار پایا۔

موضوع کے انتخاب کے بعد دوسرا اہم مرحلہ مواد کی فراہم کا ہوتا ہے جو بہت مشکل مرحلہ ہے میرے موضوع کا تعلق چوں کہ ''پاکستان سیتھا اس لیے بھی مجھے کافی دشواری ہوئی۔ پاکستان خط و کتاب کی،

لیکن کوئی جواب نہیں آیا، مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میں نے میرے استاد محترم پروفیسر حشمت فاتحہ خانی سے رجوع ہوا تو انہوں نے مجھے مشفق خواجہ کے انٹرویو کا عکس دیا جو طاہر مسعود کی ایک کتاب ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' میں شامل تھا۔ اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد میں مشفق خواجہ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اسی اثناء میں استاد محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری نے مجھے ایک کتاب ''مشفق خواجہ ایک مطالعہ'' کے بارے میں بتایا جسے نومبر 1985ء میں ہندوستان میں مشفق خواجہ کی آمد کے اعزاز میں خلیق انجم نے مرتب کی تھی۔ اور ماہنامہ ''کتاب نما'' کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر خلیق انجم مجتبیٰ حسین، تنویر احمد علوی، شمیم حنفی، مخمور سعیدی، مالک رام، رشید حسن خان، یوسف ناظم جیسے بلند دانشوروں اور ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد مشفق خواجہ کی ادبی شخصیت کے بارے میں مجھے بے شمار معلومات حاصل ہوئیں۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میں نے ہند و پاک کی کئی ایک اردو ویب سائٹس سے بھی رجوع ہوا، اسی وقت میرا رابطہ پاکستان کی اردو ویب سائیٹ ''کتاب گھر ڈاٹ کام'' کے انتظامی کمیٹی کے رکن، جناب حسن علی خاں سے ہوا۔ ان سے میں نے اپنے موضوع کا ذکر کیا انہوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ پاکستان سے مواد فراہم کرنے میں وہ میری مکمل مدد کریں گے۔ نہ صرف وہ وقتاً فوقتاً میری ضرورت کے مطابق مواد فراہم کرتے رہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں مشفق خواجہ کے تعلق سے مواد کہاں کہاں مل سکتا ہے۔ ان کے مزاحیہ کالموں کا ایک ہی مجموعہ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ہندوستان سے بھی شائع ہوا ہے لیکن دیگر مجموعے پاکستان ہی سے شائع ہوئے ہیں یہ تمام مجموعے حسن علی خان کے توسط سے دستیاب ہوئے اس مدد و تعاون کے لیے میں ان کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ مواد کی فراہمی میں راشد اشرف کراچی، ڈاکٹر سید حسن عباس، بنارس ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر عابد معز صاحب نے بھی میری مدد فرمائی میں ان کا بھی ممنون و مشکور ہوں۔

اس مقالہ کو جملہ چھوابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''پاکستان کے نمائندہ مزاح نگار: ایک تعارف'' رکھا گیا ہے چونکہ مشفق خواجہ کا شمار پاکستان کے ان معروف مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے پاکستان میں مزاحیہ ادب کی روایت کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے اس سے باب میں تقریباً 40 پاکستانی مزاح نگار مثلاً عبدالمجید سالک، سید احمد پطرس بخاری، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت، کرنل محمد خاں، سید ضمیر جعفری، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، عطاالحق قاسمی وغیرہ، بلند پایہ مزاح نگاروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے تاکہ پاکستان میں طنزیہ ومزاحیہ ادب کی صورت حال کا جائزہ لیا جاسکے۔

دوسرا باب مشفق خواجہ کی حیات اور شخصیت سے متعلق ہے۔ اس باب میں مشفق خواجہ کے آباء واجداد، والدین بھائی، بہن، کی تفصیلات دیتے ہوئے ان کی ولادت، تعلیم وتربیت، ملازمت، شادی، سماجی وادبی خدمات ادبی سفر کی ابتداء کے علاوہ ان کی تمام تصانیف کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ آگے ان کے مشاغل، حلقہ احباب کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کے انتقال کی تفصیلات بھی دی گئی ہے۔

تیسرا باب، اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کے عنوان کے تحت ہے جس دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں کالم کی تعریف اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مزاحیہ کالم کی خصوصیت کو پیش کرتے ہوئے اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کے آغاز وارتقاء کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کا تعارف پیش کیا گیا، اور مختلف دانشوروں کی آراء کی روشنی میں ان کے ان مزاحیہ کالموں کے مقاصد موضوعات اور اسلوب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

پانچواں باب: مشفق خواجہ بحیثیت طنز ومزاح نگار رکھا گیا ہے۔ یہ باب مقالہ کا اہم باب ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ان کے طنز ومزاح کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرا حصہ،

اسلوب وتکنیک سے متعلق ہے، مشفق خواجہ کے موضوعات دیگر مزاح نگاروں سے اس لیے منفرد ہیں کہ انہوں نے سماجی، سیاسی، ومعاشی مسائل کے بجائے اردو کی ادبی صورت حال کو اپنے طنز ومزاح کا موضوع بنایا ہے۔ان سے پہلے کسی مزاح نگار نے باقاعدہ خالص ادبی معاشرے کی ناہمواریوں پر قلم نہیں اٹھایا تھا اس لیے ان کے موضوعات خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔اسی باب کے دوسرحصہ میں ان کے مزاحیہ کالموں کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے طنز ومزاح کی تکنیک کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جیسے لطیفہ گوئی، چٹکلہ بازی، خود برداشتہ مزاح، بذلہ سنجی، ضرب الامثال اور کہاوتیں، تراکیب تلمیح، موازنہ، لفظی بازی گری، مزاحیہ صورت واقعہ، مزاحیہ کردار اور تحریف وغیرہ۔

چھٹا باب: اختتامیہ ہے جس میں مشفق خواجہ کی مجموعی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور معاصر دانشوروں کی آراء کی روشنی میں اردو کے طنز ومزاحیہ ادب میں مشفق خواجہ کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جو بڑا مہربان ہے جس نے مجھ پر علم کی منزلیں کشادہ کیں اور یہ مقالہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تسوید تک ہر موقع پر میرا بھرپور تعاون اور رہنمائی کی، حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے گراں قدر مشورے اور بے پایاں تعاون کے بغیر یہ مقالہ مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔استاد کے لیے یوں تو شاگرد معنوی اولاد ہوتی ہیں شاید یہی وجہہ ہے کہ ان کے خلوص، محبت اور شفقت نے میرے عزم ناتواں کو قوت واستقامت بخشا ہے۔جس کی بدولت منزل مقصود تک پہنچنا میرے لیے ممکن ہو پایا، میں یہی دعا کرتا ہوں کہ ہر کسی کو ایسا ہی استاد نصیب ہو، جو بزرگ ساتھی بھی ہو، ہمدرد انسان اور سچا رہنما بھی ہو۔

میں شعبہ کے اساتذہ میں سب سے پہلے صدر شعبہ اردو استاد محترم پروفیسر بیگ احساس صاحب کا

شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد فرمائی بلکہ دوران تحقیق بھی مجھے ان کا تعاون اور مشورہ حاصل رہا، میں پروفیسر بیگ احساس صاحب کے مخلصانہ تعاون کے لیے ممنون و مشکور ہوں۔

میں پروفیسر محمد انور الدین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق نہ صرف اپنے مفید مشوروں سے نوازا بلکہ میری خبر گری بھی کی، ان کے مخلصانہ تعاون کے لیے میں ان کا ممنون و مشکور ہوں۔ میں پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب کا بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشورے دیے اور ناقدانہ رہنمائی کی۔ ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ بھی میرے شکریہ کی مستحق ہیں جنہوں نے وقت پر کام کرنے کا مشورہ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کا بھی سپاس گذار ہوں جنہوں نے مجھ میں تحقیق کے لیے محنت و مشقت کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کیا۔ اسی طرح میں شعبہ کے دیگر تمام اساتذہ کا بھی ممنون و مشکور ہوں۔ جنہوں نے تحقیق کے ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میری رہنمائی کی اور بھرپور تعاون دیا ان میں ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، ظہیر احمد خاں، ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی، ڈاکٹر شمس الدین حکیم، مشتاق احمد مشتاق، ڈاکٹر شیخ سلیم صاحب کا بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

میں اپنے والدین کی کرم فرمائیوں کا شریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں میرے والد عبدالجلیل خان صاحب اور والدہ بانو بیگم صاحبہ جنہوں نے مجھے صغیر سنی سے آج تک اپنی بے پایاں شفقت کے سائے میں پروان چڑھایا اور دینی و دنیاوی تعلیم سے سرفراز کیا۔ آج میں جس مقام پر ہوں اللہ رب العزت کی عنایت کے بعد اپنے والدین کی محنتوں اور کاوشوں کے طفیل میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے والدین کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور مجھے اپنے والدین کی ہمیشہ فرمابرداری کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) گھر کے دیگر افراد بالخصوص بڑے بھیا محبوب خان اور بھابی آسیہ بیگم کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جن کے تعاون کی وجہ سے میرا یہ

تعلیمی سفر آسان ہوگیا، میرے بھائی خلیل خان، سلیم خان، جمیل خان، اور بہنیں پروین خانم، نسرین خانم، اور بھتیجیاں آفرین خانم اور گل افشاں خانم کا بھی میں ممنون و مشکور ہوں جن کا ہر وقت تعاون رہا، مشکل گھڑی میں میری حوصلہ افزائی کی اور میرے حق میں دعا کی۔

میں اپنے ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جن کے ساتھ تحقیق کی دشوار گذار رہیں با آسانی طے ہوگئیں خصوصاً سید ماجد عبدالسمیع بیدر، ڈاکٹر تحسین النساء، ڈاکٹر عطیہ بیگم، لئیق النسائ، محمد عباس علی جنہوں نے دوران تعلیم ہر طرح کی میری مدد فرمائی۔ دیگر دوست احباب میں معین خالق، شیخ شاہ ولی، علاء الدین بگدل، شفیع، زرینہ، غوثیہ بانو، افضل بانو، فریدہ تبسم کا بھی شکر گذار ہوں جن کا دوران تحقیق ساتھ رہا۔

آخر میں میں اس مقالے کے کمپوزر جناب محمد مخدوم محی الدین صاحب اور ان کے فرزند محمد کلیم محی الدین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے رات دن اس مقالے کو کمپوز کیا اور وقت پر میرا مقالہ داخل کرنے میں میری مدد کی۔

شکریہ

اسمٰعیل خان

***

باب اول

پاکستان کے نمائندہ مزاح نگار

ایک تعارف

پاکستان کے نمائندہ مزاح نگار: ایک تعارف

اردو زبان وادب کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اس کے ارتقاء کا کوئی ایسا عہد نظر نہیں آتا جس میں طنز و مزاح کے عمدہ اور کامیاب نمونے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ نظم ونثر دونوں میں طنز و مزاح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں اس مزاح کی کیفیت کبھی زیر لب تبسم رہی تو کبھی اس کی نوعیت بھر پور قہقہہ لگانے والی رہی۔ چنانچہ طنز و مزاح اب اردو ادب میں ایک مستقل صنف کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان بنا چکا ہے یہ اور بات ہے کہ بعض کے نزدیک یہ کوئی صنف نہیں ہے بلکہ ایک رجحان ہے۔ لیکن بہت سے ناقدین اس کے ادب سے مضبوط رشتہ کو تسلیم کرتے ہیں، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے طنز و مزاح اور اردو ادب کے درمیان رشتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''طنز و مزاح ادب کی ہر صنف میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اگر ادب کو ایک جسم اور اس کی مختلف اصناف کو اس کے اعضا فرض کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ طنز و مزاح اس جسم کے انگ انگ میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ کسی حصے میں نمایاں طور پر اور کہیں غیر محسوس انداز سے''۔[1]

شاعری میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش غزلوں کے متفرق اشعار اور قصائد پھر ہجو یہ قصیدہ، شہر آشوب اور ریختی وغیرہ کی صورت میں ملتے ہیں۔ چنانچہ شاعری میں جعفر زٹلی کو طنز و مزاح کا امام کہا گیا ہے۔ جعفر زٹلی کے اردو فارسی کے ملے جلے اشعار میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ اشعار کے علاوہ ان کی بے شمار شہر آشوبوں میں بھی طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔

---

(۱) اردو نثر میں طنز و مزاح از، اشفاق احمد ورک، ص نمبر 122۔

اردو نثر میں طنز و ظرافت کے ابتدائی نقوش غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں لیکن غالب کے خطوط سے پہلے اردو کی داستانوں میں بھی کہیں کہیں طنز و ظرافت نے نمونے پائے جاتے ہیں۔ جیسے داستانِ امیر حمزہ، رجب علی بیگ سرور کی داستان، ''فسانۂ عجائب'' وغیرہ۔ غالبؔ یہاں بھی طنز و مزاح کا اثر دکھائی دیتا ہے غالبؔ کے بعد اردو ناولوں میں بھی طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے دکھائی دیتے ہیں جس میں نذیر احمد کی ناولوں کے کردار قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں ''اودھ پنچ'' کا اجراء عمل میں آیا جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے اس اخبار کا مقصد طنز و ظرافت کے ذریعے سے ملک کے سماجی اور سیاسی معاملات کو ایک نیا رخ دینا تھا۔ چنانچہ ''اودھ پنچ'' سے اردو طنز و مزاح کی با قاعدہ روایت شروع ہوئی اور مزاح ایک تحریک کے طور پر تخلیق ہونے لگا صحافت کے علاوہ نظم و نثر میں بھی اعلیٰ پائے کا مزاح تخلیق ہوا۔ اس دور کے مشہور مزاح نگاروں میں، منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، سید محمد آزاد، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اودھ پنچ کے بعد کے دور میں با صلاحیت طنز و مزاح نگاروں کا ایک پورا کارواں نظر آتا ہے چنانچہ اودھ پنچ کے بعد کے نمائندہ مزاح نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبد الغفار، پریم چند، امتیاز علی تاج، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، محفوظ علی بدایونی، عبد الماجد دریابادی، عبد العزیز، فلک پیما، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی وغیرہ شامل ہیں۔ اودھ پنچ سے لے کر 1947ء تک مزاح لکھنے والوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے جیسے اودھ پنچ کا دور، عبوری دور، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک وغیرہ چنانچہ اودھ پنچ سے لے کر 1947ء تک آتے آتے طنز و مزاح اردو ادب میں شاعری کے علاوہ نثر میں ناول، افسانہ، مضمون، انشائیہ، خاکہ، خودنوشت، سفرنامے، کالم نگاری، گویا ادب کی تقریباً تمام اصناف میں پیش کیا گیا۔ طنز و مزاح کو پھلنے پھولنے میں مضمون نویسی، انشائیہ، خاکہ، کالم وغیرہ اصناف خوب راس آئیں۔

1947ء کے دور میں پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کرشن چندر، کنہیالال کپور، فکر تونسوی، غلام احمد فرقت کاکوروی، شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری اور شفیق الرحمٰن جیسے بلند قامت طنز و مزاح نگار اردو مزاح نگاری کے میدان میں اپنی ڈھاک بٹھا چکے تھے۔ لیکن 1947ء میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا اور ہندو برتری والے علاقے کو ہندوستان کہا گیا۔ زمین کے ساتھ ساتھ دیگر چیزوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ عقیدت کے لحاظ سے انسانوں کا تبادلہ ہوا۔ زمین جائیداد بانٹے گئے۔ چنانچہ ان حالات میں شاعر و ادیب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو کر ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کے حوالے سے جانے پہچانے جانے لگے اور اس طرح سے اردو ادب کے طنز و مزاح نگار بھی دو ملکوں میں تقسیم ہو گئے مثلاً رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کرشن چند، کنہیالال کپور، فکر تونسوی اور غلام فرقت کاکوری وغیرہ ہندوستان کے حصے میں آ گئے۔ پاکستان کے حصے میں جانے والے مزاح نگاروں میں پطرس بخاری، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری اور شفیق الرحمٰن وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان میں انہیں مزاح نگاروں نے جدید طنز و مزاح کی راہیں ہموار کی اور نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ کا کام کیا۔ پاکستان میں مذکورہ مزاح نگاروں کے بعد طنز و مزاح کی نمائندگی کرنے والے مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ابن انشا، سید ضمیر جعفری، مشفق خواجہ، صدیق سالک اور عطاء قاسمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے یا بعد دونوں دور میں وہاں کے مزاح نگاروں نے شاعری کے علاوہ نثر میں مضمون انشائیہ ناول، افسانہ، خودنوشت، خاکہ، سفرنامہ، کالم، تقریباً تمام اصناف میں اعلیٰ پایہ کا مزاح پیش کیا ہے۔ قیام پاکستان کے پہلے یا بعد میں پاکستان کے نمائندہ مزاح نگاروں میں عبدالمجید

سالک،سید احمد شاہ پطرس بخاری، حاجی لق لق،سید امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت،شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور،شفیق الرحمٰن،ابراہیم جلیس،وغیرہ قابل ذکر ہیں۔قیام پاکستان کے بعد وہاں پر مزاح نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ان میں نمائندہ مزاح نگار شیر محمد اختر،کرنل محمد خان، مجید لاہوری، سید ضمیر جعفری،نعیم صدیقی،سید امجد حسین،شفیق الرحمٰن،محمد خالد اختر،نصیر انور،مشتاق احمد یوسفی،ابراہیم جلیس،مشکور حسین یاد،ابن انشاء،اے حمید،مسعود مفتی،صدیقی سالک،مشفق خواجہ،ارشاد احمد خان، سلمٰی یاسمین نجمی، رشید احمد گوریجہ،عطاء الحق قاسمی،محمد کبیر خان،کرنل اشفاق حسین،تنویر حسین،طاہر مسعود، ڈاکٹر یونس بٹ،اشفاق احمد ورک،عطاء اللہ عالی،عرفان جمیل،وحید الرحمٰن،مہنر ادسحر،اخلاق احمد ورک ڈاکٹر اجمیل نیازی،ڈاکٹر ایس معین قریشی،عارضہ صبح خان،علی رضا احمد،پروفیسر افضل علوی، شفیق عقیل،مرزا ظفر حسن،ضمیر جعفری،مسٹر دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں پر پاکستان کے ان نمائندہ مزح نگاروں کا زمانی ترتیب کے اعتبار سے اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہے تا کہ ہم پاکستان میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی صورتِ حال کا اندازہ لگا سکیں۔

عبدالمجید سالک (1894ء تا 1959ء)

عبدالمجید سالک کا شمار پاکستان کے نامور ادیبوں اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔سالک نے اردو صحافت میں فکاہی کالم نگاری کی روایت قائم کی۔انہوں نے اپنی کالم نگاری کا آغاز مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' سے شروع کیا تھا پھر اپنا ایک اخبار ''انقلاب'' بھی جاری کیا۔اس اخبار میں ان کے مزاحیہ کالموں کا سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا۔

طنز و مزاح کے سلسلے میں ان کے خاکوں کا مجموعہ ''یارانِ کہن'' قابل ذکر ہے۔اس مجموعے کی پہلی اشاعت 1955ء کو عمل میں آئی۔ سالک تحریک پاکستان سے وابستہ تھے۔چنانچہ ان کے تعلقات اس زمانے کی تقریباً تمام نامور شخصیات سے تھے۔لہذا ان ہی شخصیات کی یادکو خاکوں کی شکل میں پیش

کیا ہے۔ ان شخصیات میں مولانا گرامی، حکیم فقیر محمد چشتی خواجہ حسن نظامی، سر شہاب الدین، مولانا شوکت علی وغیرہ ہیں۔ ان شخصیات کے خاکوں میں ان کے حلیے عادات و اطوار اور زندگی کے دیگر معاملات کو جہاں مزاحیہ و شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے وہیں طنز سے بھی کام لیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے طنز کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں ایک سلجھے ہوئے طنز نگار کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبدالمجید سالک کے طنز میں بڑی شدت ہے۔ لیکن اس طنز میں نہ صرف یہ کہ زہرناکی عنصر موجود ہے بلکہ مزاح کی بھی فراوانی ہے۔ ان کی نگارشات کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک نہاتی سلجھے ہوئے طنز نگار ہیں''۔[1]

سید احمد شاہ پطرس بخاری (1898ء تا 1958ء)

پطرس بخاری کا شمار مزاح نگاری کے جدید دور میں ہوتا ہے۔ پطرس یکم اکتوبر 1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا پھر کیمبرج یونیورسٹی سے آنرز کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1938ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہی AIR کے کنٹرولر جنرل مقرر ہوئے۔ 1951ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ مقرر کئے گئے۔ اس عہدے پر وہ 1954 تک قائم رہے پھر 1955ء میں اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ پطرس کا انتقال 5 دسمبر 1958ء کو ہوا۔

پطرس بخاری نے خالص مزاح کا ایک معیار قائم کیا تھا۔ اشفاق احمد ورک ان کی خالص مزاح نگاری کے بارے میں کہتے ہیں:

---

(1) ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح،، ص 387۔

''وہ واقعات کے گرد جزئیات نگاری کا تانا بانا اس خوبصورت سے بنتے چلے جاتے ہیں کہ قاری کا ہنسی روکنا مشکل ہوجاتا ہے۔اردو میں اس قدر خالص اور معیاری مزاح کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی''۔[1]

طنزیہ ومزاحیہ ادب میں ان کا سرمایہ بہت محدود ہے۔مضامین کا صرف ایک مجموعہ ''مضامین پطرس'' اور چند ایک تحریریں ملتے ہیں ان کے مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پطرس کے مزاح میں ہنسنا ہنسانہ اور تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ہمدردانہ جذبہ بھی ملتا ہے۔انہوں نے اپنے مضامین میں انسانی نفسیات اور انسانی فطرت کے بہت عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔پطرس مغربیت کے دلدادہ تھے۔جس کا اثر ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔انھوں نے مغربیت کا مذاق بھی اڑایا ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک پطرس کی ذہانت اور ان کے نفسیاتی علم کی ستائش یوں کی ہے:

''پطرس نے اپنی ذہانت، انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے اور ماحول کا زبردست مشاہدے کے ساتھ مغرب کا رنگ اس خوب صورتی سے اڑایا ہے کہ لوگ انھیں اردو کا واحد لاشریک مزاح نگار کہنے پر مجبور ہوگئے''۔[2]

پطرس کی عبارت میں سادگی، صفائی، اختصار محاورات کا برمحل استعمال، روانی اور شگفتگی موجود ہے۔ان کی تحریر میں دلکشی اور دل آویزی پائی جاتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جس سے مزاح نگاری کے میدان میں پطرس ایک علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔

حاجی لق لق (1898ء تا 1961ء)

حاجی لق لق بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں لیکن انھوں نے شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ابتداء میں ''زمیندار'' سے وابستہ رہے بعد میں اپنے خود کے اخبار ''نوائے پاکستان'' میں لکھنا شروع کیا۔طبیعت میں مزاح فطری طور پر موجود تھا۔لیکن صحافتی ضرورتوں اور عجلتوں نے انھیں اپنے

---

[1]، [2] اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 108

مزاح کا کوئی معیار بنانے کا موقع نہیں دیا لیکن جہاں انھوں نے مستقل موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اس میں مزاح کی خوشگواری اور طنز کی سرشاری کا احساس نظر آتا ہے۔

سید امتیاز علی تاج (1900 تا 1970)

امتیاز علی تاج کی شہرت اردو ادب میں ڈرامہ ''انارکلی'' کی وجہ سے ہے۔ وہ 13 / اکتوبر 1900ء کو لاہور میں پیدا ہوئے ان کی پرورش علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور 1915ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1922ء میں گریجویشن مکمل کر کے اپنے والد کے اشاعتی ادارے کی ذمہ داری سنبھالی پھر 1922ء میں امتیاز علی تاج نے اپنا مشہور ڈرامہ ''انارکلی'' تخلیق کیا۔ اردو ڈرامہ نگاروں کی فہرست میں تاج کا نام سرفہرست ہے۔

اردو مزاح کی تاریخ میں ان کا نام ان کے مزاحیہ کردار ''چچا چھکن'' کی وجہ سے لیا جاتا ہے۔ چچا چھکن ایک بھلکڑ اور ضدی کردار ہے جس کی حرکات وسکنات کی تاج نے اس مہارت سے تصویر کشی کی ہے کہ اردو مزاح کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ امتیاز علی تاج کے کردار چچا چھکن کے بارے میں نامی انصاری نے لکھا ہے:

> ''امتیاز علی تاج اپنے خاص مزاحیہ کردار ''چچا چھکن'' کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ اس کا مرکزی خیال انھوں نے کہیں سے لیا ہو لیکن اس کردار کو ہندوستانی ماحول اور مزاج میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ یہ اردو کے چند بہت خاص مزاحیہ کرداروں میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک بن گیا ہے'' [1]

اس کردار کے علاوہ امتیاز علی تاج کے ہاں چند دیگر مزاحیہ ڈرامے بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے بلاشبہ وہ اردو کے چند اہم مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

چراغ حسن حسرت (1904ء تا 1955ء)

---

[1] نامی انصاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، ص۔17۔

چراغ حسن حسرت کا شمار فکاہیہ صحافت کے چند نمائندہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ابتداء میں یہ ''عصر جدید''، ''نئی دنیا'' وغیرہ میں ''کولمبس'' کے فرضی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے پھر جب یہ کلکتہ سے لاہور منتقل ہوئے تو یہاں ''زمیندار''، ''شہباز''، ''انصاف''، ''پھول''، ''امروز''، ''پنجاب'' اور ''نوائے وقت'' وغیرہ میں ''باغ و بہار'' اور حرف و حکایت'' وغیرہ کے مستقل عنوانات کے تحت مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ بعد میں اپنے پرچے ''شیرازہ'' میں سند باد جہازی کے نام سے لکھا۔ ان کے اس پرچے ''شیرازہ'' میں اس دور کے تقریباً تمام اہم مزاح نگار لکھا کرتے تھے۔

ابنِ اسماعیل نے اس پرچہ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اردو مزاحیہ ادب کے جدید دور کا آغاز چراغ حسن حسرت کے فکاہیہ ہفت روزہ ''شیرازہ'' سے ہوتا ہے'' [1]

چراغ حسن حسرت کالم کے علاوہ خاکے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ ''مردم دیدہ'' 1939ء کو شائع ہوا ہے ان کے خاکوں میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز بھی جا بجا ملتا ہے۔ انھوں نے طنز کے تمام حربے استعمال کیے ہیں اور مزاح پیدا کرنے کے لیے لفظی الٹ پھیر کا سہارا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے طنز و مزاح کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مولانا چراغ حسن حسرت کی نگارشات میں طنز و مزاح کے سارے رنگ ملتے ہیں اور انھوں نے اپنے طنز میں شدت پیدا کرنے کے لیے طنز کے بہت سے حربوں مثلاً مبالغہ موازانہ، واقعہ وغیرہ سے بھی کام لیا ہے'' [2]

شوکت تھانوی (1904ء تا 1963ء)

شوکت تھانوی 2 فروری 1904ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی اور یہیں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد شوکت تھانوی پاکستان منتقل ہوئے اور وہاں بھی

---

[1] ابن اسماعیل، اردو طنز و مزاح، اختساب و انتخاب، ص 51۔

[2] وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص 389

تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھاانھوں نے پانچ درجن کے قریب کتابیں لکھیں ہیں۔ یہ بسیارنوسی کے قائل تھے۔بعض کتابیں انہوں نے پبلیشر کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے لکھا ہے۔جس کی وجہ سے انہوں نے معیار کا خیال نہیں رکھا۔نامی انصاری ان کی بسیارنویسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شوکت تھانوی بہت بسیارنویس ادیب تھے۔ان کی تصنیفات کی تعداد اسی(80) سے اوپر بتائی جاتی ہے لیکن سب کچھ ایک معیار کا نہیں ہے۔بعض چیزیں انھوں نے بہت اچھی لکھی ہیں اور بعض محض رواداری میں پبلیشر کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے لکھی ہیں''۔[1]

شوکت تھانوی بسیارنویس ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مزاح نگار بھی تھے۔طنز و مزاح تو ان کی فطرت میں رچا بسا تھا اس پر ان کی زبان کی لطافت، اسلوب کے کرشمے پن نے انھیں اردو کا معروف مزاح نگاروں میں جگہ دی ہے۔ان کی مزاح نگاری کی ابتداء 1928ء میں لکھنو سے نکلنے والے روزنامہ ''ہمدم'' سے ہوئی جس میں یہ ''دو دو باتیں'' کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔اس کے بعد وہ مزاحیہ ناول اور افسانے وغیرہ لکھتے رہے انھوں نے مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں ۔ان کے خاکوں کے دو مجموعے ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ان کے خاکوں میں طنز کی بہ نسبت مزاح زیادہ ملتا ہے۔اشفاق احمد ورک نے ان کی تحریروں اور خاکوں کی خصوصیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''ان کی تحریروں میں ان کے اسلوب کی بے ساختگی، جملہ بازی اور زندہ دلی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔یہ تمام خاکے اگر چہ ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے پر مشتمل ہیں لیکن ''بقامت کمتر بقیمت بہتر'' کی بڑی عمدہ مثال ہیں''۔[2]

---

[1] نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح، ص 89۔

[2] اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 403

شیر محمد اختر (1907ء تا 1974ء)

شیر محمد اختر کا شمار قیام پاکستان کے فوراً بعد منظر عام پر آنے والے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ مزاح نگاری کی دنیا میں ان کی پہچان ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ ''طنزیے'' سے ہے۔ اس مجموعہ میں کل چودہ مضامین ہیں۔ اس کی اشاعت پہلی بار 1956ء میں ہوئی۔ ان مضامین میں جگہ جگہ معاشرتی رویوں پر ہلکے پھلکے انداز میں چوٹ کی ہے بعض جگہ تیز و تند انداز میں معاشرتی ناہمواریوں پر طنز بھی کیا ہے۔ ان کے طنزیہ مجموعہ پر اشفاق احمد ورک نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

> ''اس کتاب میں شیر محمد اختر نے ملکی سیاست پریس کانفرنس، نئی تنقید، نام نہاد ترقی پسندی، الیکشن اور جدید نفسیات وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں کہیں کہیں تو انھوں نے قدیم و جدید کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی مضحکہ خیز صورت حال دکھائی ہے۔ جس کا ایک کامیاب نمونہ ان کا مضمون ''یہ نفسیات'' ہے''[1]

کنہیالال کپور (1910ء تا 1980ء)

کنہیالال کپور 1910ء کو تحصیل سندری ضلع لائل پور پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور پیشہ درس و تدریس سے جوڑ گئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان چلے آئے لیکن ان کا بیشتر تخلیقی سرمایہ تقسیم سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''نوک نشتر'' بال و پر، نرم گرم، گرد کارواں، نازک خیالیاں اور نئے شگوفے وغیرہ ہیں۔

کنہیالال کپور کے مضامین میں طنز و مزاح یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے طنز میں ادبیت کے ساتھ گہرائی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے حکومت، سیاست، اہل سیاست، شعرا، ادیب غرض سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ محمد بدیع الزماں ان کے طنز کو ''مہذب اور شائستہ'' کہا ہے۔

---

[1] اردو نثر میں طنز و مزاح، از اشفاق احمد ورک، ص 160۔

وہ لکھتے ہیں:

''ان کے طنز کا رخ اکثر و بیشتر اپنی طرف ہوتا ہے مگر اس کی چبھن مخاطب اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہے اس لیے کہ وطنز اتنا مہذب اور شائستہ اور اس کی زبان اتنی شگفتہ اور شیریں ہوتی ہے کہ ان کا وار موثر اور بھرپور ہوتا ہے اور کبھی خالی نہیں جاتا'' [1]

کنہیالال کپور کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی ایک اور خصوصیت بے تکلف گفتگو بھی ہے وہ مضامین میں ڈرامائی عنصر سے کام لے کر قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ایس جے صادق کے:

ذہانت اور گفتگو کی تیزی وطراری ان کے بیشتر مضامین کا طرہ امتیاز ہے۔ ایسی باتیں بنانے کے فن نے انھیں طنز نگار بنا دیا۔ ان کے کئی مضامین اس کا ثبوت ہیں کہ یہ مضامین نہیں بلکہ بے تکلف دوست کی گفتگو ہے جو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر آپ سے کر رہا ہے۔ کئی مضامین ڈرامائی عنصر لیے ہوئے ہیں جن میں مکالمے اتنے چست ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے'' [2]

الغرض کنہیالال کپور کے تمام مضامین ادبی طنز و مزاح سے ہی متعلق ہیں۔ انھوں نے عمدہ پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔ ''غالب جدید شعراء کی محفل میں''۔ ''اردو ادب کا آخری دور'' اور ''حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں''، ایسے کئی مضامین ہیں جو ان کی مزاح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

کرنل محمد خان (1912ء تا 1999ء)

کرنل محمد خان کا شمار پاکستان کے ان مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن کے توسط سے مزاح نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جو عہد جدید سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کرنل محمد خان نے اپنی

---

[1] ماہنامہ شگوفہ، جون 1990، ص 22۔

[2] ڈاکٹر ایس جے صادق، اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد، ص 245

تخلیقات میں فطرت اور سماج کی ناہمواریوں اور تلخیوں کو مزاح کے شیریں اسلوب میں نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

مزاح نگاری میں ان کی شہرت ان کی پہلی تصنیف ''بجنگ آمد'' سے ہوئی۔ ان کی یہ کتاب 1966ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں انھوں نے اپنے فوجی کیریئر کی داستان کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بعض لوگ اس کتاب کو آپ بیتی کہتے ہیں۔ بعض سفر نامہ جو کچھ بھی ہو مزاحیہ ادب میں یہ ایک شاہکار تصنیف ہے جس کا موضع فوجی زندگی ہے۔ جو مزاحیہ ادب میں پیش کئے جانے والے تمام موضوعات میں اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتا ہے۔ انجم عثمانی کرنل محمد خاں کی مزاح نگاری کی اس خصوصیت کے بارے میں لکھا ہے:

> کرنل محمد خان اپنی نسل کے مزاح نگاروں میں اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے اپنی مزاح نگاری کا موضوع سماج کے ایک ایسے طبقے کو چنا جس سے بظاہر مسکراہٹیں کم اور دھماکے زیادہ منسوب ہیں۔ یعنی فوجی زندگی جس سے وہ خود وابستہ ہیں'' [1]

کرنل محمد خان کی دوسری طنزیہ و مزاحیہ تصنیف ''بسلامت روی'' ہے جو 1975ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے اپنے یوروپ اور ترکی وغیرہ کے سفر کی روداد بیان کی ہے اپنے ادبی حسن اور رنگینی و پرکاری کی بنا پر یہ تصنیف ہندو پاک میں بے حد مقبول ہوئی۔ انجم عثمانی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو فن لطیف کی اعلیٰ قسم قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''یہ کتاب گرچہ ان کا سفر نامہ ہے لیکن اپنے مخصوص ''محمد خانی انداز بیان'' کی وجہ سے ایسی مزاح نگاری کے ضمن میں آتی ہے جسے فنِ لطیف کی اعلیٰ قسم کہا جاسکتا ہے''۔ [2]

---

[1] ماہانامہ شگوفہ حیدرآباد، ستمبر 18، 1981ء ص، 43۔

[2] ایضاً۔ ص 45۔

الغرض کرنل محمد خان اردگرد کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات کو بھی اپنے پر بہار اسلوب سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ان کے اسلوب کی اس خصوصیت کے پیش نظر کرنل محمد خان نے اردو ادب کی مزاح کو ایک نئی فضاء اور تازہ ہوا سے روشناس کروایا ہے۔

مجید لاہوری (1913ء تا 1957ء)

مجید لاہوری نے اپنی مزاح نگاری کا آغاز 1947ء کے آس پاس لاہور سے نکلنے والے ایک اخبار سے کیا لیکن ان کی شہرت اخبار ''جنگ'' کراچی سے ہوئی۔اس اخبار میں وہ ''حرف و حکایت'' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ان کے کالموں کا ایک مجموعہ ''حرف و حکایت'' ہی کے نام سے 1971ء میں شائع ہوا۔انھوں نے ملک اور سماج کے تقریباً اہم موضوعات کو اپنے کالموں میں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے کالموں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے اشفاق احمد ورک رقمطراز ہیں:

> ''مجید لاہوری کا مزاج تو عام سطح کا ہے لیکن انھوں نے اپنے کالموں میں جس ملکی مسائل کو موضوع بنایا ہے، وہ آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔مسلم لیگ وہی پٹ سیاپا، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا وہی غاصبانہ نظام، وہی طبقاتی کشمکش، پلاٹوں اور پرمٹوں کی سیاست علاوہ ازیں جمہوریت الیکشن، مہنگائی، ذخیرہ اندوزی اور قومی ہیروز کی تضحیک کا دکھ وغیرہ ان کے خاص موضوعات ہیں''۔[1]

سید ضمیر جعفری (1918ء تا 1999ء)

سید ضمیر جعفری کا شمار پاکستان کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے نظم و نثر دونوں میں یکساں طور پر طنز و مزاح کے نمونے پیش کیے شاعری میں غزل نظم وغیرہ اور نثر میں خاکہ، مضمون، افسانہ،

---

[1] اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز مزاح، ص 14

ناول اور کالم وغیرہ۔

سید ضمیر جعفری نے لاہور کے اسلامیہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ طالبِ علمی سے ہی ان کی طبیعت ظرافت کی طرف مائل تھی اس دور کے اہم پرچے ''شیرازہ'' میں ان کی تخلیقات مستقل طور پر چھپتی تھی بعد میں ان کی تحریریں اس دور کے دوسرے اہم رسائل میں بھی چھپنے لگیں۔ اپنے دلکش اور نکھرے اسلوب کی وجہ سے مزاح نگاری کے میدان میں بہت جلد اس دور کے نمائندہ مزاح نگاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ان کی مزاحیہ تخلیقات میں شاعری کے علاوہ ایک ناول ''آنریری خسر'' خاکوں کا مجموعہ ''اڑتے خاکے'' اور کالم کا ایک مجموعہ ''مافی الضمیر'' قابل ذکر ہے۔

سید ضمیر جعفری کی تحریروں میں اسلوب بیان کی دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سماجی خرابیوں اور زمانے کی کڑواہٹ کو اپنے تحریروں میں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ سید حسین احمد زاہدی ان کی طنزیہ شاعری پر یوں اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''ضمیر جعفری کی تحریروں میں طنز کی چبھن کے ساتھ بلا کی دلکشی ملتی ہے۔ ان کی نظریں بڑی تیز اور مشاہدہ کافی گہرا تھا وہ علمیت اور ذکاوت میں بے مثل تھے۔..... سماجی خرابیوں اور کڑواہٹ کے عکس بھی ان کی شاعری میں ملتا ہے ہر طرح کی سماجی و سیاسی ناہمواریوں کو انھوں نے بیدریغ اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے''[1]

الغرض جعفری نے عرصہ دراز تک کامیاب مزاح نگاری کی اپنی قائم کی ہوئی روایتوں کو بخوبی برقرار رکھا۔ سماجی ناہمواریوں اور انسانی حماقتوں کو اپنی مزاحیہ شاعری میں دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کے اسلوب کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''ان کے موضوعات متنوع اور دلچسپ ہیں اور ان کا اسلوب برجستگی کا حامل

---

[1] سید احسن احمد زیدی سید ضمیر جعفری کی ظرافت، ماہنامہ شگوفہ، جون 1999ء، ص 38۔

ہے۔اس اسلوب کے تحت وہ نئے مضحک الفاظ اختراع کر کے مزاح کی صوتی
کیفیت تشکیل دیتے ہیں اور یہ انداز انھیں کے ساتھ مخصوص ہے''[1]

شفیق الرحمٰن (1920ء تا 2000ء)

شفیق الرحمٰن بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے افسانے مزاح سے لبریز ہیں یہی وجہ رہی ہے کہ انھوں نے مزاح نگاری میں خوب نام کمایا ہے۔شفیق الرحمٰن 1920ء کو مشرقی پنجاب کے کلانور علاقے میں پیدا ہوئے۔ 1942ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میو اسپتال ،لاہور سے وابستہ ہو گئے۔تقسیم ہند کے بعد ان کا تقرر پاکستان آرمی میڈیکل میں ہوا۔تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ وہاں سے پی ،ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر 1979ء میں سرجن ایڈمرل کے رینک میں بطور ڈائرکٹر میڈیکل سروسز ریٹائر چیئرمین مقرر ہوئے۔شفیق الرحمٰن کا انتقال 19/مارچ 2000ء کو راولپنڈی میں ہوا۔

شفیق الرحمٰن کے افسانوں اور مزاح پاروں کے کل آٹھ (8) مجموعے شائع ہوئے جن کے نام یہ ہیں ''کرنیں 1942ء، شگوفے 1943ء، لہریں 1944ء، پرواز 1945ء، مدوجزر 1946ء، پچھتاوے 1948ء، حماقتیں 1947ء اور مزید حماقتیں 1954ء۔اس کے علاوہ ایک خاکوں کا مجموعہ ''دریچے'' 1989ء اور ایک سفرنامہ ''دجلہ'' 1980ء بھی شائع ہوا ہے۔انھوں نے کچھ نثری پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔مثلاً پروفیسر علی بابا،قصہ چہار درویش،قصہ حاتم طائی وغیرہ۔

شفیق الرحمٰن کی ان مذکورہ تصانیف میں بھرپور طنز و مزاح ملتا ہے۔ خاص طور سے پرواز، پچھتائے،حماقتیں،مزید حماقتیں،''دریچے''،اور''دجلہ''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اشفاق احمد ورک نے ان کی ظرافت کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل،طنز و مزاح مشمولہ کتابی سلسلہ ''تخلیقی ادب''جلد دوم،1980ء،ص 161۔

''شفیق الرحمٰن کی طبیعت کو طنز کے بجائے ظرافت سے خاص شغف ہے وہ اپنی تحریروں میں مسکراہٹ کے بجائے قہقہے بلکہ قہقہوں کے قائل نظر آتے ہیں ان کے ہاں قہقہوں کا سب سے بڑا حربہ لطائف ہیں۔ جس کی وجہ سے اکثر جگہوں پر ان کی تحریریں مزاح کے بجائے غیر سنجیدگی اور کھلنڈرے پن کے نمونے پیش کرتی نظر آتی ہیں''۔[1]

شفیق الرحمٰن کے مزاح کی ایک خاص خوبی ان کا عمیق مشاہدہ اور جزئیات نگاری ہے۔ اپنے اس عمیق مشاہدے اور جزئیات نگاری کے ذریعہ ہمارے اردگرد پھیلے روایتی حقائق، کہاوتوں، مقولوں اور الفاظ و محاورات کو ردبدل کر کے یا کسی چیز کا دوسرا رخ پیش کر کے نئے نئے مفاہم سامنے لاتے ہیں اور یہی فنکاری ان کی تحریروں کو پر لطف اور شگفتہ بنا دیتی ہے۔

محمد خالد اختر (1920ء تا 2000ء)

محمد خالد اختر کا شمار اس دور کے ان مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے مغربی ادب سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔ جسے پطرس بخاری کنہیالال کپور، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ۔ محمد خالد اختر 1920ء کو اللہ آباد ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ بی ایس سی (انجینئرنگ) کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔

محمد خالد اختر کی ادبی زندگی کا آغاز 1946ء میں ہوا ان کی پہلی مزاحیہ تحریر چراغ حسن حسرت کے ہفتہ روز ''شرارہ'' میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے اردو کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی ہر تحریر میں طنز و مزاح کے حربہ کو خوب برتا ہے ان کی مزاحیہ تصانیف میں، مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ ''کھویا ہوا افق 1968ء'' ناول ''چاکی واڑہ میں وصال 1964ء'' افسانوں کے مجموعے ''چچا عبدالباقی 1985ء، لائین اور دوسری کہانیاں 1997ء، قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں

---

[1] اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز مزاح، ص 512

کی خصوصیت پر اشفاق احمد ورک اس طرح رقمطراز ہیں۔

''محمد خالد اختر کی اکثر تحریروں کا سب سے نمایاں وصف عموماً ان کی کاٹ دار اور جان دار طنز ہی ہوتی ہے''۔[1]

خالد اختر کی تحریروں کی دوسری خوبی، شگفتگی اور رومانیت ہے جو ان کے مزاحیہ افسانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے وہ پاکستان کے نمائندہ مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

نصیر انور (1921ء تا 1981ء)

نصیر انور کا شمار پاکستان کے فکاہیہ کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی کالم نگاری کا آغاز قیام پاکستان کے قریب قریب کیا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے۔ جیسے ''تہذیب نسواں''، ''پھول''، روزنامہ ''شہاب''، ماہنامہ ''جاوید'' اور اخبار خواتین ''روزنامہ ''مشرق'' وغیرہ ان کا ایک کالموں کا مجموعہ ''جھوٹی باتیں'' 1991ء میں شائع ہوا ہے۔

نصیر انور کے مزاحیہ کالموں کی پہلی خصوصیات وہ ہے کہ یہ اپنے کالموں میں روزمرہ واقعات کا بیان سیدھے سادے انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں مضمون، افسانہ اور انشائیہ وغیرہ کا بھی رنگ ملتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے کالموں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کالموں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کالموں کو دلچسپ بنانے کے لیے تاریخی حوالوں کا استعمال کرتے ہوئے پر لطف حکایات اور اقوال کا سہارا لیتے ہیں اور ان حکایات اور اقوال میں ہلکی سی تحریف کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اپنی باتوں کو دلچسپ بنانے کے لیے انہوں نے لطائف کا بھی خواب استعمال کیا ہے۔

نصیر انور کا شمار پاکستان کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے قیام پاکستان کے تمام

---

[1] اشفاق احمد، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 340۔

مراحل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ دیگر ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں پاکستانی تاریخ اور ملکی سیاستدانوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت کی ناہموار صورت حال کو کہیں طنز کے نشتر سے زخمی کرتے ہیں تو کہیں اپنی نشتر زنی پر مزاح کا مرہم بھی لگا دیتے ہیں۔ ان کے کالموں کے خاص موضوعات میں مسئلہ کشمیر، عالمی طاقتوں کی ذاتی مفاد پرستی، سیاستدانوں کی غنڈہ گردی اور پاکستانی حکمرانوں کی دغابازی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی (1923ء) باحیات

مشتاق احمد یوسفی اس عہد کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں انھوں نے طنز و مزاح کے فن میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے پہلے مضمون، صنف لاغر، سے ہوا ہے جو مجلّہ سویرا، میں چھپا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ مختلف رسائل میں چلتا رہا جیسے افکار، ادبی دنیا، فنون وغیرہ۔

ان کی پہلی تصنیف 'چراغ تلے' ہے جو 1961ء کو منظر عام پر آئی۔ جس میں ایک درجن شگفتہ مضامین ہیں یہ تمام مضامین عام روزمرہ زندگی سے لیے گئے ہیں اور یہ اتنے عام موضوعات ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ہمارا ذہن ان کی طرف مائل نہیں ہوتا لیکن یوسفی نے انھیں عام موضوعات کو اس قدر اہم بنا کر پیش کیا ہے کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یوسفی کی دوسری تصنیف 'خاکم بدہن' 1969ء میں چھپی۔ جس پر آدم جی ایوارڈ دیا گیا۔ یہ کتاب اردو زبان و ظرافت کے لیے اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ یوسفی کی تیسری کتاب 'زرگزشت' 1976ء کو شائع ہوئی یہ ان کی خودنوشت سوانح ہے جو 330 صفحات پر مشتمل ہے یوسفی کی چوتھی اور آخری تصنیف 'آب گم' ہے جو 1990ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'آب گم' کا مزاح آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے سنگم پر تخلیق ہوا ہے۔اس امتزاج کے بڑے نادر نمونے ہمیں مذکورہ کتاب میں نظر آتے ہیں۔ جہاں آہ اور واہ کی آمیزش نے عجیب گنگا جمنی کیفیت پیدا کردی ہے۔مغرب میں اس قبیل کے مزاح کو خاص مزاح سے بھی بہت آگے کی چیز قرار دیا جاتا ہے''[1]

موجودہ دور کے مزاحیہ ادب کو اگر ہم کسی کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی کا نام ہے۔ یوسفی نے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان کھولا۔وہ اپنے پاس طنز و مزاح کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوسفی کے مضامین کے ذریعہ اردو نثر نگاری اور مزاح نگاری عالمی ادب کی معراج تک پہنچی۔ نامی انصاری نے انھیں بیسویں صدی کا ''سرخیل'' مزاح نگاراں قرار دیا ہے۔ان کے مزاحیہ اسلوب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مشتاق احمد یوسفی کو اگر بیسوں صدی کا 'سرخیل مزاح نگاراں' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، بشرطیکہ زمانی تقدیم و تاخیر کو نظر انداز کر دیا جائے 'چراغ تلے خاک بدہن، زرگزشت اور آب گم میں ان کے فکر و فن کی ارتقائی کڑیوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہے۔مگر اصلیت یہ ہے کہ ''یوسفی کی رسائی اردو نثر کی معراج تک ہوئی ہے۔'' ہمارے عہد میں نثری اسالیب کے ان سے بہتر مزاج داں کی تلاش سعی لا حاصل ہی ہوگی ان کی تحریروں میں صرف بصیرت کے جوہر، خود آگہی قدر شناسی اور زمانہ شناسی ہی نہیں ہے بلکہ اسلوب کی ندرت، الفاظ کی رمز شناسی اور عبارت کی طرحداری بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے''۔[2]

غرض یوسفی نے اپنی تحریروں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے دنیا کے ہر حربے کا استعمال کیا ہے اچھوتی اور نادر تشبیہات، موازنہ اور تضاد، پیروڈی، تاریخی حوالے، شعروں اور مصرعوں کا برمحل استعمال،

---

[1] اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز مزاح، ص 185

[2] نامی انصاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، 18

دانشوروں کے اقوال، خود برداشتہ مزاح کے علاوہ طنز و مزاح کی بیشتر تکنیکیں ان کی تحریروں میں بکھیری پڑی ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جس کی بدولت اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

ابراہیم جلیس (1924ء تا 1977ء)

ابراہیم جلیس ادیب بھی تھے اور صحافی بھی ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو تقسیم ہند سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تقسیم کے بعد ابراہیم جلیس پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں بھی انھوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ پاکستان کی منتقلی کے بعد منظر عام پر آنے والی تصانیف میں ''پبلک سیفٹی 1950، ذرا ایک منٹ 1952ء، پتے کی بات 1973ء، اور ایک سفرنامہ ''نئی دیوارِ چین 1958ء'' وغیرہ ہیں۔

پبلک سیفٹی، یہ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل تیرہ مضامین ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے اپنے اردگرد پھیلے بے شمار مسائل کو موضوع بنایا ہے خاص طور سے معاشرتی نابرابریوں کو انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے یہاں طنز و مزاح کے توازن کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں مزاح کی نسبت طنز کا عنصر غالب ہے ابراہیم جلیس چونکہ بنیادی طور پر طنز نگار ہیں اسلیے ان کا مزاح وہیں مزا دیتا ہے جہاں وہ طنز کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلتا نظر آتا ہے۔ ایک ادیب کا کام معاشرے میں موجود افراط و تفریط کو توازن کا راستہ دکھانا ہوتا ہے۔ ابراہیم جلیس بھی اس کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں''۔ [1]

تقسیم کے بعد منظر عام پر آنے والی ان کی دوسری اہم تصنیف ''ذرا ایک منٹ'' ہے جس میں کل آٹھ طنزیہ مزاحیہ مضامین ہیں۔ اس میں بھی انھوں نے ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے اردگرد کی صورت پر

---

[1] اشفاق احمد ورک، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 18۔

طنزیہ نظر ڈالی ہے 'تصنیف' پتے کی بات، جس میں چونتیس مضامین ہیں ان مضامین میں انھوں نے کراچی شہر کے ماحول، رہن سہن عادات واطوار اور عوام کی روزمرہ مصروفیات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ابراہیم جلیس کے مزاح کی سب سے اہم خصوصیت واقعات نگاری اور لفظی ہیر پھیر ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں کردار یا واقعہ کے گرد صورت حال کا ایسا جال بنا دیتے ہیں کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے اور ایسی کیفیات میں وہ لفظوں کی بازیگری سے فائدہ اٹھا کر مزاحیہ صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔

مشکور حسین یاد (1926ء تا 1985ء)

مشکور حسین یاد بنیادی طور پر ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں لیکن طنز و مزاح کے میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں دشنام کے آئینے، ستم ظریف، جوہر اندیشہ، اور اپنی صورت آپ، وغیرہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ دشنام کے آئینے میں یہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ پہلی بار 1975ء میں چھپا۔ دوسرا خالص مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ستم ظریف' 1988ء کو منظر عام پر آیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کے دیگر انشائیوں میں بھی طنز و مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ طنز ان کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے اور انھوں نے اپنے مضامین میں اپنے مخصوص انداز میں نئے نئے ڈھنگ سے ہمارے معاشرے کے مختلف کرداروں اور ان کے رویوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جیسے انجینئر، ڈاکٹر استاد، تاجر، سیاستدان، صنعت کار اور مذہبی پیشوا وغیرہ اور سماجی مسائل میں رشوت، سفارش، جھوٹ، دکھاوا، منافقت، مفاد پرستی وغیرہ ان کے خاص موضوعات رہے ہیں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ان کی تحریروں کی خصوصیت اور موضوعات پر اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ان کی تحریریں بالعموم شگفتگی کی حامل ہوتی ہیں ان تصانیف میں انھوں نے بطور خاص معاشرتی ناہمواریوں اور شخصی بوالعجبیوں کو ہدف بنایا ہے'' [1]

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل، طنز و مزاح مشمولہ، کتابی سلسلہ تخلیقی ادب جلد دوم، 1980ء، ص 153

ابن انشا (1927ء تا 1978ء)

ابن انشاء اردو ادب میں شاعر اور نثر نگار دونوں حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں۔ابن انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا لیکن ادبی دنیا میں ابن انشاء کے نام سے شہرت حاصل رہی وہ 15/ جون 1927ء کو ضلع جالندھر کے گاؤں میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور کراچی کالج سے ایم اے کیا۔ کچھ دن آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور تقسیم ہند کے بعد لاہور چلے گئے۔ وہاں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور اس طرح مختلف اوقات میں مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ابن انشا کا انتقال 1978ء میں ہوا۔

ابن انشا کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا لیکن ان کی اصل شناخت طنز و مزاح سے ہے اور انھوں نے طنز و مزاح میں اپنی شناخت نثر کے حوالے سے بنائی ہے۔ان کی نثر نگاری کی ابتداء کالم نگاری سے ہوئی۔ان کے ایک مزاحیہ کالموں کا مجموعہ ''خمارِ گندم'' 1980ء میں ان کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا۔ان کے کالموں کی پہلی خصوصیت ان کا سیدھا سادہ اسلوب ہے وہ اپنے کالموں میں معمولی واقعات کو بھی پر اثر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کی مزاحیہ کالم کے اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''ابن انشاء نے کالم نگاری میں سب سے الگ راہ نکالی ہے۔ان کا باغ و بہار کا اسلوب ان کی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔وہ اپنے معاصر کالم نگاروں سے اس لحاظ سے مختلف نظر آتے ہیں کہ وہ بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز اور مزاح پیدا کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔سنجیدہ اور خشک مسائل کو سیدھے سادے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف ان کے الفاظ اور جملوں کی برجستگی اور دوسری طرف ان کا گہرا طنز قاری کے لیے بڑا موثر اور دلنشیں ہوتا ہے اور اسے فکر انگیز بھی محسوس کرتا ہے۔ان کے کالموں کی ایک

خاص علمی سطح بھی ہوتی ہے، جس میں ان کے مزاح اور طنز میں چھپے ہوئے لطیف اشارے پنہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سے لطف انداز ہونے کے لیے بعض اوقات قاری کا ان کا پس منظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اپنی متعدد خصوصیات کے لحاظ سے انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری کو نئی جہت دی تھی افسوس کہ وہ انھیں پر ختم بھی ہوئی'' [1]

کالم نگاری کے علاوہ انھوں نے مزاحیہ سفر نامہ بھی لکھے ہیں جیسے ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' 1967ء، آوارہ گردی کی ڈائری 1971ء، دنیا گول ہے 1972ء، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، نگری نگری پھرا مسافر 1981ء وغیرہ ہیں کالم اور سفر ناموں کے علاوہ ان کے مزاح کی شاہکار تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' جو پیروڈی کی شکل میں ہے بھی قابل ذکر ہیں۔

ابن انشا اپنی تحریروں کو دلچسپ بنانے کے لیے عبارت کی رنگینی، اسلوب کی سج دھج، یا الفاظ و محاورات کے استعمال کے بجائے بالکل سادہ و عام فہم اندازِ اختیار کرتے ہیں۔ اور سادگی کے علاوہ حاضر جوابی اور برجستگی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ معین الدین عقیل نے ان کی مزاحیہ تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں کامیاب مزاح نگار کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''تنوع پسندی ان کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ چنانچہ موضوعات میں اور اسالیب میں دونوں جگہ اس کا اظہار ہوا ہے۔ طنز پیروڈی، لفظوں کے الٹ پھیر اور بات سے بات پیدا کر کے مزاح پیدا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کا مطالبہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اسلوب سے بہت سی باتوں کا پس منظر بھی بیان کرتے ہیں اور بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز و مزاح تخلیق کرنے کی بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ مختصر مضامین، صحافیانہ کالم اور سفرنامے وہ ہر جگہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کے طور پر نمایاں رہے'' [2]

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل طنز و مزاح، مشمولہ کتابی سلسلہ ''تخلیقی ادب''، جلد دوم 1980ء ص 158۔ [2] ایضاً ص 152

صدیق سالک (1935ء تا 1989ء)

صدیق سالک کا شمار پاکستان کے فوجی مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان سب میں طنز و مزاح کے نقوش کہیں نہ کہیں ضرور ملتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''تادمِ تحریر'' خالص طنز و مزاح کے زمرے میں آتی ہے۔ تادمِ تحریر 1981 میں چھپی ہے۔

صدیق سالک کی یہ طنزیہ و مزاحیہ تصنیف جس میں مختلف عنوانات کے تحت جو مضامین ہیں وہ چار الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے جس کو انھوں نے چار دریچوں کا نام دیا ہے اس کتاب میں انھوں نے پاکستان کی سیاسی صورتحال کا بڑے لطیف انداز میں جائزہ لیا ہے اور پاکستان کے مختلف شعبوں پر نہایت پر لطف انداز میں بحث بھی کی ہے۔ اس کتاب کے تیسرے حصہ کے مضامین خالص مزاحیہ مضامین ہیں جس میں انھوں نے نئی اور پرانی نسل کے درمیان حقوق و فرائض اور زمانی تضادات کی کشمکش کو مزاح کا نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جمہوری سسٹم کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جہاں پر ہر قدم پر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے تنظمیں بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

غرض صدیق سالک کی تحریروں میں تخیل اور زبان و بیان کے امتزاج سے خوبصورت مزاح پایا جاتا ہے۔ بعض جگہوں پر وہ رعایت لفظی سے بھی مزاحیہ کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ (1935ء تا 2005ء)

مشفق خواجہ کا شمار پاکستان کے معروف محققین میں ہوتا ہے لیکن وہ اپنے فکاہیہ کالموں کی وجہ سے پاکستان کے مشہور مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ زیرِ تحریر مقالہ انھیں سے متعلق ہے چنانچہ یہاں تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن آئندہ ابواب میں ان کی مزاح نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

سلمی یاسمین نجمی (1941ء)

سلمٰی یاسمین بنیادی طور پر ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔لیکن پاکستان میں مزاح نگاری کے باب میں بھی ان کا نام نمایاں ہے ان کے ایک مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''کوئے ملامت'' کے نام سے 1991ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ان مضامین میں انھوں نے گھر گرہستی اور خانگی زندگی کے گوشوں کو مزاحیہ پہلو میں پیش کیا ہے ان کی تحریروں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قاری بہ یک وقت مضمون، انشائیہ، سفرنامہ اور ذاتی ڈائری وغیرہ کا لطف لیتا ہے۔مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب شائستہ اور شستہ مزاح کی اعلیٰ مثال ہے۔

رشید احمد گوریجہ (1942ء تا 1996ء)

رشید احمد گوریچہ پاکستان کے مزاح نگاروں میں ایک نمایاں نام ہے ان کے ایک طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''خندہ زیرلب'' 1987ء میں شائع ہوا۔اس میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں ان مضامین میں انھوں نے ہمارے ناقص دفتری نظام اور ہمارے کم علمی عہدیداروں کا مذاق اڑایا ہے۔ ہمارے اس پیچیدہ دفتری نظام پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔اپنی تحریروں میں قدم قدم پر اس سسٹم پر لطیف انداز میں طنز کیا گیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی (1943ء)

عطاء الحق قاسمی یکم فروری 1943ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ایم اے او کالج لاہور سے انٹر اور گریجویشن کیا بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور بعد میں وہ گورنمنٹ ایم اے او کالج میں تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔

قاسمی بنیادی طور پر خالص مزاح نگار ہیں ان کے کالموں، سفرناموں اور خاکوں میں بھرپور مزاح ملتا ہے۔ان کی مزاحیہ تخلیقات میں دو خاکوں کے مجموعے ''عطایئے 1982ء'' اور مزید گنجے

فرشتے 1997ء اور سفرناموں ''شوقِ آوارگی 1990ء گوروں کے دیس میں 1992ء، دلی دوراست 1995ء اور دنیا خوبصورت ہے 1998ء۔ کالموں کے مجموعے روزن دیوار سے 1978ء، ''حندِ مکرر 1986ء، جرمِ ظریفی 1988ء، شرگوشیاں 1990ء، تجاہل کالمانہ 1990ء، حسبِ معمول 1993ء، کالم والم 1993ء، دھول دھپا 1996ء، آپ بھی شرمسار ہو 1996ء، بارہ سنگھے 2000ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قاسمی کے خاکوں میں فطری ظرافت پائی جاتی ہے اور اپنے خاکوں کو دلچسپ بنانے کے لیے جابجا لطائف کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت پنجابی کلچر ہے اور اپنے خاکوں میں جابجا جملے بازی سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح ان کے خاکوں میں بھرپور مزاح ملتا ہے اس طرح ان کے سفرنامے بھی طنز و مزاح سے لبریز ہیں گویا اردو کے مزاحیہ سفرناموں میں عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے انفرادیت کے حامل ہیں ان کے سفرناموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان کی حب الوطنی کا پہلو پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔

قاسمی نے فکاہیہ کالم نویسی میں بھی خوب شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی فکاہیہ کالم نویسی کی ابتداء روزنامہ ''نوائے وقت'' سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے کالموں میں ادب، صحافت، سیاست، مذہب اور فنونِ لطیفہ سے متعلقہ تقریباً ہر موضوع پر اپنے منفرد اسلوب سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کالموں میں طنز و مزاح کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں ان کے طنز و مزاح کی خصوصیت پر اشفاق احمد ورک یوں اظہار خیال کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کے کالموں کے اس ذخیرہ میں طنز و مزاح کے سارے حربے کامیابی سے استعمال کے گئے ہیں۔ بہت سے کالم خالص مزاح کا بہت خوبصورت نمونہ ہیں۔ بعض کالموں میں طنز کی دھار بڑی کٹیلی ہے جب کہ کچھ کالموں میں طنز مزاح کی دھوپ چھاؤں کا نہایت عمدہ امتزاج ہے۔ ایسے ہی کالموں میں

مسکراہٹ آنسوؤں سے گلے ملتی نظر آتی ہے اور یہی کالم ان کی فنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے''[1]

محمد کبیر خان (1948ء)

محمد کبیر خان پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ان کا ایک خاکوں کا مجموعہ ''چاند چہرے'' قابل ذکر ہے۔یہ مجموعہ 1993ء میں شائع ہوا اس میں کل 29 خاکے ہیں ان خاکوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح اور شگفتگی ان کے مزاج میں شامل ہے۔

کرنل اشفاق حسین (1949ء)

کرنل اشفاق حسین کا شمار فوجی مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔مزاحیہ ادب کے سلسلے میں ان کی آپ بیتی ''جنٹلمین بسم اللہ'' جو 1982ء میں چھپی ہے اور اسی آپ بیتی کا دوسرا حصہ ''جنٹلمین الحمدللہ'' کے نام سے 1984 میں شائع ہوا۔

ان کا انداز مزاح رواں اور پر اعتماد کے ساتھ بے ساختہ اور داستانوی ہے۔مزاح پیدا کرنے کے لیے اپنی تحریروں میں برمحل اشعار اور مصرعوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔اپنی آپ بیتی میں انھوں نے اپنی زندگی کے تلخ تجربات کو مزاح کے پہلو میں بیان کیا ہے۔ان کی اس آپ بیتی میں مختلف علاقوں کے سفر روداد اور تہذیب و ثقافت کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔جس کی وجہ سے آپ بیتی کے ساتھ ساتھ قاری سفرنامے اور دلچسپ تاریخ و جغرافیہ کا بھی لطف لیتا ہے۔وہ مزاح پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتے بلکہ کہانی سنانے کے انداز میں بات آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔

تنویر حسین (1957ء)

پاکستان میں مزاح نگاری کے میدان میں تنویر حسین کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 541۔

ان کے مضامین کے اب تک تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں پہلا مجموعہ ''مزج بخیر 1991ء دوسرا ''خوش آمد 1994ء''اور تیسرا شاباش 1997ء میں منظر عام پر آئے۔

تنویر حسین کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے ہماری تہذیب وثقافت کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنے اور الفاظ کی ظاہری اور باطنی مشابہت سے مزاح پیدا کرنے میں وہ مہارت رکھتے ہیں۔

طاہر مسعود (1958ء)

طاہر مسعود کا شمار پاکستان کے فکاہیہ کالم نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کالم روزنامہ ''جسارت''اور''جنگ'' میں بالترتیب دام خیال اور برگدنِ راوی کے مستقل عنوانات کے تحت چھپا کرتے تھے۔ مزاحیہ کالم نگاری میں ان کا ایک کالموں کا ایک مجموعہ ''برگردنِ راوی'' قابل ذکر ہے جو پہلی بار 1986ء میں منظر عام پر آیا۔

انھوں نے اپنے کالموں میں سماجی حالات اور واقعات کی تصویروں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کالموں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان میں کہانی اور ڈرامے کا رنگ پایا جاتا ہے اور کبھی کبھی مکالماتی انداز اختیار کر کے کالم کو افسانے کی صورت تبدیل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں انفرادی یا شخصی رویوں کے بجائے اجتماعی بے حسی کو نشانہ طنز بنایا ہے ان کے طنز میں اصلاح اور دردمندی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ طاہر مسعود کے کالموں میں طنز کی بہ نسبت مزاح کم ملتا ہے۔ مزاح ان کی تحریروں میں کبھی طنز کے ساتھ ہوتا ہے تو کبھی بالکل خالص۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ (1962ء)

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا شمار قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے نوجوان مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ یونس بٹ 4 جنوری 1962ء کو گوجرانولہ میں پیدا ہوئے میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج سیول لائنز

لاہور سے ایف ایس سی کرنے کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ 1985ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال میں شعبۂ نفسیات سے اپنے میڈیکل کیریئر کا آغاز کیا۔

محمد یونس بٹ کی مزاح نگاری کا آغاز ان کی انشائیہ نگاری سے ہوتا ہے ان کے انشائیوں میں مزاح کا عنصر دیگر انشائیہ نگاروں سے زیادہ ملتا ہے۔ انھوں نے انشائیہ کے علاوہ خاکے، کالم، ڈرامے اور سفر نامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''چاہ خنداں 1985ء، میں چھپا۔ خاکوں کے مجموعوں میں شناخت پریڈ 1990ء، شیطانیاں 1991ء، افراتفریح 1992ء، عکس بر عکس 1993ء، غل دستہ 1994ء، قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک سفر نامہ ''خندہ پیش آنیاں'' 1996ء میں شائع ہوا ہے۔ ان تمام تخلیقات میں مزاح بدرجہ اتم موجود ہے۔

یونس بٹ پاکستان کے خالص طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے واقعہ، لطائف اور صورتِ حال کے بجائے جملہ بازی اور الفاظ کے الٹ پھیر کا طریقہ اپناتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے ان کی مزاح نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> مزاح نگاری میں ان کا سب سے بڑا حربہ الفاظ اور جملوں کا الٹ پھیر ہوتا ہے، جس سے بعض اوقات وہ مزے دار صورت حال پیدا کر دیتے ہیں [1]

یونس بٹ کو مزاح نگاری میں اتنی شہرت ملی کہ اردو ادب کے تمام طالب علم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ اپنی تحریروں میں لفظوں اور جملوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں کہ بعض جملے تو نہایت مزے دار ہوتے ہیں اور انھیں بار بار پڑھنے اور سنانے کو دل چاہتا ہے۔

اشفاق احمد ورک (1963ء)

طنزیہ و مزاحیہ ادب کو سنجیدگی کے ساتھ ایک معیار تک لے جانے والے چند اہم مزاح

---

(۱) اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص 541۔

نگاروں میں ایک نام اشفاق احمد ورک کا بھی ہے۔ اشفاق احمد ورک 3 رجون 1963ء کو شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے میٹرک اور بی اے کرنے کے بعد 1988ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور شیخوپورہ کالج میں بطور لکچرار ملازمت اختیار کی۔ انھوں نے ''اردو نثر میں طنز و مزاح'' کے عنوان پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اشفاق احمد ورک کی تصانیف میں ''قلمی دشمنی'' اور ''خاکہ نگری'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک روزنامہ میں ''قلمی دشمنی'' کے مستقل عنوان سے کالم بھی لکھا ہے۔

اشفاق احمد ورک پاکستان کے ایک منفرد لہجے کے مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح تیز اور انداز تیکھا ہوتا ہے۔ غرض پاکستان کے ادبی حلقوں میں ان کی مزاح نگاری خوب شہرت حاصل کر چکی ہے۔

عطاء اللہ عالی (1964ء)

عطاء اللہ عالی نے جب مزاح نگاری کے میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت قیام پاکستان کے فوری بعد ابھرنے والے نوجوان مزاح نگاروں کی ایک بھیڑ تھی۔ مزاح کی صلاحیت قدرتی طور پر ان میں موجود ہے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تصانیف میں ''بادلِ نخواستہ'' 1993ء، اور ''کچھ اور کتے'' 1999ء قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ اپنی تحریروں میں ذو معنٰی الفاظ استعمال کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں اور اسلوب کی بے ساختگی اور شگفتگی ان کی تحریروں میں یکساں طور پر ملتی ہے۔ تحریر میں سادگی اور روانی دو دھاری تلوار کی طرح ہوتی ہے سید ضمیر جعفری ان کے مجموعہ ''اور کتے'' کے دیباچہ میں ان کی مزاح نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ان کی تحریروں کی معصومانہ مگر درحقیقت بڑی کافرانہ کشش قاری کے دل کو موہ لیتی ہے''[1]

---

[1] اشفاق احمد ورک، ''اردو نثر میں طنز و مزاح''، ص 255۔

عرفان جمیل:(1964ء)

عرفان جمیل پاکستان کے ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جو اپنی تحریروں میں معاشرتی مسائل کے خلاف ہمیشہ احتجاج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عرفان جمیل 2/فروری 1964ءکولاہور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔طنز و مزاح کے میدان میں ان کے فکاہیہ کالموں کا ایک مجموعہ ''براہ راست'' ہے جوان کی تصانیف میں قابل ذکر تصنیف ہے۔

وحیدالرحمٰن خان:(1970ء)

وحیدالرحمٰن خان نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں خوش رہنے اور خوش رکھنے کے باتوں کو پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں کے مطالعۂ سے بخوبی انداز ہوتا ہے کہ مزاح ان کی فطرت میں ہے۔وحیدالرحمٰن خان یکم اپریل 1970ءکوملتان میں پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج سے بی اے پاس کیابعدازاں 1993ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو سے کیااور درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی مزاحیہ تصانیف میں ''گفتنی شگفتنی''حفظ ماتبسم،اور خامہ خرابیاں وغیرہ قابل تعریف ہیں۔

مہزادسحر:(1974ء)

مہزادسحر کا نام پاکستان کے نوجوان مزاح نگاروں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے وہ 16/اکتوبر 1974ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ان کی پہلی مزاحیہ تحریر 1984ءمیں روزنامہ ''امروز''میں بچوں کے صفحہ میں چھپی۔ان کی اب تک دومزاحیہ کتابیں''وارے نیارے'' 1993ء اور''بدحواسیاں''چھپ کرمنظرعام پر آچکی ہیں۔ان کے مزاح میں بہت زیادہ پختگی تو نہیں البتہ مزاح سے ان کی فطری رغبت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں تخیل اور تدبر کے ساتھ نہایت خوبصورت جملے تراشتے نظر آتے ہیں۔مضامین کی بہ نسبت ان کے انشائیوں میں شگفتگی کا ایک واضح

احساس موجود ہے۔غرض پاکستان کے نوجوان مزاح نگاروں میں وہ قابلِ ذکر مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

پاکستان کے دیگر نمائندہ مزاح نگاروں میں اخلاق احمد رواک ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر ایس معین قریشی، ضیاءالحق قاسمی، عارفہ صبح خان، علی رضا احمد، پروفیسر افضل علوی، شفیع عقیل، مرزا ظفر الحسن، مسٹر دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عارفہ صبح خان پاکستان کی خاتون مزاح نگاروں میں نمایاں نام ہے ان کی مزاحیہ تحریروں میں شوخی، شرارت بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھوں نے معاشرتی ناہمواریاں اور انسانی رویوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے علی رضا احمد فکاہیہ کالم سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی تحریروں میں لفظوں کو توڑ کر ایک نیا مفہوم پیدا کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں۔واقعات میں مضحک پہلوؤں کو چھان کر الگ کرنے اور بات میں سے بات نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔وہ مزاح کے بہت سے حربوں سے واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں یکسانیت کی بجائے تنوع پایا جاتا ہے۔

پروفیسر افضل علوی اصلاحی مزاح اور فکاہی اسلوب کے حامل ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں ان کا ایک سفرنامہ ''دیکھ لیا ایران'' 1983ء میں منظر عام پر آیا ہے ان کے سفرناموں میں قدم قدم پر مزاح کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔

شفیع عقیل روزنامہ جنگ کراچی میں ''گردوپیش'' کے مستقل عنوان کے تحت فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔ان کے فکاہیہ کالموں کا ایک مجموعہ ''تیغ ستم'' 1963ء میں چھپا۔انھوں نے اپنے فکاہیہ کالموں اپنے میں معاشرے بالخصوص شہر کراچی شہر کے حوالے سے سامنے آنے والے روزمرہ کے مسائل کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا ہے۔

مرزا ظفر الحسن کی تصانیف ''ذکر یار چلے''، ''عمر گزشتہ کی کتاب''، ''دکن اداس ہے یارو''، وغیرہ۔

پاکستان کے مزاحیہ ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی تحریروں کی اہم خصوصیت دلکش اسلوب اور پر لطف انداز بیان ہے۔وہ اپنی تحریروں میں زندگی کے مختلف مسائل اور واقعات کو دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ان کی نثر خوبصورت اور اسلوب بے ساختہ ہے۔ان کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو مزاح سے فطری لگاؤ ہے ظفر الحسن کے علاوہ مسٹر دہلوی کا نام بھی پاکستان کے مزاح نگاروں میں اہمی کا حامل ہے۔انہوں نے اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب خوب شہرت حاصل کی۔مزاحیہ شاعری کے علاوہ مزاحیہ نثر کے دو مجموعے ''سؤ ادب'' اور ''سپر دقلم'' قابل ذکر ہیں۔ان کی مزاحیہ شاعری اور مزاحیہ مضامین میں ہمیں عصری رجحانات، حالات اور شخصیات سے مکمل آگہی ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مزاح زیادہ تر زیرلبِ تبسم کا حامل ہوتا ہے۔

الغرض پاکستان میں قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی شاعری کے علاوہ نثر کی تقریباً تمام اصناف میں مزاح لکھا گیا اور لکھا جارہا ہے۔مضمون کی صنف اسے خاص طور پر موافق آئی جتنا بہترین اور معیاری مزاح مضمون کی صنف میں تخلیق ہوا ہے دیگر اصناف میں نہیں ہوا۔مضمون کے بعد خاکہ نگاری میں بھی مزاح کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔خودنوشت سوانح عمریوں میں بھی اس کے کامیاب تجربے کیے گئے ہیں۔جب کہ ناول اور افسانے نے بھی اسے کھلی باہوں سے خوش آمدکہا ہے۔انشائیہ کے علاوہ سفرنامے اور کالم میں بھی مہارت اور خوبی کے ساتھ مزاح تخلیق کیا گیا ہے چنانچہ ان مزاح نگاروں نے اپنی تحریروں میں، سماج کی ناہمواریاں، ذات پات، مذہب و مسلک، سیاسی بدحالی، بدعنوانی اقرباپروری، نااہلی، ذہنی افلاس، اخلاقی گراوٹ، مفلسی، بیروزگاری، بیماری، ادب کی تجارت، اردو کی زبوں حالی، اہل اقتدار کی نااہلی، خودغرضی اور خودپرستی غرض تمام مسائلوں کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کرکے اصلاح کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔

***

باب دوم

سوانح و شخصیت

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

سوانحی خاکہ بقلم مشفق خواجہ

[1]

---

[1] بحوالہ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، سلام آخر، آہ مشفق خواجہ!، مشمولہ، ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی، اپریل 2005ء صفحہ نمبر 42,43۔

(الف) سوانحی حالات

آباواجداد

مشفق خواجہ کے آباواجداد کا تعلق کشمیری گھرانے سے تھا کشمیر کے علاقہ پام پور میں یہ لوگ زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ان کے پردادا انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے اور ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے عمارت سازی کا فن سیکھا،اور اس فن میں اتنی مہارت حاصل کر لی کے چند دن بعد ہی ٹھیکے پر مکانات بنانا شروع کئے۔لاہور کے بیشتر قدیم مکانات اور حویلیاں ان کے تعمیر کردہ ہیں۔

دادا

مشفق خواجہ کے دادا خواجہ کریم بخش سرکاری ملازم تھے ادب اور فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی خاص کر اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر مہارت رکھتے تھے۔خواجہ کریم بخش ایک صاحبِ ذوق انسان گذرے ہیں۔ ان کے زمانے میں لاہور میں جو ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں اور ان محفلوں میں جن دانشمندوں اور ادیبوں سے رونق قائم تھی ان لوگوں میں خواجہ کریم بخش بھی شامل ہیں۔ان کے علاوہ ان کے دو سگے بھائی خواجہ رحیم بخش، خواجہ امیر بخش اور ایک رشتہ کے بھائی مولوی احمد دین بھی ان ادبی محفلوں کی رونق ہوا کرتے تھے۔

حکیم احمد شجاع نے اپنی آپ بیتی ''خوں بہا''میں خواجہ کریم بخش اور ان کے بھائیوں کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔لکھتے:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے مکان کی بیٹھک میں برسوں تک ہر شام

وہ لوگ جمع ہو جاتے تھے، جن میں سے ایک ایک آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ تھا۔ حکیم شہباز دین ایک بہت لاغر اور نحیف انسان تھے، مگر اُن کے سینے میں ایک ایسا دل تھا، جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی.....ان ارباب علم وادب کی دید کے شائق دور دور سے ہمارے ہی مکان پر آئے اور ان کی صحبت سے اکتساب شرف کرتے، سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن، مفتی عبداللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے۔ جو قریب قریب ہر روز شام کو اس بیٹھک میں جمع ہو جاتے ۔۔۔خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش سیدہ محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اگر چہ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظرِ عام پر نہ آئے مگر وہ اس مجلس کی روحِ رواں تھے۔ ان کی جرأت اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں وہ حصہ لیا، جو ان کے اپنے جوہر کمال کے تقاضاتِ ارتقا سے کسی طرح کم نہیں۔ اس زمانے میں سر محمد اقبال جب تک اپنا کلام پہلے ان بزرگوں کو سنا نہ لیتے تھے، اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے"۔[1]

والد:

مشفق خواجہ کے والد جناب خواجہ عبدالواحید اعلیٰ پائے کے ادیب گذرے ہیں علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں اپنے علم اور تقویٰ کی وجہ سے ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید کی ولادت ۳ر جنوری ۱۹۰۱ء کو ان کے آبائی مکان للّی راج، محلّہ بھابھڑیاں، لاہور میں ہوئی۔ اس مکان کا شمار شہر کے تاریخی مکانوں میں ہوتا تھا۔ جہاں کسی زمانے میں ہمیشہ ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں اور ان محفلوں میں حضرت علامہ اقبال بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید ایک جگہ ان ادبی محفلوں اور ان میں شرکت

---

[1] خلیق انجم، ذکرِ خیر مشفق خواجہ، مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ ص:9

کرنے والی ادبی شخصیتوں اوران محفلوں سے ان کے ادبی ذوق کی تربیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بچپن کی بہت سی باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں اوران میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''للّی لاج'' میں میرے بزرگوں اوران کے دوستوں کی محفلیں آدھی رات تک گرم رہتی تھیں اوران محفلوں میں علامہ اقبال، سرعبدالقادراورسر شہاب الدین وغیرہ آیا کرتے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کواس علمی و ادبی ماحول میں دیکھا۔ ہمارے بزرگوں نے بچوں کواجازت دے رکھی تھی کہ جب تک چاہیں ان محفلوں میں موجودرہیں، ہم بچے اکثر دیر تک ان محفلوں میں بیٹھے رہتے تھے'' [1]

خواجہ عبدالوحید نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آغاز جوانی میں ہی انہوں نے امام الاولیا حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ سے بیعت لیا اور انہیں کے ساتھ شریک درس ہوئے۔ خواجہ عبدالوحید تعلیم مکمل کرنے کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب، لاہور میں آزادی سے قبل ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے اور ۱۹۵۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ خواجہ عبدالوحید کی شادی لاہور کے مشہور پبلشر جناب میر امیر بخش، کی صاحبزادی معراج بیگم سے ہوئی۔

خواجہ عبدالوحید بچپن ہی میں علامہ اقبال سے متعارف ہوئے جوانی میں ان سے برابر تعلقات رکھا اور یہ سلسلہ اقبال کی وفات تک جاری رہا۔ اس لحاظ سے خواجہ عبدالوحید اقبال کے قریبی لوگوں میں سے ایک تھے۔ اتنا ہی نہیں اقبال ان پر بہت بھروسہ بھی کرتے تھے۔ اکثر اپنے اخباری بیانات وغیرہ خواجہ عبدالوحید سے لکھوایا کرتے تھے خواجہ عبدالوحید تقریباً بیس برس تک یہ خدمات انجام دیتے رہے اور کبھی اس کام کے لیے کسی قسم کی منعفت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

---

[1] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ص:10

خواجہ عبدالوحید کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر قدرت حاصل تھی، اسلامیات اور اقبالیات ان کا اہم موضوع تھا۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ کی تصنیف ''قرآن الکریم اور تفسیر'' پر نظر ثانی کی، خواجہ عبدالوحید کی قرآن فہمی، علمیت اور عربی زبان پر دسترس سے متاثر ہو کر عبداللہ یوسف علی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے تراجم و تفاسیر پر نظر ثانی کرنے کو کہا۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، نے شبلی نعمانی کی کتاب ''فاروقِ اعظم'' کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو نظر ثانی کے لیے خواجہ عبدالوحید سے درخواست کی تھی۔ خواجہ عبدالوحید خود بھی قرآن شریف کا ترجمہ و تفسیر انگریزی زبان میں کیا لیکن اس کام کو وہ مکمل نہیں کر سکے صرف انیس (۱۹) پاروں کا ترجمہ اور تفسیر ہوئی۔ اور یہ ترجمہ اور تفسیر ''قرآن سوسائٹی'' کراچی کے پندرہ روزہ جریدے ''الاسلام'' میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ [1]

[1] ۔ یہ معلومات خواجہ عبدالرحمن طارق کے مضمون ''مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان'' مشمولہ جوش اور خامہ بگوش سے لی گئی ہیں۔

خواجہ عبدالوحید کی علمی و ادبی خدمات میں ان کی صحافت کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ان کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ''مسلم آوٹ لک'' اور ''الاسلام'' ہے اخبار ''الاسلام'' پندرہ روزہ کراچی سے انگریزی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار وکٹوریہ روڈ صدر کراچی سے خواجہ عبدالحیٔ کی جانب سے چھپتا تھا اور اس اخبار کا دفتر نیوٹاؤن مسجد میں تھا دراصل خواجہ عبدالوحید سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اس اخبار ''الاسلام'' کو اپنے بیٹے خواجہ عبدالحیٔ (مشفق خواجہ) کے نام سے شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انجمن خدام الدین، لاہور کا پندرہ روزہ اخبار ''اسلام'' بھی کئی سال تک خواجہ عبدالوحید کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کے تمام اداریے اقبال کی ہدایات اور نگرانی میں لکھے جاتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید نے ایک جگہ اپنے اخبار اور ادارتی ذمہ داریوں اور علامہ اقبال کی اس اخبار سے دلچسپی اور اس کے لیے ان کے مفید مشوروں اور تجاویزات کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''انجمن کے بانی حضرت احمد علی کے ارشادات پر اس کی ادارتی ذمہ

داریاں میں نے سنبھالی۔اس اخبار سے علامہ اقبال بے حد دلچسپی لیتے تھے۔وہ اسے باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔میں جو اداریے اور۔۔۔۔لکھتا تھا اکثر چھپنے سے پہلے حضرت علامہ اقبال کو سنا دیتا تھا۔وہ جو ترمیم واصلاح تجویز فرماتے میں اس کے مطابق اپنی تحریروں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے ادارے کے موضوع کا تعین فرمایا اور میں نے ان کے ارشادات کی تکمیل کی۔[1]

اقبال کا معرکۃ الآراء مقالہ ''اسلام اینڈ احمدازم'' پہلی بار اسی اخبار میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ مذکورہ رسائل کے علاوہ دارالتصنیف، کراچی کے پندرہ روزہ انگریزی رسالہ ''یقین'' کے ابتدائی پرچے بھی انہوں نے ہی ترتیب دیے ہیں۔

خواجہ عبدالوحید ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالقوی نعمانی اور بعض ایسے ہی قابل دانشمند دوستوں کے ساتھ مل کر ''اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے اک تنظیم لاہور میں قائم کی تھی۔اس تنظیم کا مقصد تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں اسلامی تمدن اور تاریخ سے دِلچسپی پیدا کرنا تھا۔اس تنظیم کو چلانے میں اقبال کی سرپرستی حاصل تھی اور اقبال بھی انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔خواجہ عبدالوحید ۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو اس تنظیم کے زیر اہتمام اپنے چند دوستوں کی مدد سے ''یوم اقبال'' منایا اور اقبال کے فکر وفن پر مقالات بھی پڑھے گئے۔

خواجہ عبدالوحید نے مختلف موضوعات پر اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تفصیل درجہ ذیل ہے:

۱) موضوعات قرآنی اور انسانی زندگی: یہ تصنیف ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔

۲) ''تلاش سکوں'' یہ ان کے افسانوں کا مجموعہ تاج کمپنی، لاہور سے ۱۹۴۷ء سے قبل شائع ہوا ہے۔

---

[1] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ص:11

۳) یادایام یہ روزنامچہ ہے،اس روزنامچہ میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک دس سالوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے:اور یہ ۲۰۰۶ء میں شعبۂ تصنیف وترجمہ،کراچی یونیورسٹی سے شائع ہوا ہے۔

ان اردو کتابوں کے علاوہ خواجہ عبدالوحید کی انگریزی زبان میں موجود کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

1. "Womans place national life in the light of Holy Quran "

2. A Bibliography of Iqbal

یہ کتاب اقبال اکیڈیمی سے 1965 میں شائع ہوئی۔

3. Islami Background of modern and culture

یہ کتاب National Book foundation Islamabad سے 1977ء میں شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ تصانیف کے علاوہ خواجہ عبدالوحید نے اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر متعدد مقالے بھی لکھے ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں خواجہ عبدالوحید اپنے دیگر افراد خاندان کے ساتھ لاہور سے کراچی آ کر مستقل سکونت اختیار کی اور یہیں ۲۷/اور ۲۸/دسمبر ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب کو اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے ان کی تدفین کراچی کے سوسائٹی قبرستان میں ہوئی۔

والدہ

مشفق خواجہ کی والدہ معراج بیگم پنجاب کے ایک بڑے پبلیشر جناب میر امیر بخش کی صاحبزادی تھیں۔ میر امیر بخش ''کریمی پریس'' کے نام سے ایک پریس چلاتے تھے اسی کریمی پریس سے علامہ اقبال کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔اس کے علاوہ اپنے زمانے کے متعدد مشہور رسالے مثلاً ''شباب اردو'' ''نیرنگِ خیال'' ''عالمگیر'' وغیرہ اسی پریس سے چھپا کرتے تھے۔خواجہ عبدالرحمن طارق کریمی پریس کی

مطبوعات کا ذکر کرتے انہیں پنجاب کا نولکشور کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

> میر امیر بخش، غیر منقسم پنجاب کے سب سے بڑے پبلشر تھے۔ اگر انہیں پنجاب کا نولکشور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، وہ صاحب علم ہی نہیں، ایک عملی مسلمان تھے۔ ان کا کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جو تقسیم ہند کے فوری بعد راوی کے ایک بڑے سیلاب کی نذر ہوگیا۔ میر امیر بخش کے کریمی پریس میں چھپی ہوئی بہت سی کتابیں، مشفق خواجہ کے ذاتی کتب خانہ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ راقم کے پاس ان کے پریس کا چھپا ہوا ایک بڑی تقطیع کا خوبصورت قرآن محفوظ ہے۔ جو والدۂ مرحومہ کے جہیز میں دیا گیا تھا۔[1]

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، ۲۵

مشفق خواجہ کی والدہ نہایت ہی دیندار خاتون تھیں نمازوں کی سختی سے پابند کرتی تھیں اس کے علاوہ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی ان کا زیادہ وقت گذرتا تھا۔ مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمن اپنی والدہ کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک انتہائی عابد و زاہد اور تہجد گزار خاتون تھیں۔ مرحومہ ہر روز ہی نسخہ قرآن بآواز بلند تلاوت فرماتی تھی۔ میں آج بھی جب نماز فجر سے فارغ ہوتا ہوں تو ان کے لحن داؤدی کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے''۔[1]

مشفق خواجہ کی والدہ معراج بیگم کا انتقال خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق ۲۸/ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں کراچی میں ہوا اور ان کی تدفین پی، سی، ایچ، ایس، کے قبرستان میں ہوئی۔

بھائی بہن

---

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش،: ص، 9

خواجہ عبدالوحید اور معراج بیگم کی کل دس (۱۰) اولادیں تھیں، جن میں آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں خواجہ عبدالوحید کے بڑے صاحبزادے خواجہ عبدالقدیر جن کی پیدائش ۲۴ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو ہوئی ان کے بعد ایک لڑکی ارجمند بانو (بی بی باجی) ارجمند بانو کے بعد ولادت ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ خواجہ عبدالحئ (مشفق خواجہ) کی ولادت ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی پھر ڈاکٹر رفعت حسن راٹھور کی ولادت ۱۲ر اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوئی اور خواجہ عبدالرحمن طارق ۱۳ر ڈسمبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے، ان کے بعد خواجہ عبدالسلام عارف کی پیدائش ۲۳ر جولائی ۱۹۴۰ء کو ہوئی اور پھر لڑکی صولت نسیم دانی ۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو تولد ہوئیں اس کے بعد ہمایوں وحید کی ولادت ۸ر جون ۱۹۴۶ء کو ہوئی اور راشد وحید ۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ راشد وحید الکٹرانک میڈیا اور فلم وٹی وی پروڈکشن کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشفق خواجہ کے کل سات بھائی تھے جن میں سے دو بھائی بڑے اور پانچ بھائی ان سے چھوٹے ہیں اور بہنوں میں ایک ان سے بڑی اور ایک ان سے چھوٹی ہیں۔ مشفق خواجہ کا نمبر اپنے دس بھائی بہنوں میں چوتھا تھا۔

مشفق خواجہ کی ولادت

مشفق خواجہ کی ولادت ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو ان کے آبائی مکان محمد نگر لاہور میں ہوئی، مشفق خواجہ کی تاریخ پیدائش میں کہیں بھی اختلاف نہیں ملتا مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمن طارق نے ان کی تاریخ پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مشفق خواجہ (اصل نام خواجہ عبدالحئ) ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ یوم پنجشنبہ اپنے آبائی مکان محمد نگر، لاہور میں پیدا ہوئے'' [1]

مشفق خواجہ نے بھی کئی جگہ اپنے بیانات میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء ہی بتائی ہے، مشفق کا خاندانی نام ''خواجہ عبدالحئ'' رکھا گیا، ادبی دنیا میں وہ مشفق خواجہ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں جب کہ انہوں نے اپنا قلمی نام ''خامہ بگوش'' اور تخلص مشفق استعمال کیا ہے۔

---

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حئ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص: 9

مشفق خواجہ کی ولادت ان کے آبائی مکان ''قدیر منزل'' یہ مکان محمد نگر، لاہور میں ہے میں ہوئی اس مکان کی تاریخی اہمیت ہے کیوں کہ اس مکان میں اپنے عہد کی عظیم ادبی، سیاسی وسماجی شخصتیں آ چکی تھیں۔ خواجہ عبدالرحمن ''قدیر منزل'' کی تاریخ اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ مکان ۱۹۳۴ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ چار کمروں اور ایک وسیع وعریض دالان پر مشتمل مکان تقسیم ہند سے قبل لاہور کے اہم ترین سماجی ثقافتی اور علمی مرکزوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس مکان کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ترکی کے بطل جلیل اور کمال، تاترک کے دست راست جدید ترکیہ کے مجاہد کبیر غازی حسین رؤف عالم اسلام کی مایہ ناز دختر خالدہ ادیب خانم، بلبل سروجنی نائیڈو مفتی اعظم فلسطین حضرت امین الحسینی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور حضرت سلیمان ندوی کے علاوہ ان گنت علما، اکابرین اور سیاسی عمائدین یہاں، تشریف لا چکے ہیں، حضرت سید سلیمان ندوی جب بھی لاہور تشریف لاتے، اسی مکان میں قیام فرماتے۔[1]

مشفق خواجہ کا بچپن

مشفق خواجہ نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں ہر طرف علمی وادبی، تہذیبی وثقافتی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے دادا خواجہ کریم بخش اردو وفارسی ادب کے ماہرین اور والد خواجہ عبدالوحید اسلامیات اور اقبالیات کے ماہرین ان کے تایا عبدالمجید مشہور لغت ''جامع للغات'' کے مولف اور ایک تایا زاد بھائی کرنل خواجہ عبدالرشید انگریزی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اور رشتے کے ایک چچا مولوی محمد دین جنہوں نے اقبال کی حیات میں ان پر پہلی کتاب لکھی تھی۔ چنانچہ اس طرح کے علمی وادبی ماحول میں مشفق خواجہ کا بچپن گذرا ہے، جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ خواجہ عبدالرحمن طارق، اپنے بڑے بھائی مشفق خواجہ

---

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، 23

کے بچپن کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب بچپن ہی سے خاموش طبع تھے، چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں بھی شریک ہوتے۔لیکن اکثر وبیشتر جب ہم لوگ دھینگا مشتی اور ہلّو بازی میں مصروف ہوتے۔وہ کوئی کتاب، رسالہ، یا اخبار لیے گھر کے کسی کونے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر مطالعہ میں مصروف ہوتے۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔انہوں نے گیارہ بارہ برس کی عمر سے ہی تعلیم وتربیت، مخزن (زیادہ تر پرانے شمارے) معارف، ہمایوں، القرآن، ندائے حرم، ہفت روزہ ہمارا پنجاب، روزنامہ زمیندار اور روزنامہ انقلاب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارا پنجاب، زمیندار اور انقلاب سے اپنی پسند کے مضامین تراش کر بڑے احتیاط اور خوش اسلوبی کے ساتھ کاپیوں میں چسپاں بھی کیا کرتے تھے۔مولوی احمد دین وکیل کی کتاب ''سرگزشت الفاظ'' انہوں نے اسی زمانے میں پڑھی چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی ''تعلیم وتربیت سے کہانیاں پڑھ کر سناتے۔فرش پر دری بچھا کر چھوٹے بہن بھائیوں کو ایک حلقہ کی شکل میں اپنے سامنے بٹھا کر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہانی کا آغاز کرتے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ اپنے گھر کے علمی وادبی ماحول سے بچپن ہی سے متاثر ہوئے اور اپنا سارا بچپن کتابوں اور مطالعہ میں گذارا اور آگے چل کر اس علمی وادبی ماحول سے استفادہ کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم مشفق خواجہ کے بچپن اور ان کے ادبی ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''علم وادب کی روایت خواجہ صاحب کو ورثے میں ملی ہے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ گھر میں علمی ماحول ہے، مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں ہیں۔اُس عہد کے بیشتر ادبی رسالے گھر میں آتے تھے۔خواجہ صاحب اس ماحول کے سانچے میں ڈھل گئے، کم عمری ہی سے مطالعے کا شوق پیدا

---

[1] ۔خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، 10

ہوگیا۔مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ [1]

تعلیم وتربیت

مشفق خواجہ کی ابتدائی تعلیم لاہور کے ایک ''سناتن دھرم ہائی اسکول''میں ہوئی تقسیم ہند کے وقت مشفق خواجہ چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔خلیق انجم نے لکھا ہے:

> ''لاہور میں ایک اسکول تھا سناتن دھرم ہائی اسکول ،اس میں مشفق خواجہ صاحب کی ابتدائی تعلیم ہوئی ۔تقسیم ملک کے وقت مشفق خواجہ صاحب چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے۔ [2]

خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق بھی مشفق خواجہ کی ابتدائی تعلیم سناتن دھرم ہائی اسکول ہی میں ہوئی وہ مزید اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے ابتدائی تعلیم، سناتن دھرم پبلک ہائی اسکول ایمپر روڈ لاہور میں حاصل کی مذکورہ اسکول ایس ڈی پبلک ہائی اسکول کے نام سے معروف تھا۔ [3]

مشفق خواجہ اپنی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رکھ سکے کیونکہ ۱۹۴۸ء کے بعد مشفق خواجہ کے والد لاہور سے ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ان کی باقی تعلیم کراچی ہی میں مکمل ہوئی، پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کے والد گرامی ۱۹۴۸ء میں نقل مکانی کر کے کراچی تشریف لے آئے اس اختیاری ہجرت کی وجہ سے مشفق خواجہ کی تعلیم کا تسلسل قائم نہ رہ سکا اور انہوں نے ایک پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان کیا''۔ [4]

---

[1] [2] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' ۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ص،۳

[3] جوش اور خامہ بگوش مرتب، خواجہ عبدالرحمن طارق ۔ص،۹

[4] ۔خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، :ص،۱۳

مشفق خواجہ میٹرک کے بعد اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور سے رجوع ہوئے، جہاں انہوں نے اپنے زمانے کے قابل اساتذہ کی رہنمائی حاصل کی۔ان کے اساتذہ میں سیّد محمد عسکری، شجاع احمد زیبا، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر کرّار حسین اور پروفیسر سیّد محمد ابوالخیر کشفی وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں مشفق خواجہ نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے (آنرز) مکمل کیا۔گریجویشن کی تکمیل کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو سے ایم اے کیا اور ان کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ ''اردو میں آپ بیتی'' کے موضوع پر تھا۔اس طرح سے ۱۹۵۸ء میں مشفق خواجہ نے ایم۔اے (اردو) کی سند حاصل کی۔

مشفق خواجہ طالب علمی کے زمانے میں ایک با صلاحیت محنتی طالب علم واقع ہوئے ہیں۔یوسف ناظم نے لکھا ہے:

> ''بقول یوسف ناظم مشفق خواجہ نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں دوسرے ہم جماعت طلباء کی طرح غیر علمی اور تفریحی مشاغل میں کبھی حصہ نہیں لیا اور نہایت تندہی اور لگن کے ساتھ اپنی وہبی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور تحقیق کے مشقت طالب میدان میں کامیاب و کامران ہونے پر اپنی توانائی صرف کیں''۔[1]

مشفق خواجہ اپنے تعلیمی سفر کے دوران ایک محنتی اور ذہین طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک با اخلاق اور مہذب انسان بھی تھے۔اور کالج کے زمانے میں اپنے ہم جماعت اور سینئر ساتھیوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات روا رکھا کرتے تھے۔اظہر حسن صدیقی نے مشفق خواجہ کی اخلاقیات کو اس طرح سراہا ہے لکھتے ہیں:

> ''محترم مشفق خواجہ ہم لوگوں کے تو جونیئر تھے اور اس کا لحاظ بھی رکھتے تھے مگر بحث اور گفتگو میں اور خاص طور پر ایسی گفتگو میں جس میں طنز و مزاح کا پہلو زیادہ نکلتا ہو اس سے آگے رہتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اس قسم کے بہت سے معرکے ہم نے کالج اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی بارہا دیکھے

---

[1] یوسف ناظم شخصیت خامہ بگوش، مشمولہ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی ۲۰۰۵ء، ص ۵۴

ہیں"۔ [1]

کالج کے زمانے سے ہی مشفق خواجہ کا مطالعہ گہرا رہا ہے خاص طور سے اردو کی کلاسیکی شاعری پر ان کی نظر زیادہ ہوتی تھی اور انہوں نے اردو کے بہت سے اہم شاعروں کا مطالعہ بھی کیا تھا اور اپنے پسندیدہ اشعار پر نشان لگا کر رکھا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن ان کے طالب علمی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کالج کے زمانے میں خواجہ صاحب نے اردو کی کلاسیکی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ تقریباً سبھی اہم اور نیم اہم شعرا کے دواوین ان کی نظر سے گزرے۔ وہ اپنے پسندیدہ اشعار پر ایک دائرہ کی شکل (O) میں نشانہ لگاتے تھے۔ جنہیں ایک رجسٹر میں نقل کرنے کی ذمہ داری انہوں نے مجھے تفویض کر رکھی تھی۔ "اردو شاعری اور ابتذال" کے عنوان سے بھی انہوں نے بہت سے اشعار ایک علاحدہ رجسٹر میں مجھ سے نقل کروائے ممکن ہے اس سلسلہ میں وہ کوئی مقالہ لکھنا چاہتے ہوں لیکن دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کام کے لیے وقت نہ نکال سکے ہوں" [2]

مشفق خواجہ کو طالب علمی کے زمانے سے نہ صرف شاعری سے دلچسپی تھ بلکہ ترجمہ میں بھی انہوں نے اپنی دلچسپی اسی زمانے میں ظاہر کی اور کئی تصانیف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "مشفق بھائی نے طالب علمی کے دور ہی سے شاعری کے پہلو بہ پہلو ترجمہ و تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا جس زمانے میں وہ اسلامیہ کالج، کراچی میں سیکنڈ ایر کے طالب علم تھے انہوں نے روسو (Jeen Jaeques Rousseav) کی خود نوشت سوانح عمری (The Confessions) کا (انگریزی سے) اردو میں ترجمہ کیا۔ چوں کہ نظر ثانی

---

[1] اظہر حسین صدیقی، مشفق خواجہ لائبریری، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص، ۱۱۵

[2] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، ۱۱

کے لئے وقت نہ نکال سکے اس لئے یہ ترجمہ طباعت کے مراحل سے نہ گذر سکا۔
ترجمہ کا مکمل مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔کالج کے تیسرے اور چوتھے سال
میں مشفق بھائی نے ''تاریخ فرشتہ'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔یہ کتاب ان
کے اصلی نام (خواجہ عبدالحی) کے ساتھ نفیس اکیڈیمی، کراچی نے شائع کی، اسی
زمانہ میں مشفق بھائی جان نے ابن انشا مرحوم کے ایما پر چند ناول بھی لکھے جو
ایک معروف نسوانی نام سے شائع ہوئے''۔[1]

انہوں نے نہ صرف یہ کہ شاعری اور ترجمہ نگاری کے کام کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں کردیا تھا بلکہ وہ مضمون نگاری صحافت سے بھی اسی زمانے سے دلچسپی لینے لگے اور پھر ابن انشاء کے تعاون سے کراچی یونیورسٹی کی اولین میگزین بھی شائع کی تھی۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن ان کی صحافت سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب وہ کراچی یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے تو موصوف نے
اپنے دوست اور اردو کے نامور شاعر ابن انشا مرحوم کے ساتھ مل کر جامعہ کا پہلا
اردو رسالہ نہایت آن بان کے ساتھ نکالا تھا''۔[2]

مشفق خواجہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں جن شعرا سے متاثر تھے اور جن کا مطالعہ کرتے تھے وہ غالب اور اقبال ہیں انہوں نے خود ایک انٹرویو میں بتایا:

''میں نے سب سے پہلے اقبال اور غالب کو پڑھا، خود میرے والد صاحب
نے بیاض بنائی ہوئی تھی جس میں بہت سے شعر تھے'' [3]

مشفق خواجہ کے ابتدائی مطالعہ میں اقبال اور غالب کے علاوہ دوسرے کئی ادیب اور محقق رہے ہیں جیسے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی وغیرہ اسی زمانے سے ان دلچسپی کلاسیکی شاعری سے بڑھتی گئی، طاہر مسعود کو

---

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش،:ص،۱۶

[2] ڈاکٹر محمود الرحمٰن، مشفق خواجہ کی اردو خدمات، مشمولہ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۵ء ص ۴۱۔

[3] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' ۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ص،۴۴

دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

''میں نے سب سے پہلے پنڈت برج موہن، دناتریہ کیفی کی کتاب ''کیفیہ'' پڑھی۔ یہ کتاب قواعدِ زبان و بیان کے بارے میں ہے۔ یہ کتاب مجھے بے حد دلچسپ معلوم ہوئی پھر میں نے ایسی نوعیت کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسی عرصہ میں، میں نے پرانے ادبی رسائل کا سراغ لگانا شروع کیا اور یوں میری دلچسپی پرانے شاعروں کے کلام اور ان کی تاریخ سے بڑھتی گئی'' [1]

اس طرح مشفق خواجہ قدیم وجدید تہذیب سے ہم آہنگ ہوئے، ورثہ میں ادبی ذوق کو پانے کے باوجود انہیں خود ادبی اصناف سے خاصی دلچسپی رہی اور پھر اپنی محنت ولگن اور ذہانت کے بل بوتے وہ ادبی دنیا میں قدم رکھے اور ایک باصلاحیت اور جفاکش ادیب کی حیثیت سے اردو ادب میں مقبول ہوئے۔

ممتاز احمد خان مشفق خواجہ کی اسی صلاحیت اور ذہانت کو سراہاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مشفق خواجہ علمی وادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے بہت سے طالب علم باوجود اس کے کہ علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں خود نہ ادیب ہوتے ہیں اور نہ شاعر۔ یہ کسی بھی گھرانے کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ جن کے یہاں دونسلوں میں قابلِ ذکر عالم اور ادیب پیدا ہوں اور ان میدانوں میں اپنا نقش ثبت کریں۔'' [2]

مشاغل

مشفق خواجہ کے مشاغل میں، تحقیق کرنا، شاعری کرنا، کالم نویسی، اداریہ نویسی، فوٹی گرافی، سگریٹ نوشی، موسیقی سے لطف اندوز ہونا شامل ہے۔ ان کا سب سے محبوب مشغلہ کتابیں جمع کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں کتابوں کا عاشق بھی کہتے تھے، اور کتابوں کا کیڑا اور یہ حال ان کا بچپن ہی سے رہا۔

۱۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص:۲۲۶

۲۔ ممتاز احمد خان، مشفق خواجہ، مشمولہ سہ ماہی ''اردو ادب'' دہلی، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۴۷

مشفق خواجہ کوابتدا ہی سے دنیاوی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہمیشہ اخبار اور رسائل کے تراشے اور ان کے مطالعے میں اپنا سارا وقت نکالتے تھے۔ کتابوں سے انہیں اتنا عشق تھا کہ کھیلنے کودنے کی عمر میں بعض اہم کتابیں جمع کرتے اور انھیں پڑھتے تھے۔ مشفق خواجہ کے اس شوق کے بارے میں خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے لکھا ہے کہ:

> ''خواجہ صاحب کو بچپن ہی سے دنیاوی مال واسباب سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اخباری تراشے، رسائل اور کتابوں جمع کرنے کا شق انہیں ہمیشہ سے جنون کی حد تک تھا۔انہوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی کافی کتابیں اکٹھی کرلی تھیں مجھے ان میں سے کچھ کتابوں کے نام آج بھی یاد ہیں۔مثلاً مولودی احمد دین وکیل کی ''سرگزشت الفاظ، محمد دین فوق کی تاریخ کشمیر اور مجموعہ کلام مرزا رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے اور حضرت علامہ کی بانگ درا''۔ [1]

مشفق خواجہ کے کتابیں جمع کرنے کے شوق کے متعلق یہ مشہور تھا کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی قابل ذکر اردو کتاب چھپتی تھی تو وہ اپنی اشاعت کے ایک مہینہ کے اندر مشفق خواجہ کی میز پر اپنے آپ پہنچ جاتی تھی یا پہنچادی جاتی۔کہا جاتا ہے کہ ان کی ذاتی لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود تھیں۔اسکے علاوہ دس ہزار کے قریب جرائد ورسائل کے شمارے اور مختلف ادبی شخصیات نمبر وغیرہ۔ان کی اس لائبریری سے پاکستان ہی نہیں دنیا کے دیگر ممالک کے محققین اردو بھی مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

ناظم آباد کراچی میں موجود ان کا مکان دراصل ان کا کتب خانہ تھا۔اور ہر طرف کتابوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔خلیق انجم نے اس گھر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''مشفق خواجہ کے گھر میں گیارہ کمرے ہیں دس کمروں میں کتابیں رہتی ہیں اور ایک کمرے میں خواجہ صاحب اور ان کی بیوی۔اس لائبریری میں کتابیں

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص،۱۱۔

سلیقے سے رکھنے کے لئے انہوں نے چار پانچ آدمیوں کو رکھا ہوا ہے۔ [1]

خلیق انجم کے مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابیں ان کے لئے اوڑھنا بچھونا تھی۔ جس شخص نے بھی ان کے گھر کو دیکھا ہے بس یہی کہا ہے کہ ان کے گھر میں فرش سے چھت تک کتابیں بھری ہوئیں تھیں جس طرف بھی نظر ڈالتے کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ مشفق خواجہ خود اپنے اس گھر کو کتب خانہ کہتے تھے۔ جس کا ذکر محمد راشد شیخ نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے لکھتے ہیں:

''کس کا امیر خانہ ہوتا ہے، کسی کا غریب خانہ، ہمارا کتب خانہ ہے'' مشفق خوانہ نے یہ الفاظ اس وقت ادا کیے تھے جب چند برس قبل ہندوستان کے نامور ادیب اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر عبدالمغنی پٹنہ سے کراچی آئے تھے اور خواجہ صاحب کے گھر میں تشریف فرما تھے'' [2]

مشفق خواجہ ہمیشہ نئی نئی کتابوں کی جستجو میں لگے رہتے تھے اور جیسے ہی کوئی نئے موضوع پر کوئی قابل تعریف کتاب مل جاتی تو اس کو بڑے ہی انہماک کے ساتھ پڑھتے تھے ان کے اسی ذوق وشوق کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ہمیشہ نئی نئی کتابوں کی جستجو میں لگے رہتے ہیں میں نے انہیں بڑے انہماک کے ساتھ ایسی کتابوں کی ورق گردانی بھی کرتے دیکھا ہے جنہیں ہم چمٹے سے پکڑ کر اپنی الماری سے باہر نکالتے ہیں'' [3]

مشفق خواجہ ہر وہ تحریر جو کام کی ہوتی بغور پڑھتے اور کتابیں ہمیشہ خریدا کرتے تھے۔ بعض اوقات کتاب خرید کر ضرورت مندوں کو مفت تقسیم کر دیتے تھے۔ انہوں نے اور اپنے کتب خانہ کو بالکل سائنسی انداز میں ترتیب دے رکھا تھا۔ ادھر آپ نے کسی کتاب کا نام لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اسی کتاب کے شیلف پر پہنچ

---

[1] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' ۸ تا ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۲

[2] محمد راشد شیخ، مشفق خواجہ اور ان کا کتب خانہ، مشمولہ ہفتہ روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی ۸ تا ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۵، ص: ۱۷

[3] مجتبیٰ حسین، قطع کلام، ص ۱۴۴۔

جاتے تھے۔ مشفق خواجہ کے دوست احباب کو اس کتب خانہ کی ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ خواجہ صاحب کے بعد اس کتب خانہ کا کیا ہوگا اس میں انتہائی نادر ذخیرہ مخطوطات و کتب و جرائد موجود تھے۔ جب دوست احباب نے اس بات کی طرف انہیں اشارہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے وصیت کردی ہے کہ میرا کتب خانہ ہمدرد یونیورسٹی کو دے دیا جائے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق ہمدرد یونیورسٹی کو دے دیا گیا ہے۔

کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کے علاوہ ان کا دوسرا اہم مشغلہ فوٹوگرافی تھا۔ جس طرح وہ کتابوں پر روپیہ خرچ کرتے تھے اسی طرح فوٹوگرافی پر بھی خرچ کرتے تھے۔ اکثر دوستوں اور ملنے والوں کے فوٹوز بہت بڑے شوق سے کھینچے تھے۔ بقول حکیم سید ظل الرحمٰن:

> ''ان کے ذخیرے میں فوٹوں کی تعداد بلا مبالغہ پچاس ہزار سے زیادہ تھی''۔[1]

مشفق خواجہ نے اپنے فوٹوگرافی کے شوق کے بارے میں ایک انٹرویو میں یوں کہا ہے:

> ''مجھے فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے دراصل پرانے مخطوطے نقل کرتے ہوئے میں فوٹو اتار لیتا ہوں اس طرح میرا شوق اور بڑھ گیا ہے''۔[2]

مشفق خواجہ ہمیشہ اپنے ساتھ کیمرہ رکھا کرتے تھے جہاں انہیں کوئی اہم ادیب ملا اس کی تصویریں بنا ڈالتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے سبھی قابل ذکر اہل قلم کی تصویریں انہوں نے اتاری ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ایک واقعہ کے حوالے سے ان کے فوٹوگرافی کے شوق کے بارے میں لکھا ہے:

> ''دہلی کے اردو گھر میں کچھ احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ اچانک مجھ سے بولے ''مجھے آپ سے الگ ایک کام ہے۔ ذرا میرے ساتھ آیئے تو'' مجھے اردو گھر کے ایک کمرہ میں لے گئے۔ اپنے کندھے سے جھولا اتار کر ایک کیمرہ نکالا اور بولے ''حضرت آپ کی کچھ تصویریں لینا چاہتا ہوں''۔ پتہ چلا جنون کی حد

۱۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، مشفق خواجہ ایک نامور محقق، ہفتہ روزہ ہماری زبان، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۵ء ص ۲۸۔

۲۔ امت الصبور ناظمہ طالب، مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق سے ملاقات، بحوالہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ، خلیق انجم، ص ۵۴

تک فوٹوگرافی کا شوق رکھتے ہیں''۔[1]

مشفق خواجہ کو ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے ان کے اس شوق کا ذکر یوں کیا ہے:

''مشفق خواجہ کو اپنے والد خواجہ عبدالوحید کی طرح ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ وہ مجھے اکثر روزنامچے سنایا کرتے، کاش انجمن یہ ورثۂ خواجہ شائع کردے۔ اس طرح نصف صدی کے ادبی مناظر سامنے آجائیں گے''[2]

مشفق خواجہ سگریٹ نوشی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ہمیشہ نئی نئی سگریٹ کے ذائقوں کو آزماتے رہتے تھے۔ وحید الرحمٰن خان ان کی اس سگریٹ نوشی کے شوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

خواجہ صاحب سگریٹ کے معاملے میں ''بلانوش'' تھے، کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے ان کی میز پر سگریٹ کے دو مختلف برانڈ گولڈ لیف اور رتھ مین دکھائی دیئے۔ میں نے اس ''دو رنگ'' کے بارے میں استفسار کیا تو فرمانے لگے کہ میں تو بیک وقت سگریٹ کے پانچ مختلف ذائقے آزمالیتا ہوں اور باہر کے تو تمام سگریٹ شوق سے پیتا ہوں''۔[3]

سگریٹ نوشی کی اکثریت کا یہ عالم تھا کہ ایک کے بعد دیگر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ان کے ایک سگریٹ کے ختم ہونے کے فوری ہی دوسرا سگریٹ جلانے کی عادت پر مزاحیہ انداز میں لکھتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے انھیں سگریٹ نوشی کے معاملہ میں کفایت شعار بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ سگریٹ نوشی کے معاملہ میں نہایت کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ صبح میں ایک بار اپنا سگریٹ جلاتے ہیں اور رات تک اس سگریٹ سے بعد کے سگریٹ جلاتے چلے جاتے ہیں۔ سگریٹ نوشی کے اس انداز سے

۱۔ مجتبیٰ حسین، قطع کلام، ص ۱۴۴۔

۲۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن، مشفق خواجہ کی اردو خدمات، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۴۴

۳۔ وحید الرحمٰن خان، ایک مشفق خواجہ کی یاد میں، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص ۸۱۔

ماچس کی بچت بہت ہوتی ہے''۔[1]

ملازمت

مشفق خواجہ نے تکمیل تعلیم سے قبل ہی ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی اختیار کر لی تھی جہاں تقریباً ۱۷ سال یعنی ۱۹۷۳ء تک شعبۂ تحقیق کے نگران کی حیثیت سے رہے۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۱ء تک مولوی عبدالحق صاحب کے سیکریٹری رہے اور اس طرح سے انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی کے بارے میں طاہر مسعود کو دیئے گئے انٹرویو میں اس طرح ذکر کیا ہے:

> ''۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم سے میرا تعارف یوں ہوا کہ میں انجمن کے کتاب خانے میں مطالعہ کی غرض سے جاتا تھا۔ وہیں ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا ''تم کون ہو؟'' اور یہاں کیوں آتے ہو؟ میں نے جب بتایا کہ میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں سے دلچسپی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ ایک دو مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی قلمی نسخے کے اقتباسات انہوں نے نقل کرنے کے لئے دیئے جب میں نے اس کو نقل کر دیا تو بولے ''حیرت ہے تم نے اس دکنی زبان کے مسودے کو بالکل صحیح صحیح پڑھ لیا۔ عرض کیا میں پنجابی ہوں''۔ اس وجہ سے اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ پنجابی اور دکنی زبان میں بڑی مشابہت ہے۔ اس لئے پنجابی جاننے والوں کے لئے دکنی زبان کو پڑھنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے مختلف کام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان سے ابن انشاء نے میرا باقاعدہ تعارف کر دیا۔ ابن انشاء کے مولوی صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ ان ہی کے توسط سے میں انجمن کے رسالہ ''اردو'' سے وابستہ ہوا۔ جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہوا تو مولوی صاحب نے انجمن میں

۱۔ مجتبیٰ حسین، قطع کلام، ص ۱۴۴۔

میرا تقرر کر دیا اسی طرح میں تاریخی ادارے سے مولوی صاحب کی زندگی میں
ساڑھے چار سال تک منسلک رہا۔[1]

مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد ۱۹۷۳ء تک انجمن کے ممتاز جریدے ''اردو'' اور ''قومی زبان'' کے ادارتی فرائض تنہا انجام دیتے رہے اور ساتھ ساتھ انتظامی امور کی خدمات بھی انجام دی اور ۱۹۷۳ء میں انجمن سے مکمل سبک دوشی حاصل کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور خود کو علمی اور ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے ایک انٹریو میں ملازمت ترک کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''زندگی بھر ایک ادارے سے تعلق رکھا ہے وہ ہے انجمن اردو وہاں سترہ سال سروس کی لیکن چھوڑ دیا وہاں لوگ بہت آتے تھے جس سے وقت ضائع ہوتا تھا۔

[2]

[2] ۱۔ امت الصبور رنا ظمہ طالب، مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق سے ملاقات، بحوالہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ، خلیق انجم، ص، ۵۳

شادی

مشفق خواجہ کی شادی ۱۹۶۴ء میں آمنہ صدیقی صاحبہ سے ہوئی شادی کے بعد وہ آمنہ مشفق کہی جانے لگیں۔ آمنہ مشفق لکھنو کی رہنے والی تھیں اردو ادب سے انہیں بھی خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے اردو اور اسلامی تاریخ میں ایم۔اے کیا اور داغ دہلوی پر پی ایچ ڈی (Ph.D) کی۔ اور ۱۹۷۲ء سے کراچی کے سرسید گرلز کالج میں اردو کی لکچرر بھی رہ چکی ہیں۔

آمنہ مشفق کو بچپن سے علم و ادب سے خاص دلچسپی رہی۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ وہ پانچویں کلاس سے لکھنے کا ذوق وشوق رکھتی تھیں۔ اپنے اِس شوق کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

''میرا علم و ادب کی طرف بچپن سے رجحان تھا۔ دوسرے کچھ لکھنے لکھانے کا

---

[1] طاہر مسعود، ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''۔ ص، ۲۲۶

بھی شوق تھا پڑھانے کے دوران اس کا موقع بھی ملتا ہے آج کل میں داغ پر پی
ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ [1]

آمنہ مشفق کی ایک کتاب شادی سے پہلے ''افکار عبدالحق'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کالج کے ایک مجلّہ کی ادارت بھی کی ہے۔

مشفق خواجہ کی ازواجی زندگی

مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق کی ازواجی زندگی بڑی خوشگوار رہی ہے یہ دونوں ایک دوسرے کا نہ صرف خوب خیال رکھا کرتے تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی کرتے تھے۔ دونوں میں کبھی کسی بات کے لیے تنازعہ نہیں ہوا۔آمنہ مشفق اپنے ایک انٹرویو میں اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں اس طرح کہا ہے:

''ہم لوگوں میں بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے
ہیں اور ایک دوسرے سے ہماری طبیعتیں بھی بہت ملتی ہیں ۔میں خاص طور پر ان
کا خیال رکھتی ہوں ۔اور جواباً وہ بھی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ [2]

آمنہ مشفق ایک شفیق،ملنسار اور پُر خلوص شخصیت کی مالک رہی ہیں مشفق خواجہ کے تحقیقی اور ادبی سفر میں آمنہ مشفق کی پر خلوص شخصیت بھی شامل رہی ہیں۔تنویر احمد علوی ان کی اسی خصوصیت کو سراہتے ہوئے انہیں ''سرسوتی'' کے خطاب سے نوازتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ان (مشفق خواجہ) کے تحقیقی اور ادبی منصوبوں میں ان کی شریک حیات
آمنہ صدیقی کی پُر خلوص شخصیت کا بھی بڑا دخل ہے اسی لیے میں ان کو ''سرسوتی''
کہتا ہوں، مشفق خواجہ کی علمی اور ادبی کاوشوں کے فروغ میں آمنہ کے حسنِ ذن
سے صرفِ نظر شاید ممکن نہیں''۔ [3]

۱۔امت الصبور رناظمہ طالب، مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق سے ملاقات، بحوالہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ،ص، ۳۸

۲ ۱۔امت الصبور رناظمہ طالب، مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق سے ملاقات، بحوالہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ،ص 41

۳ تنویر احمد علوی، مشفق خواجہ، مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ ۔ص، ۵۹

آمنہ مشفق نے، مشفق خواجہ کے کام کاج میں نہ صرف ساتھ دیتی ہیں بلکہ ایک ذمہ دار بیوی کی حیثیت سے وہ کبھی ان کے پڑھنے لکھنے کے معاملہ میں مداخلت نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشفق خواجہ کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ ان کے پڑھنے لکھنے کے معاملہ میں ان کی بہت مدد کرتی ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

''جی ہاں! شادی کے بعد مجھے کام کا بہت موقع ملا۔ میری بیوی بیچاری میری بہت مدد کرتی ہیں میں مہینے میں ڈیڑھ دو ہزار کتابیں خریدتا ہوں وہ کبھی برا نہیں مانتیں اور بیوی ہو تو کہے آپ اتنا پیسا کیوں خرچ کرتے ہیں۔[1]

آمنہ مشفق تدریسی مصروفیات اور ادبی و علمی کاموں کے علاوہ امور خانہ داری اور گھر کے سارے انتظامی امور کو بھی اچھی طرح انجام دیتی تھیں، مرزا دیب اپنے ایک مضمون میں ایک واقعہ کے جواب سے آمنہ مشفق کی امور خانہ داری پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''میں پچھلی مرتبہ کراچی گیا تو خواجہ صاحب نے میرے اعزاز میں کراچی کے بیشتر ادیبوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ کھانے متنوع قسم کے تھے اور نہایت لذیذ، میرا خیال تھا خواجہ صاحب نے کھانے تیار کرنے کے لیے کراچی کے کسی مشہور باورچی کی خدمات حاصل کی ہوں گی مگر جب انہوں نے بتایا کہ یہ آمنہ نے تیار کیے ہیں، تو میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا، میں نہیں سمجھتا تھا کہ آمنہ بھابی جو اپنی تدریسی مصروفیات کے ساتھ گھر کے سارے انتظامی امور بھی رکھتی ہیں۔ اتنے رنگا رنگ اور مزے دار کھانے تیار کرلیں گی''۔ [2]

اولاد

مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق کی کوئی اولاد نہیں تھی اس بات کا غم دونوں کو تھا، خواجہ صاحب اپنے چھوٹے بھائی کی اولادوں کو ہی اپنی اولادیں سمجھتے تھے، مشفق خواجہ کو انٹرویو میں اولاد کے بارے میں جب سوال کیا

ا۔ امتہ الصبور رناظمہ طالب، مشفق خواجہ اور آمنہ مشفق سے ملاقات، بحوالہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ، خلیق انجم، ص ۵۵

[1] مرزا ادیب، تحقیق کا مشفق، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص، ۱۷۴



مشفق خواجہ، بیگم آمنہ مشفق

گیا تو انہوں نے الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہی ہماری اولادیں ہیں اور یہ بچے اتنے اچھے ہیں کہ کبھی شرارت نہیں کرتے۔

ادبی سفر کا آغاز

مشفق خواجہ طالب علمی کے زمانے سے تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا جب یہ کالج کے طالب علم تھے تو انہوں نے کالج کی میگزین کے لیے ایک مضمون اردو زبان کے بارے میں لکھا تھا اس سے قبل انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھی تھیں اور ان کی یہ تحریریں رسالہ ''امروز'' میں شائع ہوتی تھیں۔ مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق ان کے ادبی سفر کا آغاز اسی طالب علمی کے زمانے میں ہوا، ان کے طالب علمی زمانے کی ادبی خدمات اور تصنیف وتالیف پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''مشفق بھائی نے طالب علمی کے دور ہی سے شاعری کے پہلو بہ پہلو ترجمہ و تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا جس زمانے میں وہ اسلامیہ کالج، کراچی میں سیکنڈ ائر کے طالب علم تھے۔ انہوں نے (Jean jacques Roussek) کی خودنوشت سوانح عمری the confessions کا انگریزی سے اردو ترجمہ کیا۔ چوں کہ نظر ثانی کے لیے وقت نہ نکال سکے، اس لیے یہ ترجمہ طباعت کے مراحل سے نہ گذر سکا ترجمے کا مکمل مسودہ میرے پاس محفوظ ہے، کالج کے تیسرے اور چوتھے سال میں مشفق بھائی نے ''تاریخ فرشتہ'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ان کے اصلی نام (خواجہ عبدالحئی) کے نام کے ساتھ نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کی۔ (حال ہی میں لاہور سے ایک پبلشر نے یہ ترجمہ بغیر اجازت شائع کیا ہے) اسی زمانہ میں مشفق بھائی جان نے ابن انشا مرحوم کے ایما پر چند ناول بھی لکھے جو ایک معروف نسوانی نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے خالصتاً علمی اور تحقیقی کام کیے''۔ [1]

---

[1] خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص ۱۶

مشفق خواجہ کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ''انجمن ترقی اردو پاکستان'' سے وابستگی کے بعد ہوتا ہے جب وہ بی اے کے طالب علم تھے مطالعے کی غرض سے وہ اکثر انجمن ترقی اردو پاکستان کی لائبریری جایا کرتے تھے جہاں ان کی ملاقات انجمن کے معتمد بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہوئی۔ مولوی عبدالحق نوجوان طالب علم مشفق خواجہ کی ذہانت اور علمیت سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں مخطوطات کے شعبے کی ذمہ داری عطا کی جس کے نتیجے میں بہت سے مخطوطات اور تحقیقی مقالات نے کتابی صورت اختیار کی اور تشنگانِ علم وادب کو سیراب کیا۔

انہوں نے ادب کی دنیا میں بحیثیت محقق اور مدوِّن تو قدم رکھا لیکن وہ ادبی دنیا میں بیک وقت محقق و مدون، شاعر و نقاد، مدیر و کالم نگار اور مزاح نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ کی اب تک تصنیف و تالیف کی ہوئی سترہ (17) کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور مزید پانچ (5) کتابیں زیر طبع ہیں ان کتابوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

تصانیف

بحیثیت محقق

مشفق خواجہ کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ بیک وقت شاعر، نقاد، کالم نویس، صحافی اور طنز و مزاح نگار کے ساتھ ہی ساتھ ایک جید محقق بھی تھے دراصل انہوں نے ادبی دنیا میں ایک محقق کی حیثیت سے ہی قدم رکھا تھا۔ تحقیق کے میدان میں انہوں نے کئی اہم علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں، تحقیق کا ورثہ انہیں اپنے والد محترم خواجہ عبدالوحید سے ملا ہے جن کا شمار اپنے زمانے کے اعلیٰ پائے کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ طاہر مسعود کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اپنی تحقیق سے دلچسپی کے بارے میں بتاتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''قصہ یہ ہے کہ مجھ میں تحقیق سے دلچسپی گھر کے علمی ماحول کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ میرے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم مختلف نوعیت کے علمی و ادبی کام انجام

دیتے رہتے تھے۔انہیں دیکھ کر میں تحقیق کی طرف مائل ہوا۔بعد میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو پرانی چیزوں سے میری دلچسپی بڑھ گئی، میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے رسائل پڑھتا تھا۔اب بھی یہی کیفیت ہے کہ اگر میرے سامنے ایک پرانا اور ایک نیا علمی وادبی رسالہ پڑا ہو تو میں پرانے رسالے کو پہلے پڑھتا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مجھے نئی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے یا کم ہے بلکہ بات یہ ہے کہ پرانے رسائل کو پڑھنے میں خود کو اسی عہد میں سانس لیتا ہوا پاتا ہوں۔اسے آپ میرا فطری رجحان کہہ لیں"۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے بچپن ہی سے انہیں تحقیق سے دلچسپی تھی اور پھر میں والد کے علمی وادبی کاموں کو دیکھ کر وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے۔زمانۂ طالب علمی میں جب ان کی ملاقات بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہوئی تو انہوں نے عبدالحق سے قلمی کتابوں سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور جب مشفق خواجہ فارغ التحصیل ہوئے تو مولوی عبدالحق نے ان کا تقرر "انجمن ترقی اردو پاکستان" میں کر دیا اور انہیں شعبۂ تحقیق کا نگران مقرر کیا۔اور اس طرح سے وہ تحقیق سے ان کی وابستگی بڑھتی چلی گئی۔انجمن ترقی اردو سے وابستگی اور مولوی عبدالحق کی سرپرستی کے علاوہ انہوں نے سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور شان الحق حقی جیسے بلند پائے محققین سے فیض اٹھا کر پوری لگن اور ایمانداری سے تحقیقی خدمات میں جٹ گئے اور اپنی بیش وبہا خدمات انجام دیں۔

بحیثیت محقق ومدوین مشفق خواجہ کی اب تک دس تصانیف منظر عام پر آئی ہیں اور کتابیں زیر طبع ہیں ان چار کتابوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

1) خوش معرکہ زیبا (جلد اول) 1970ء

(جلد دوم) 1972ء

---

[1] مشفق خواجہ ایک مطالعہ،ص: 27

2)پرانے شاعر نیا کلام	1975ء
3)اقبال (از احمد دین)	1979ء
4)جائز مخطوطات اردو جلد اول	1979ء
5)غالب اور صغیر بلگرامی	1981ء
6) تحقیق نامہ	1991ء
7)مرزا یگانہ شخصیت اور فن	1992ء
8)انتخاب کلام میر	2000ء
9) کلیات یگانہ، (اشاعت اول)	2003ء
(اشاعت دوم)	2007ء
10)یادایام (روزنامچہ)	2006ء

زیر طبع کتابیں

1) خطوط یگانہ

2) مضامین یگانہ

3)فرمان سلیمانی

4) جائزہ مخطوطات اردو (جلد دوم)

مشفق خواجہ کا تحقیقی کام کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے کم ہے لیکن یہ تحقیقی کام ہزار ہا صفحات پر مشتمل ہے، جس میں تکرار سرے سے موجود نہیں۔ وہ بلاشبہ اپنے اس کام کی وجہ سے گنتی کے چند اعلیٰ محققین کی صف میں بآسانی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ یہاں ان کے ان تحقیقی کارناموں کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ جن کی وجہ سے انہیں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ا۔خوش معرکہ زیبا:

بحیثیت محقق ومدون مشفق خواجہ کی یہ پہلی تصنیف ہے ''خوش معرکہ زیبا'' دراصل یہ سعادت خان ناصر کا تذکرہ ہے جسے انھوں نے 1846ء میں مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر انور سید کے علاوہ دیگر کئی محققوں نے اس کا سن تصنیف 1848ء بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔اس کے مقدمے میں مشفق خواجہ نے اس تذکرے کے آغاز کی تاریخ 1845ء اور اختتام کی تاریخ 1846ء بتائی ہے۔اس کے علاوہ عطا کاکوئی کے مرتب کردہ ایڈیشن میں بھی اس تذکرے کے آغاز کی تاریخ 1845ء اور اختتام کی تاریخ 1846ء ہی درج ہے۔ مشفق خواجہ نے اس تذکرے پر مفصل مقدمہ لکھ کر اس کا ایک تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ان کا یہ تیار کردہ تنقیدی ایڈیشن دوجلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد 1970ء میں اور دوسری جلد 1972ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ مشفق خواجہ کا مرتب کردہ یہ تذکرہ راقم کو دستیاب نہ ہوسکا لیکن اس تذکرے کے ساتھ ان کا جو عالمانہ مقدمہ شائع ہوا تھا وہ ان کی ایک دوسری کتاب ''تحقیق نامہ'' میں شامل ہے ان کے بیان کے مطابق اس مقدمہ کو اس کتاب میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے اس میں ازسرنو کچھ تبدیلیاں کرنے کے علاوہ اپنی کئی غلطیوں کی تصحیح کرتے ہوئے نئے مآخذ کی روشنی میں بعض نئے مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ اسی مقدمہ کی روشنی میں اس تذکرے کے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

2۔ پرانے شاعر نیا کلام:

پرانے شاعر نیا کلام، مشفق خواجہ کا دوسرا تحقیقی کارنامہ ہے۔اس میں انھوں نے اردو کے بعض قدیم شعراء جیسے خواجہ احسن الدین خان بیان، جسونت سنگھ پروانہ، فضل علی ممتاز اور ولی اللہ محبّ وغیرہ کا مختصراً تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔ یہ شعراء جو اپنے نادر خیالات اور اچھوتے اسلوب کے باوجود گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب چکے تھے، مشفق خواجہ نے انہیں ''پرانے شاعر نیا کلام'' کے عنوان سے منظر عام پر لایا۔ان قدیم شعراء پر مشفق خواجہ سے پہلے کسی نے تفصیل سے نہیں لکھا تھا اگر لکھا

بھی ہے تو وہ سرسری طور پر تھا۔ان کی یہ کتاب قسط وار سہ ماہی رسالہ ''غالب'' کراچی میں 1975-76 میں شائع ہوئی ہے۔ڈاکٹر انور سدید اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہیں:

''مشفق خواجہ کی ایک غیر مدون کتاب ''پرانے شاعر نیا کلام'' ہے جو رسالہ ''غالب'' کراچی میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ یہ تذکرہ ان شعراء کا ہے جو زمانے کی نظروں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔لیکن اپنے زمان میں ''تازہ گوہان سرآمد روزگار'' میں شمار ہوتے تھے۔ان میں سے چند نام یہ ہیں:

فضل علی ممتاز، جسونت سنگھ پروانہ، ولی اللہ محبّ، خواجہ احسن الدین بیان، مرزا محمد رضا قزلباس خان امید۔اردو کے ان کلاسیکی شعراء کا وجود ادب تذکروں میں تو مل جاتا ہے لیکن ان کے کارناموں کو کسی محقق نے شمار کرنے کی کوشش نہیں کی۔مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی اسلوب میں انہیں اس طرح بازیافت کیا کہ بیسویں صدی میں ان کی نشاۃ ثانیہ برپا ہوگئی۔ پرانے شعراء کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا جو آج بھی پسند کئے جاسکیں [1]

3۔اقبال (از احمد دین):

مشفق خواجہ کے تحقیقی کارناموں میں تصنیف ''اقبال'' بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب کل 527 صفحات پر مشتمل ہے جو 1979ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔

حرفے چند کے تحت جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس کتاب کا تعارف کروایا ہے اس کے بعد مشفق خواجہ کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کی طباعت اول اور دوم کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔ دراصل یہ کتاب مشہور تصنیف ''سرگذشت الفاظ'' کے مصنف مولوی احمد دین کی ہے۔مولوی احمد دین مشفق خواجہ کے دادا خواجہ کریم بخش کے رشتے کے بھائی تھے اور علامہ اقبال سے ان کی قریبی دوستی تھی۔انھوں نے 1923ء میں اقبال کی شاعری اور شخصیت پر ایک

---

[1] مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، مضمون بحر تحقیق کا شناور، مشفق خواجہ، از ڈاکٹر انور سدید، ص 154

کتاب لکھی تھی۔ مشفق خواجہ کے مطابق اس کتاب سے قبل اقبال کے بارے میں چند مضامین اور ایک مختصر کتاب A Voice From East، مولفہ نواب ذوالفقار علی خان نے شائع کی تھی لیکن کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی۔ جس میں اقبال کے ذہنی ارتقاء ان کی شاعری کے فن اور شعری کارناموں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کی زندگی میں اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اردو میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب تھی۔ اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیق انجم نے لکھا ہے:

> ''یہ کتاب صرف اس لیے ہی اہم نہیں ہے کہ اقبال پر یہ پہلی کتاب ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اقبال کے فن پر یہ ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جو اقبال سے بہت قریب تھا اور جسے اقبال کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے کا پورا موقع ملا تھا۔[1]

پہلی بار یہ کتاب 1923 میں چھاپی ضرور گئی تھی لیکن اس کی اشاعت نہ ہو سکی تھی۔ مصنف نے کتاب کے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیئے تھے۔ نسخے نذر آتش کر دینے کی وجہ بتاتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''1923ء تک، جب یہ کتاب طبع ہوئی، اقبال کے اردو کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ احمد دین نے اپنی کتاب میں اقبال کا وہ تمام کلام شامل کر لیا تھا جو ''مخزن'' اور بعض دوسرے رسائل میں نیز انجمن حمایت اسلام کی روادوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اقبال اپنے اردو کلام کی اشاعت کی طرف متوجہ تھے اور اسی مقصد سے کلام پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ ''اقبال'' (کتاب) کو انھوں نے پسند نہ فرمایا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ یہ کتاب کسی حد تک ایک مجموعہ کلام کی حیثیت رکھتی تھی، جس میں متعدد طویل نظمیں مکمل طور پر شامل کر لی گئی تھیں نیز بہت سا کلام بغیر کسی تبصرے کے جمع کر دیا گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس میں بہت سا کلام ایسا بھی شامل تھا جسے اب اقبال اپنے نام سے منسوب نہیں کرتے تھے یا اس میں وہ ترمیم و اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ

---

[1] اقبال (مولوی احمد دین) مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ص 93

تھی کہ ایک ایسی کتاب جس میں کلام کا بڑا حصہ شامل ہو، اس سے اقبال کے زیر
ترتیب مجموعہ کلام کی اشاعت متاثر ہو سکتی تھی۔ احمد دین اقبال کے گہرے دوست
تھے انہیں جب دوست کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انھوں نے کسی سے مشورہ کیے
بغیر چپکے سے اپنی کتاب کے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیئے'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق بانگ درا کی اشاعت کے بعد 1926ء میں مصنف احمد دین نے اس کتاب کو ازسرِ نو لکھا اور شائع کروایا اور ادبی دنیا میں طباعت دوم معروف ہوئی لیکن اب اس کا شمار بھی کمیاب کتابوں میں ہوتا ہے۔ طبع اول کے صرف دو نسخے مشفق خواجہ کو مصنف کے گھر سے دستیاب ہوئے اور اس طرح سے انھوں نے ان دونوں ایڈیشنوں کی بازیافت کر کے دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق اقبال کی دونوں طباعتیں اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ طبع اول میں اقبال کا بہت سا ایسا کلام موجود ہے جو ان کے کسی بھی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے اور اس متروک کلام کے بارے میں بعض نئے اور مفید پہلو سامنے آئے ہیں اس کے علاوہ طبع اول میں بعض تنقیدی مباحث ایسے بھی ملتے ہیں جو اس کتاب کی طبع دوم میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔ چنانچہ ان وجوہات کی بنا پر طبع اول کو بھی منظر عام پر لانا ضروری تھا۔ اسی طرح طبع دوم بھی بہت اہم تھا یوں تو طبع اول کا خاصا بڑا حصہ طبع دوم میں شامل تھا، لیکن طبع دوم میں متعدد نئے مباحث کا اضافہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں دونوں طباعتوں کا شائع ہونا ضروری تھا۔ لیکن دونوں طباعتوں کے متن کو ایک ساتھ شائع کرانا بھی مناسب نہیں تھا کیوں کہ مشفق خواجہ کے مطابق دونوں میں مشترک مباحث خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کتاب کا ایک ایسا متن تیار کیا جائے جو دونوں طباعتوں کے مباحث پر مشتمل ہو لیکن اس میں مباحث کی تکرار نہ ہو لہٰذا اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے جو طریقہ کار اپنایا وہ یہ ہے کہ طبع دوم کے متن کو اس کی اصلی صورت میں رکھا اور طبع اول کی زائد عبارتوں کو اختلاف نسخ کے تحت اکٹھا کر دیا اور دیباچہ میں طبع دوم میں مصنف نے جو

---

[1] اقبال، دیباچہ، مرتب مشفق خواجہ، ص 15

تبدیلیاں کی تھیں اس کی تفصیل سے نشاندہی کی ہے۔ دیباچہ میں مشفق خواجہ اس کی بھی صراحت کردی کہ زیر نظر ایڈیشن دونوں طباعتوں پر مشتمل ہے۔

مقدمہ کے تحت مشفق خواجہ نے اس کتاب کے مولف مولوی احمد دین کا ایک سوانحی خاکہ قلمبند کیا ہے۔ جس میں مولوی احمد دین کے خاندان، پیدائش اور تعلیم صحافت اور ملازمت انجمن حمایت اسلام سے ان کی وابستگی، دیگر علمی وادبی اداروں سے ان کی وابستگی، لاہور کی ادبی محفلوں میں ان کی خدمات، وفات، دوست احباب، شخصیت، اولاد، لاہور سے ان کا عشق اور اقبال سے ان کے تعلقات، ان کی مضمون نگاری کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ آخر میں ان کی تصانیف کا مکمل تعارف بھی پیش کیا ہے۔

4) جائزہ مخطوطات اردو:

مشفق خواجہ کی تحقیقی ذرف نگاہی کا ایک اور بے مثل کارنامہ ''جائزہ مخطوطات اردو'' ہے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا اعلیٰ ترین تحقیقی کام اس میں انھوں نے پاکستان کے تمام کتب خانوں میں محفوظ قلمی نسخوں کی وضاحتی فرست تیار کی ہے۔ اس میں شامل ہر مخطوطے کے بارے میں دلائل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ وہ اہم ہے یا غیر اہم نیز اس مخطوطے کے اور نسخے دنیا کی کس کس لائبریری میں موجود ہیں۔ ان نسخوں کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفوں کے حالات زندگی اور ان پر جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی فہرست بھی شامل ہے۔ ایک جگہ جائزہ مخطوطات اردو کے بنیادی موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے مشفق خواجہ اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ انھوں نے مواد کے سلسلے میں کن کن ذرائع سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کا بنیادی موضوع وہ اردو مخطوطات ہیں جو پاکستان کے مختلف سرکاری، غیر سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے مخطوطات کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے ساتھ، مخطوطے کے دیگر نسخوں، مطبوعہ نسخوں، مصنف کے حالات اور مآخذ پر خاص توجہ دی ہے۔

اس طرح یہ کام مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کی حد تک محدود نہیں رہا بلکہ ایک سوانحی و کتابیاتی جائزے کے صورت اختیار کرگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ اسے ایک ایسی کتاب کا حوالہ کہہ سکتے ہیں جس میں کتابوں اور ان کے مصنف کے بارے میں ہر طرح کی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کام روایتی فہرست سازی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، میں نے متعدد کتابوں اوران کے مصنفین کے بارے میں تحقیقی مسائل بھی چھیڑے ہیں اور نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے'' [1]

جائزہ مخطوطات اردو کی پہلی جلد 1248 صفحات پر مشتمل ہے جو 1979ء میں مرکزی اردو بورڈ، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔اس جلد میں کل دوسو کتابوں کا ذکر ہے، یہی نہیں بلکہ ان دوسو کتابوں کے ایک ہزار نسخوں کی تفصیل بھی ہے جو پاکستان سے باہر ہیں۔

غالب اور صغیر بلگرامی

مشفق خواجہ کی تحقیقی صلاحیتوں کا ایک اور ثبوت ''غالب اور صغیر بلگرامی'' ہے۔ دراصل یہ ان کا ایک طویل تحقیقی مقالہ ہے جو 1969ء میں سب سے پہلے رسالہ ''صحیفہ'' لاہور کے غالب نمبر میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ترمیم واضافے کے ساتھ 1981ء میں کراچی سے پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوا اور نومبر 1985ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی جانب سے دوسری مرتبہ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ کتاب کل 207 صفحات پر مشتمل ہے جس میں غالب اور صغیر بلگرامی کے تعلقات کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی مشمولات میں دیباچہ طبع دوم، دیباچہ طبع اول، صغیر بلگرامی، غالب وصغیر کی مراسلت، غالب وصغیر کی ملاقات اور متفرقات وغیرہ کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

۶۔ تحقیق نامہ

تحقیق نامہ مشفق خواجہ کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جو بیک وقت اردو اکیڈمی، لاہور مغربی پاکستان اور

---

[1] مشفق خواجہ ایک مطالعہ، خلیق انجم، ص 78

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی سے نومبر 1991ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ مجموعہ کل 415 صفحات پر مشتمل ہے جس میں مصنف کا ایک دیباچہ اور 6 چھ مضامین شامل ہیں۔

مضامین کی فہرست اس طرح ہے:

☆مرزا محمد رضا قزلباش خاں امیدؔ

☆شاہ قدرت اللہ قدرت

☆مرزا جعفر علی حسرتؔ

☆تذکرہ ''گلشن مشتاق

☆سعادت خان ناصر اور اس کا تذکرہ، ''خوش معرکہ زیبا''

☆احمد دین

ان میں دو مضامین ''سعادت خان ناصر اور اس کا تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' اور احمد دین (مصنف اقبال) کی مرتبہ کتابوں کے مقدمے ہیں جو ان کتابوں کے ساتھ بالترتیب 1970ء اور 1979ء میں شائع ہوئے تھے مشفق خواجہ کے مطابق ان دونوں مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے ان میں کچھ ترمیم و اضافے ہی نہیں کیے بلکہ اپنی کچھ غلطیوں کی تصحیح کرتے ہوئے نئے مآخذ کی روشنی میں بعض نئے مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔

7۔ مرزا یگانہ شخصیت اور فن

مشفق خواجہ کی مرتب کردہ کتابوں میں ایک اہم کتاب ''مرزا یگانہ شخصیت اور فن'' ہے جس کے مرتبین مشفق خواجہ کے علاوہ ان کی شریک حیات آمنہ مشفق اور پاشا رحمان ہیں۔ دراصل یہ کتاب مشفق خواجہ کی ادارات میں نکلنے والے رسالے ''تخلیقی ادب کے حصہ دوم کا دوسرا حصہ گوشۂ مرزا یگانہ شخصیت اور فن پر مشتمل ہے جو 1980ء کے دہے میں شائع ہوا تھا، لہٰذا اس گوشۂ کو آصف پبلی کیشنز ٹیلہ ایر فورٹ علی گڈھ نے

1992ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ کتاب 226 صفحات پر مشتمل ہے جس میں یگانہ کی دو غیر مطبوعہ ''تحریریں ''خاصۂ خاصان ادب، اور اپنا کریکٹر'' کے علاوہ مالک رام، ممتاز حسین، سلیم احمد، سید قدرت نقوی سید مسعود کے تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں یگانہ کی شاعری اور فن کے علاوہ یگانہ کی زبان پر تنقیدی مباحث ملتی ہیں اس کے بعد اقبال بیگم (بنت یگانہ) سید مسعود الحسن تاش دہلوی، پروفیسر شیخ انصار حسین اور دو ارکا داس شعلہ کے مضامین ہیں جن میں یگانہ کے حالات زندگی اور شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح ان مضامین کے بعد مشفق خواجہ نے ''یگانہ کا غیر مطبوعہ کلام'' کے تحت، 20 غزلیات 4 منظومات متفرق اشعار اور 131 رباعیات ترتیب دی ہیں اس کے علاوہ غیر مطبوعہ خطوط بنام دوارکا داس شعلہ کے تحت یگانہ کے 95 غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں جن سے یگانہ کی شخصیت اور ان کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان تمام خطوط پر مشفق خواجہ نے تفصیل سے حواشی بھی لکھے ہیں۔

انتخاب کلام میرؔ:

انتخابِ کلام میر کے عنوان سے مشفق خواجہ نے میر کے کلام کے باغ اہم انتخابات کو مرتب کیا ہے یہ کتاب رقم اطرف الحرف کو حاصل نہیں ہوسکی اس کے اہم انتخابات کو مرتب کیا ہے یہ کتاب رقم الحروف کو حاصل نہیں ہوسکی اس کے علاوہ اس کتاب کے تعلق سے سوائے ان کے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق کے کسی بھی ذکر نہیں کیا۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق کے مطابق ''انتخابِ کلام میرؔ'' میرؔ کے پانچ اہم انتخابات کا مجموعہ ہے جو 200 میں کراچی سے شائع ہوا۔[1]

9۔ کلیات یگانہ

مشفق خواجہ کے مطبوعہ تحقیقی کارناموں میں ایک اہم اور معرکۃ الآرا کام ''کلیات یگانہ'' کی تدوین ہے'' کلیات یگانہ'' کی پہلی اشاعت اکادمی بازیافت کراچی سے 2003ء میں ہوئی۔ اسی طرح ایجوکیشنل

---

[1] جوش اور خامہ بگوش، مضمون دنیائے ادب کا مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان از خواجہ عبدالرحمٰن طارق، ص 18

پبلشنگ ہاؤس دہلی سے 2007ء میں اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی یہ کلیات کل 958 صفحات پر مشتمل ہے۔ کلیات کی مشمولات میں دیباچہ از مرتب کے بعد یگانہ کے 6 چھ مطبوعہ کلام نشتر یاسؔ، آیاتِ وجدانی طبع اول، ترانہ، آیات وجدانی، طبع دوم، آیات وجدانی طبع سوم، گنجینہ مطبوعہ کے علاوہ گنجینہ، قلمی وغیر مطبوعہ شامل ہے، اس کے بعد غیر مدون کلام ہے۔ جس کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے جیسے 1914ء تا 1932ء۔ 1937ء تا 1935ء۔ 1936ء تا 1938ء اور 1951ء تا 1956ء۔ اس غیر مدون کلام کے بعد، باقیات، ضمائم، فراہنگ اور حواشی دی گئی ہے۔ اس طرح سے یہ کلیات کل دس (۱۰) حصوں پر مشتمل ہے۔

مشفق خواجہ نے کلیات میں یگانہ کا ایک سوانحی خاکہ بھی مرتب کیا ہے جس میں انہوں نے زیرِ نظر کلیات میں موجود مختلف مجموعہ ہائے کلام کے دیباچوں اور دیگر مواد کی روشنی میں یگانہ کے حالات زندگی کے ہر پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح مآخذ کے عنوان کے تحت مشفق خواجہ نے ان مآخذ کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے جن کی مدد سے یہ کلیات مرتب کیا گیا ہے ان میں یگانہ کے مطبوعہ اور قلمی وغیر مطبوعہ مجموعوں کے علاوہ یگانہ کی دیگر تصانیف بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد کلیات میں کلام یگانہ ترتیب دیا گیا ہے۔

مشفق خواجہ نے کلیات یگانہ کی تدوین کے لیے برسہابرس کام کیا اس کے لیے بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا، لائبریریاں کھنگال ڈالیں سیکڑوں رسالے جن میں یگانہ کا کلام یا مضمون چھپتا تھا، مطالعہ کر ڈالا اور نہایت سلیقے مندی سے کلیات ترتیب دیا۔ ان کی اس محنت کو دیکھ کر ایک مرتبہ ڈاکٹر طاہر مسعود نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے اس موضوع پر اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ اتنی محنت میں تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''مجھے معلوم ہے یگانہ اتنا بڑا شاعر نہیں ہے کہ اس پر اتنی محنت کی جائے لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کسی پرانے شاعر کی کلیات کیسے مرتب کی جاتی ہے''۔[1]

---

[1] مشفق سن خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص:185

مذکورہ بالا اقتباس سے ایک تو ان کی تحقیقی انکساری ظاہر ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے اس وقیع کام کو تجرباتی کام کہہ رہے ہیں اگر یہ صحیح بھی ہے کہ یہ ان کا تجرباتی کام ہے تو پھر ان کی منصوبہ بندی کے کام کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

10۔یادایام

''یادایام''،مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق کے بیان کے مطابق ان کا آخری کام ہے''یاد ایام''دراصل مشفق خواجہ صاحب کے والدگرامی جناب خواجہ عبدالوحید صاحب کا روزنامچہ(ڈائری) ہے خواجہ عبدالوحید اپنے زمانے کے بلند پایہ ادیب اور صحافی گذرے ہیں۔ان کا شمار علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔اردو اور انگریزی میں ان کی کئی یادگار کتابیں ہیں جیسے''موضوعات قرآنی اور انسانی زندگی'' تلاش سکون''افسانے''''یادایام''(روزنامچہ)اور انگریزی میں "Women place national life، A 'Islami background in the light of Holy Quran" Bibliography of Iqbal of modern and culture"،وغیرہ۔اس کے علاوہ''مسلم آوٹ لک''''الاسلام''اسلام،جیسے جید اخباروں کے مدیر بھی رہے ہیں۔ان ادبی مصروفیات میں ان کا ایک اہم مشغلہ روزنامچہ تحریر کرنا بھی تھا۔چنانچہ مشفق خواجہ نے اس روزنامچے کو''یادایام''کے نام سے تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے جس میں 1929ء سے 1937ء تک کی یادیں قلمبند ہیں یہ روزنامچہ کل 511 صفحات پر مشتمل ہے جو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کی جانب سے 2006ء میں شائع ہوا ہے۔

بحیثیت محقق ومدوین زیرطبع کتابوں میں 4 کتابیں شامل ہیں۔دو کتابیں یگانہ سے تعلق رکھتی ہیں جن میں ایک''خطوط یگانہ''اور دوسری مضامین یگانہ ہے۔اسی طرح زیرطبع کتابوں میں ایک اہم کتاب''فرمان سلیمانی''ہے یہ مرزا سلیمان قدر،نوشتہ لطافت لکھنوی کا روزنامچہ ہے جس کو مشفق خواجہ نے مقدمہ،تعلیقات و

حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے، چوتھی تصنیف جائزہ مخطوطات اردو کی دوسری جلد ہے۔

بحیثیت طنز و مزاح نگار

مشفق خواجہ کے طنزیہ و مزاحیہ کالموں کے اب تک پانچ انتخابات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

1۔ خامہ بگوش کے قلم سے:

یہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ کالموں کا پہلا انتخاب ہے یہ انتخاب پہلی مرتبہ کراچی اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی سے بیک وقت فروری 1995ء میں شائع ہوا اور اس انتخاب کو اردو کے نامور نقاد مظفر علی سید نے مرتب کیا ہے۔ اس انتخاب کا دوسرا ایڈیشن 2007ء پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ یہ انتخاب کل 335 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 60 کالم اور ایک ''غلط نامہ'' کے عنوان سے مشفق خواجہ کا دیباچہ شامل ہے۔ اس انتخاب میں 1983ء تا 1990ء تک کے منتخب کالم موجود ہیں۔

2۔ سخن ہائے ناگفتنی:

یہ ان کے کالموں کا دوسرا انتخاب ہے۔ یہ پہلی بار اکادمی بازیافت کراچی سے اپریل 2004ء میں شائع ہوا اس انتخاب کو بھی مظفر علی سید نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب کل 208 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 35 کالم اور ایک مظفر علی سید کا دیباچہ شامل ہے اس کتاب کا انتساب مجتبیٰ حسین کے نام ہے۔

3۔ سخن در سخن:

''سخن در سخن''، مشفق خواجہ کے طنزیہ و مزاحیہ کالموں کا تیسرا انتخاب ہے۔ اس انتخاب کو بھی مظفر علی سید نے ہی مرتب کیا ہے اس کی اشاعت بھی پہلی بار اپریل 2004ء کو اکادمی بازیافت کراچی سے ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب مشہور مزاح نگار یوسف ناظم کے نام ہے۔ اس انتخاب میں کل 34 کالم ہیں اور اس کا دیباچہ مظفر

علی سید نے لکھا ہے اور یہ انتخاب کل 232 صفحات پر مشتمل ہے۔

4۔ سخن ہائے گسترانہ:

مشفق خواجہ کے منتخب کالموں کا یہ چوتھا مجموعہ پہلی بار 2007ء کو فضلی سنز (پرائیوٹ) لمٹیڈ کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو انور سدید نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ 359 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 80 کالم اور ''عرض سدید'' کے عنوان سے انوار سدید کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا انتساب یوں ہے ''مشفق خواجہ مرحوم کے بھتیجے ڈاکٹر خواجہ خسرو طارق اور خواجہ خرم طارق کی بیٹی صبا خرم کے نام جن سے مرحوم بے انتہا محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے تھے''۔

5۔ جوش اور خامہ بگوش:

مشفق خواجہ کے کالموں کا پانچواں انتخاب جوش اور خامہ بگوش کے عنوان سے ہے۔ جس کو ان کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے مرتب کیا ہے۔ یہ انتخاب فضلی سنز (پرائیویٹ لمٹیڈ کراچی) سے شائع ہوا ہے اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس مجموعہ میں صرف انہی کالموں کو منتخب کیا گیا ہے جو جوش ملیح آبادی سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں خواجہ عبدالرحمٰن طارق کا ایک مضمون ''دنیائے ادب کا مشفق خواجہ اور مرے حیٔ بھائی جان'' کے عنوان سے بھی شامل ہے جس میں انہوں نے مشفق خواجہ کے سوانحی حالات کو قلم بند کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جوش سے متعلق مذکورہ بالا 17 کالموں کے علاوہ ان کے نام جوش کا لکھا خط بھی موجود ہے اور کتاب کے آخر میں جوش اور خامہ بگوش کے عنوان سے مشفق خواجہ کی بیاض کا وہ حصہ بھی نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے جوش کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ یہ کتاب کل 127 صفحات پر مشتمل ہے۔

بحیثیت شاعر

مشفق خواجہ بلند پایہ طنز و مزاح نگار، شہرت یافتہ کالم نگار، معروف محقق و نقاد اور بے لاگ صحافی

ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شعر بھی ہیں۔ان کی غزلیات کا ایک مجموعہ ''ابیات'' کے نام سے 1978ء میں ایجوکیشنل پریس کراچی سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے جو 1952ء سے 1977ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔جس میں 97 چھوٹی بڑی غزلیں اور 40 متفرق اشعار ہیں اس کا دیباچہ خود مشفق خواجہ نے لکھا ہے جو ان اشعار پر مشتمل ہے۔

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل ترا آئینہ جمال بھی ہے
جو پاسکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ مرا عجز بھی ہے، یہ مرا کمال بھی ہے[1]

مشفق خواجہ کو شاعری کا ذوق ان کے گھر کے علمی و ادبی ماحول کی دین ہے۔بچپن ہی سے وہ شاعری کی طرف مائل تھے انہوں نے ''بانگ درا'' آٹھ دس سال کی عمر ہی میں پڑھ ڈالی تھی اور اپنے پسندیدہ اشعار اپنی ایک بیاض میں نقل کرلیا کرتے تھے۔انہوں نے دوران تعلیم یعنی 1951ء یا 1952ء کے آس پاس جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا شاعری کا آغاز کیا۔طاہر مسعود کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں بتایا ہے:

''میں نے 1952ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج کراچی میں داخلہ لیا تو شاعری سے دلچسپی اسی دوران پیدا ہوئی، میں نے آٹھ دس سال کی عمر میں ''بانگ درا'' پڑھ ڈالی تھی اور اپنی بیاض پر اس کے پسندیدہ اشعار نقل بھی کیے تھے۔ باقاعدہ شاعری کا سلسلہ 1952ء۔ 1952ء میں شروع ہوا''۔[2]

مشفق خواجہ کی غزلیں ابتداء میں ''رسالہ امروز'' میں شائع ہوئی تھیں بعد میں، شاہد احمد دہلوی کا ماہنامہ ''ساقی'' میں شائع ہوتی رہیں اسی طرح رفتہ رفتہ ان کا کلام اردو کے ممتاز جرائد میں شائع ہونے لگا۔انہوں

---

[1] مشفق خواجہ، دیباچہ، ابیات، ص:10

[2] ۔یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، از طاہر مسعود، ص:226

نے اپنی شاعری کے لیے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ وہ فطری شاعر تھے اور ان کا مطالعہ اور ذوق ہی ان کا رہنما بنا۔ انہوں نے کبھی مشاعروں میں بھی اپنا کلام پیش نہیں کیا، بلکہ اکثر وہ دوستوں کی نجی محفلوں میں ہی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔

مشفق خواجہ نے کبھی عمداً شعر نہیں کہا، شعر کہنے کی کیفیت ان پر خود بخود طاری ہوتی ہے خصوصاً شام کے وقت جب وہ چہل قدمی کے لمحات میں ہوتے ہیں تو خیالات ذہن میں آنے لگتے ہیں، اس بات کی وضاحت انہوں نے خود اپنے ایک انٹرویو میں کی ہے:

> ''قصہ یہ ہے کہ شعر میں اسی وقت کہتا ہوں جب طبیعت اس طرف راغب ہوتی۔ میں نے کبھی کاغذ پنسل رکھ کر عمداً شعر نہیں کہا۔ اشعار خود بخود نازل ہوتے ہیں اور یہ ان لمحوں میں ہوتے ہیں جب میں شام کے وقت چہل قدمی کے لیے جاتا ہوں''۔ [1]

مشفق خواجہ کی شاعری کا صرف ایک مجموعہ کلام ہے ''ابیات'' کے عنوان سے مکتبہ نیا دور، کراچی نے 1978ء میں شائع ہوا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ صرف ایک ہی مجموعہ کلام لکھ پائے ہیں۔ اپنی شاعری کے تعلق سے انہوں نے ہمیشہ لاپرواہی سے کام لیا اور وہ اسے اہمیت بھی نہیں دیتے۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی تجربات اور محسوسات کی ترجمان ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اسی حوالے سے وہ اپنی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ خود ایک انٹریو میں کہتے ہیں:

> ''میری رائے میں میری شاعری قابل ذکر ہی نہیں ہے اور اس کے بارے میں میری کوئی اچھی رائے نہیں ہے تاہم میرے اندر کا جو شاعر ہے، وہ مرا نہیں ہے زندہ ہے لیکن میری مصروفیات کے سبب ایسے اظہار کا راستہ نہیں ملتا، میرا جو ایک مجموعہ شائع ہوا ہے تو اعلیٰ شاعری کے معیار کے حوالے سے اس کی کوئی

---

[1] ۔ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، از طاہر مسعود، ص: 227

خاص اہمیت نہیں ہے، البتہ وہ میرے کچھ ذاتی تجربات ہیں اور محسوسات ہیں تو
بس، ان کے حوالے سے وہ مجھے پسند ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انفرادی جذبات واحساسات کی روداد بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مشفق خواجہ ایک جگہ خود شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے، کہتے ہیں:

''ہر حساس آدمی دو سطحوں پر زندگی بسر کرتا ہے ایک وہ جو نظر آتی ہے اور
دوسری وہ، جو صرف محسوس کرتا ہے، تو شاعری دراصل دوسری نظر نہ آنے والی سطح
پر بسر کی گئی زندگی کی روداد ہے''۔ [2]

مذکورہ نظریہ کی روشنی میں اگر ہم مشفق خواجہ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو شاعری کے متعلق ان کی جو رائے ہے وہ ان کی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس مجموعے میں شامل ان کی تقریباً تمام غزلیں بلاشبہ ان کے ذاتی تجربات کی روداد سناتی ہیں، ان تجربات کے دائرے میں ناکام محبت کے تجربے سے لے کر، ایک خوبصورت زندگی کے خوابوں کی شکست وریخت، اس شکست وریخت پر قریبی اور دور کے رشتہ داروں کی بے حسی اور اس بے حسی کے ردعمل کے طور پر شاعر کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھیر لینے والی تنہائی کا تجربہ سبھی کچھ شامل ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے ذاتی تجربات کی روداد کو ایسے لب و لہجے میں پیش کیا ہے جس میں سنجیدگی، متانت اور دردمندی شامل ہے۔ جس کی وجہ سے ہر پڑھنے والا شخص خود کو ان تجربات کا ہم سفر محسوس کرتا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں وقت، زندگی، زندگی کے نشیب وفراز، غم، در و دیوار تنہائی، خواب، حوصلہ امی، خواہش، عشق، محبوب کی تعریف بے وفائی جدائی، ہجر، وغیرہ نمائندہ موضوعات ہیں۔

مشفق خواجہ نے خود اپنے اک اور انٹرویو میں اپنی شاعری کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میری شاعری میں شراب کباب کا بلبل کا کوئی ذکر نہیں ہے مطلب یہ ہے

---

[1] ۔انٹرویو، فیاض اعوان، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص: 139

[2] ۔انٹرویو، امتہ الصبور/ناظمہ طالب، مشمولہ، مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ص: 47

کہ شاعروں کے ہاں جو چیزیں ملتی ہیں میری شاعری چند لفظوں کے گرد گھومتی ہے، آئینہ ہے در و دیوار ہے خواب ہے تنہائی ہے مجھے اپنی شاعری کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے میں بہت معمولی شاعر ہوں''۔ [1]

صحافت سے وابستگی

مشفق خواجہ مختلف اوقات میں مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے انہوں نے بحیثیت مدیر اپنا سفر انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہنامہ ''قومی زبان'' سے شروع کیا۔ جب وہ بی اے کے طالب علم تھے مطالعہ کی غرض سے انجمن جایا کرتے تھے اور جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وہاں ان کی ملاقات مولوی عبدالحق سے ہوئی اور مولوی عبدالحق ان کی خداداد صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں ۱۹۵۷ء کے اوائل میں انجمن کے ماہانہ جریدے ''قومی زبان'' کا اعزازی مدیر مقرر کر دیا۔ مشفق خواجہ نے مولوی صاحب کو اپنے کام سے اتنا متاثر کیا کہ کچھ ہی عرصے بعد سہ ماہی ''اردو'' کی ادارت بھی ان ہی کو سونپ دی جب مشفق خواجہ نے ۱۹۵۸ء میں ایم اے کا امتحان پاس کر لیا تو مولوی صاحب نے انہیں ''قاموس الکتب'' کا مدیر بھی مقرر کر دیا اور اس طرح ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک انجمن کی سہ ماہی رسالے ''اردو'' اور ماہنامہ قومی زبان کے مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

مشفق خواجہ نے ۱۹۸۰ء میں ''تخلیقی ادب'' کے نام سے ایک ادبی کتابی سلسلہ شروع کیا تھا جس میں ۸۵۔۱۹۸۰ء تک پانچ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ تخلیقی ادب کی مجلس ادارت میں مشفق خواجہ کے علاوہ پاشا رحمٰن اور آمنہ مشفق بھی شامل تھیں، تخلیقی ادب میں ہم عصر ادب کے جائزے اور اس کا انتخاب شامل ہے۔ یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ بعض شماروں کے دوسرے اڈیشن شائع کرنے پڑے۔ ان شماروں کا معیار انتہائی اعلیٰ اور دوسرے جرائد کے لیے قابل تقلید تھا۔

---

[1] ۔انٹرویو، امت الصبور، ناظمہ طالب، مشمولہ، مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ص:53

مشفق خواجہ ۱۹۷۰ سے ۱۹۹۷ء تک مختلف اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔ جیسے روزنامہ ''جسارت'' اور ''صداقت'' اسی طرح ہفتہ روزہ ''زندگی'' اور ''تکبیر'' وغیرہ۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق مشفق خواجہ کی تحریریں یوں تو میٹرک کے زمانے سے ہی رسالہ ''امروز'' میں شائع ہوا کرتی تھی لیکن بحیثیت کالم نگار ان کی کالم نگاری کی ابتداء روزنامہ ''جسارت'' کے اجراء کے بعد ہوئی ''جسارت'' سے پہلے ان کی تحریریں ''اخبار جہاں'' کراچی میں شائع ہوتی تھیں ان کتابوں پر ان کے شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوا کرتے تھے۔ ''جسارت'' کے مدیر الطاف حسن قریشی کی نظر سے جب یہ تبصرے گذرے تو انہوں نے مشفق خواجہ سے ''جسارت'' کے لئے لکھنے کو کہا اور اس طرح ان کی کالم نگاری کی ابتدا 15/نومبر ۱۹۷۵ء کو الطاف حسن قریشی کے اخبار روزنامہ ''جسارت'' سے شروع ہوئی۔ اس خبار میں ان کا کالم ''اندیشہ شہر'' کے عنوان سے چھپتا تھا اور اس کے لئے انہوں نے قلمی نام ''غریب شہر'' اختیار کیا تھا۔

۷۲۔۱۹۷۱ء میں مشفق خواجہ روزنامہ ''زندگی'' سے وابستہ رہے پھر ۱۹۷۴ء میں روزنامہ ''صداقت'' کراچی سے منسلک ہوگئے بعدازاں ہفتہ روزہ ''تکبیر'' میں کالم لکھنا شروع کیا۔ ''تکبیر'' میں ان کا کالم ''سخن در سخن'' کے عنوان سے چھپتا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے قلمی نام ''خامہ بگوش'' اختیار کیا تھا۔ ''تکبیر'' میں پہلا ''سخن در سخن'' ۲۳/مارچ ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بند ہوا پھر ''تکبیر'' میں ''سخن در سخن'' کا دوسرا دور ۳۱/مارچ ۱۹۹۴ء کو شروع ہوا یہ سلسلہ ۱۹۹۷ء کے اوائل تک چلتا رہا اور ۱۹۹۷ء کو اچانک مشفق خواجہ نے کالم لکھنا بند کر دیا۔

ریڈیو سے وابستگی

صحافت کے علاوہ مشفق خواجہ کی دلچسپی ریڈیو سے بھی رہی ہے، ۱۹۶۵ء میں وہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور خواجہ صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے ہی ریڈیو سے دلچسپی رہی۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں دو تین بار ریڈیو پر گراموں

میں شرکت کی لیکن اس کے بعد وہ کبھی ریڈیو اسٹیشن نہیں گئے'' [1]

مشفق خواجہ ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ء۔۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات پر فیچر لکھتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک۔ بھارت جنگ کے دوران ان کا ایک کالم ''سنا آپ نے'' کے عنوان سے روزانہ نشر ہوتا تھا۔ اسی طرح ستمبر ۱۹۷۳ء سے ریڈیو کی عالمی سرویس سے ہر جمعرات کو ان کا ایک پروگرام ''مسلمان سیاح'' کے عنوان سے ساڑھے پانچ سال تک نشر ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ دو سال تک ایک ہفتہ وار پروگرام ''دیکھتا چلا گیا'' بھی لکھتے رہے۔ غرض ریڈیو کے لیے انہوں نے تقریباً ایک ہزار اسکرپٹس لکھا ہے لیکن وہ کبھی ریڈیو اسٹیشن نہیں گئے گھر ہی سے لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ طاہر مسعود کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں مشفق خواجہ نے ریڈیو سے اپنی وابستگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا ہے:

> ''ریڈیو کے لئے میں نے تقریباً ایک ہزار اسکرپٹس لکھے ہوں گے میرا ایک ہفتہ وار پروگرام ''مسلمان سیاح'' ساڑھے پانچ سال تک نشر ہوتا رہا۔ میں نے دو سال تک ریڈیو کا مشہور پروگرام ''دیکھتا چلا گیا'' تحریر کیا ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میرا ایک کالم ''سنا آپ نے'' روزانہ نشر ہوتا تھا اسی طرح میں نے ریڈیو کے لئے بے شمار چیزیں لکھیں لیکن میں کبھی ریڈیو نہیں گیا۔ گھر سے اسکرپٹس لکھ کر بھجوا دیتا تھا۔ [2]

مختلف علمی و ادبی اداروں سے وابستگی

مشفق خواجہ اردو ادب کی ایسی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جو نام نمود اور سماجی مجلس آرائیوں سے لاپرواہ، اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اردو کے ایک مجذوب، عاشق، درویش اور صوفی کی حیثیت رکھتے تھے۔ دنیا بھر میں اردو ادب کے طالبِ علم قارئین اور محققین رہنمائی کے لیے ان سے رجوع ہوتے تھے۔

۱۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حئی بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص ۱۸۔

۲۔ طاہر مسعود، بہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۲۲۷۔

مشفق خواجہ اپنی حیات میں جن ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہے ان کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوششیں کیں۔ انجمن ''ترقی اردو پاکستان'' اور ''یادگارِ غالب'' سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ ان دونوں اداروں کو انہوں نے اپنی زندگی کے بڑے قیمتی لمحات دیے اور ان کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان سے وہ باقاعدہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک ملازمت کے سلسلہ میں وابستہ رہے لیکن ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے باوجود انجمن سے گہرے مراسم رکھتے رہے۔ اصل میں انجمن سے انہیں ایک طرح کا عشق تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرح ادارہ ''یادگارِ غالب'' سے بھی انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ چونکہ وہ غالب کے شیدائیوں میں تھے اسی لیے انہوں نے ایک غالب کے نام سے لائبریری بھی قائم کی تھی۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے مشفق خواجہ کی ان علمی و ادبی اداروں سے وابستگی اور ان کے لیے ان کی بے لوث خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> ''خواجہ صاحب نے ۱۹۷۳ء میں انجمن کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے باوجود انجمن سے گہرے مراسم استوار رکھتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ خواجہ صاحب کو بابائے اردو اور انجمن سے عشق تھا تو غلط نہ ہوگا۔ میرے خیال میں تو انجمن سے تعلق قطع کرنا ان کے بس ہی میں نہ تھا۔ اگرچہ آگے چل کر کچھ ایسا ہی قلبی تعلق غالب لائبریری سے بھی استوار ہوگیا تھا۔ مذکورہ اداروں کے علاوہ بعض دوسرے اداروں کے لیے بھی خواجہ صاحب نے بے لوث خدمات انجام دیں۔ خواجہ صاحب کی خدمات کو میں نے بے لوث اس لیے کہا کہ انہوں نے نہ تو کبھی ستائش کی تمنا کی اور نہ کبھی صلہ کی پرواہ۔ انہوں نے زندگی بھر کوئی کام ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے نہیں کیا۔ انہوں نے بعض ایسے عہدوں کو قبول کرنے سے انکار کیا جن کے حصول کے لئے سگان دینا، اہل دنیا کے تلوے چاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے''۔[1]

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص: 15۔

مذکورہ دو اداروں کے علاوہ مشفق خواجہ اپنی زندگی میں آخری وقت تک جن علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔رکن گورننگ باڈی، مقتدرہ مقامی زبان، اسلام آباد

۲۔رکن گورننگ باڈی، اقبال اکیڈیمی، لاہور

۳۔رکن گورننگ باڈی، مجلس ترقی ادب، لاہور

۴۔منصف اقبال ایوارڈ، حکومت پاکستان، ۱۹۸۱ء سے زندگی کے آخری ایام تک۔

۵۔رکن گورننگ باڈی، انجمن ترقی اردو، کراچی تا دم مرگ

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور یونیورسٹی، کے پی ایچ ڈی مقالات کے ممتحن بھی رہے۔

اعزازات

مشفق خواجہ ہمیشہ دنیاوی شہرت سے دور رہے اور انہیں نام و دولت سے کبھی دلچسپی نہیں رہی بقول طاہر مسعود کے:

> ''خواجہ صاحب کو وقتی شہرت اور نام و نمود کے حصول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں پیش کشوں کے باوجود کبھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں میں پڑھ کر وقت ہی ضائع نہیں ہوتا خود آدمی بھی ضائع ہو جاتا ہے''۔[۱]

مذکورہ اقتباس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ اپنے لئے شہرت اور نام و نمود ضروری نہیں سمجھتے تھے۔خواجہ صاحب نے اپنی حیات میں علمی و ادبی کام اتنا کیا ہے کہ ان کا ہر کام ایک اعزاز کے قابل ہے لیکن یہ انہوں نے کبھی نہیں چاہا، حکومت پاکستان کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں انہیں ''پرائڈ آف پرفارمنس'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ مشفق خواجہ کو ایک ادارے سے 10,000 روپے وظیفہ بھی مقرر کیا گیا

۱۔طاہر مسعود، مشمولہ مشفق من خواجہ من، محمد مختار عالم حق، ص ۱۸۲

تھا۔ جو ہر چھ ماہ بعد ایک ساتھ ادا کیا جاتا تھا لیکن جیسے ہی یہ رقم انہیں ملتی مرتب شدہ فہرست کے مطابق اپنے مستحق احباب میں تقسیم کر دیتے تھے اور ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر پاکستان اور ہندوستان کی مختلف لائبریریوں کو بھجوایا کرتے تھے۔

حلقہ احباب

مشفق خواجہ کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا وہ عملی زندگی میں ایک گوشہ نشین انسان تھے لیکن ان کا حلقہ احباب پوری دنیا میں وہاں تک پھیلا ہوا تھا جہاں تک اردو بولنے والے، ادب لکھنے اور کتاب پڑھنے والے رہتے تھے۔ بیرونی دنیا سے ان کے ربط و تعلق کا ایک وسیلہ ان کی خطوط نگاری تھی، مشفق خواجہ کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور دلکشی تھی کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کے چاہنے والوں میں ہر حلقے کے لوگ شامل تھے۔

مشفق خواجہ دوست احباب کے ساتھ اپنے مراسم محض رسمی یا سرسری نہیں رکھتے بلکہ ان کی دوستی محبت و خلوص سے لبریز ہوتی تھی۔ مبین مرزا اپنے ایک مضمون میں ان کے حلقہ احباب کا ذکر کرتے ہوئے احباب سے ان کے مراسم کے بارے میں لکھا ہے:

> ''عجیب بات ہے کہ زندگی کے آخری تیس بتیس برس مشفق خواجہ صاحب نے ایک کمرے اور صرف اپنی کتابوں کے ساتھ گزارے لیکن اس کے باوجود ان کا حلقہ احباب و قارئین یہاں سے وہاں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وسیع تھا اور جو لوگ حلقہ احباب میں تھے ان سے خواجہ صاحب کے مراسم محض رسمی یا سرسری نوعیت کے نہیں تھے بلکہ ان میں محبت و اخلاص کی گرمی و گرمجوشی اور تعلق کی گہرائی اور تہ داری بھی تھی۔ ان مراسم میں دوسروں کی سرگرمی بھی ضرور اہمیت کی حامل ہوگی لیکن سولہ سترہ برس کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ پرجوش تعلق خواجہ صاحب کی دل آویز اور دل دار شخصیت کا

ذاتی کرشمہ تھا۔ان سے تعلق بننے اور رسم و راہ محبت کی استواری میں وقت تو
ضرور لگتا کہ خواجہ صاحب بہ ظاہر نہ سہی لیکن بہ باطن قدرے کم آمیز آدمی تھے
لیکن اگر ایک بار دوستی کا رشتہ قائم ہو جاتا تو پھر وہ اسے نبھانے کا ہنر خوب جانتے
تھے"۔ [1]

مشفق خواجہ نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنے حلقہ احباب کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا ہے کہ:

''حلقہ احباب میرا بہت وسیع ہے۔ایک زمانے میں ہندوستان بھی جایا کرتا
تھا جب کہ پاکستان میں خاص کر لاہور جاتا ہوں لیکن اب تو وہاں بہت سے
لوگ ہی نہیں رہے۔ میں چن چن کر بزرگوں سے ملتا تھا، کراچی میں مجنوں
گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری سے ضرور ملتا تھا۔ ملنا ملانا بہت رہا ہے،
ہاں تعداد کم ہے یہ اور بات ہے''۔ [2]

مشفق خواجہ کی سلیم احمد، ابن انشاء، جمیل الدین عالی اور مشتاق احمد یوسفی سے بہت گہری دوستی تھی۔ اپنے ایک انٹرویو میں سلم احمد، ابن انشا ءاور جمیل الدین عالی سے اپنے مراسم کے بارے میں کہا ہے کہ:

''ابن انشاء سے تو بہت گہری دوستی رہی ہم نو سال تک آمنے سامنے رہے
بعد میں ہم ہر روز ٹیلیفون پر بات کرتے تھے، ہاں ان سترہ برسوں میں ملاقاتیں
البتہ سترہ بھی نہیں ہوئیں۔ سلیم احمد سے البتہ میل جول نہیں رہا۔اس کی وجہ یہ تھی
کہ میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملتا تھا جس کے ہاں مجمع لگا رہتا ہو۔ ہاں ٹیلیفون
پر اکثر بات چیت رہتی تھی، عام زندگی میں تین چار بار ہی ملاقات ہوئی ہوگی۔
عالمی صاحب سے زیادہ تر ملاقاتیں دعوتوں میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کے ہاں
دعوت ہو تو میں چلا جاتا ہوں، میرے ہاں وہ آجاتے ہیں۔'' [3]

۱۔بحوالہ مبین مرزا، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص ۹۴۔
۲۔انٹرویو فیاض عوان، مشمولہ مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص ۱۲۴۔
۳۔انٹرویو فیاض عوان، مشمولہ مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص ۱۲۴۔

مشتاق احمد یوسفی سے بھی ان کی گہری دوستی رہی ان کا بہت ادب واحترام کرتے تھے۔خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے مشتاق احمد یوسفی سے ان کے مراسم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''خواجہ صاحب کو یوسفی سے جو قلبی تعلق تھا، اس کو الفاظ کی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ یوسفی صاحب کی عدم موجودگی میں بھی ان کا ذکر بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کرتے یوسفی صاحب جب کراچی سے باہر تشریف لے جاتے، خواجہ صاحب اُکھڑے اکھڑے رہتے''۔ [1]

مذکورہ بالا مباحث سے علم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کم آمیز شخص تھے لیکن ان کی دل آویز شخصیت محبت و خلوص اور دوسروں کے تئیں جذبہ احترام رسم وراہ نے دوسروں کو ان کا گرویدہ بنالیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا۔

بیماری اور علالت

مشفق خواجہ اپنے کام میں اس قدر مگن رہتے تھے کہ اپنی صحت کی جانب بھی خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔ مشفق خواجہ دل کے مریض تھے۔انتقال سے ایک سال پہلے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا آپریشن بھی ہوا تقریباً ایک مہینہ زیر علاج رہے۔صحت جزوی طور پر بحال ہوگئی تو وہ پھر سے علمی وادبی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگے مگر چند دنوں بعد فشار خون اور ذیابیطس کا شکار ہوگئے اور ان کے گردے بھی خراب ہوگئے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا ان کی بیماری اور علالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چند سال پہلے خواجہ صاحب دل کے دورے کے ایک شدید حملے سے بمشکل صحت یاب ہوئے تھے۔اس کے چند ماہ وہ لاہور آئے اور فیلیئز میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ لاہور آتے تو عموماً فیلیئز ہی میں ٹھہرتے تھے جہاں ان سے ملاقات کے لیے ادبی، تعلیمی اور تحقیقی حلقوں کے لوگ جایا کرتے تھے۔میں بھی حاضر ہوا۔ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے قدرے بے

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، :ص،۱۶

پروائی سے کہا کہ فشارِ خون اور ذیابطیس کے علاوہ میرے گردے پچاس فیصد
تک کام کرنا چھوڑ چکے ہیں"۔ [1]

مشفق خواجہ زندہ دل شخصیت کے مالک تھے ان بیماریوں اور تکالیف کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتے تھے۔ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب بڑے حاضر جواب، زندہ دل اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے
میں نے انہیں کبھی مایوسی میں نہیں دیکھا۔لیکن عارضۂ قلب نے انہیں بہت
ڈپریس کر دیا تھا۔اپنی بیماری کے دوران انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔"میری
صحت یابی کے لیے دعا کیجئے"۔ [2]

خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق مشفق خواجہ کے عمر کے آخری دس بارہ سال انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزرے ہیں۔تنہائی، نقل مکانی کا خوف اور اپنی لائبریری منتقلی کی انہیں بڑی فکر تھی جو اس بیماری کی حالت میں منتقلی کا انتظام بآسانی نہیں ہو پا رہا تھا، چنانچہ ان کی بیماری اور علالت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب کی عمر کے آخری دس بارہ سال تو انتہائی کسمپرسی کی حالات
میں گزرے ان سالوں میں بیشتر وقت انہوں نے گھر پر تنہا گذارا۔آخری دو
ڈھائی سال انہوں نے ناصر اور عرفان کی رفاقت میں گزارا ہے۔ایک نوعمر
ملازم (عرفان) کے کوئی بالغ شخص موجود نہ تھا۔ میں نے اور دوسرے بہن
بھائیوں نے بارہا اصرار کیا کہ وہ بی بی باجی کے ہاں سی ویو منتقل ہو جائیں یا
میرے فلیٹ میں منتقل ہو جائیں جو اسی بلڈنگ کی پہلی منزل پر واقع ہے جس کی
دوسری منزل پر بی بی باجی کا فلیٹ ہے۔میری امیریکہ روانگی کے بعد یہ فلیٹ
خالی تھا۔اور میں نے انہیں یقین دہانی کرادی تھی کہ اگر میں کبھی واپس آیا تو اپنی
رہائش کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کرلوں گا اور انہیں دوبارہ نقل مکانی نہیں کرنا

---

[1] ڈاکٹر خواجہ ذکریہ، عظیم محقق عمدہ کالم نگار، مشفق من خواجہ من، ص،۳۴

[2] مشفق خواجہ چند تاثرات، ڈاکٹر طاہر مسعود، مشمولہ مشفق من خواجہ من، 181

پڑے گی۔میری اس پیشکش پر وہ بہت خوش تھے اورانہوں نے اپنے اکثر احباب سے اس کا ذکر بھی کیا تھا، لیکن وہ اپنے کتب خانہ کی منتقلی کو ایک امر محال خیال فرماتے تھے۔آخری دنوں میں بیماری کی شدت اور کتب خانہ کی بآسانی منتقلی کا بندوبست نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ اس غیر صحت مندانہ ماحول سے نہ نکل سکے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ [1]

انتقال

مشفق خواجہ کا انتقال شدید علالت کے بعد ۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء کی رات 9:30 بجے آغا خاں اسپتال، کراچی میں ہوا۔نماز جنازہ ۲۲ر فروری بعد نماز عصر رحمانیہ مسجد میں ادا کی گئی اور اس کے بعد سوسائٹی کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے انتقال سے قبل ان پر قلب کے حملے اور اس بیماری کی کیفیت کا تفصیلی بیان ان کے خادم عرفان کے حوالے سے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مشفق بھائی کے خادم عرفان کے بیان کے مطابق ۱۹ر فروری ۲۰۰۵ء کی شب ۹ر بجے کے قریب انہیں الٹی (قے) کی شکایت ہوئی اور کچھ دیر میں اوپر تلے دس سے پندرہ الٹیاں کیں۔اس وقت صرف عرفان ہی ان کے ہاں تھا۔دو الٹیاں انہیں خون کی بھی آئیں اس کے بعد انہیں پاخانے کے ساتھ خون آیا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں غسل خانے میں پڑے رہے ان کی حالت دیکھ کر عرفان نے ایمبولینس منگوائی۔ان کے گھر کی سیڑھیاں بہت تنگ ہیں اس لیے اسٹریچر اوپر نہ جا سکا، عرفان نے ایک پڑوسی کی مدد سے انہیں بمشکل نیچے اتارا۔وہ نقاہت کی وجہ سے چلنے سے قاصر تھے۔اس لیے بیشتر سیڑھیاں انہیں گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا۔رات پونے ایک بجے (۲۰ر فروری) آغا خاں اسپتال پہنچے جہاں انہیں Initial examination کے بعد داخل کر لیا گیا۔ اطلاع ملتے ہی ڈاکٹر خسرو، بی بی باجی کے ملازم الطاف کے ہمراہ آٹھ بج کر

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص:۱۴

چالیس منٹ پر اسپتال پہنچے (عرفان نے ڈاکٹر خسرو کو تقریباً پونے آٹھ بجے صبح فون پر اطلاع دی تھی) الطاف کو دیکھتے ہی پوچھا کہ تم بی جی باجی کے کو اکیلا چھوڑ کر کیوں آئے ہو۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بی بی باجی کے پاس موجود ہے (دیکھیے جانکنی کے عالم میں بھی انہیں اپنی بڑی بہن کا کس قدر خیال تھا۔) عرفان نے ڈاکٹر خسرو کو بتایا کہ مشفق خواجہ صاحب بے چینی کی وجہ سے کل رات بہت کم سو سکے۔ مشفق بھائی جان نے خود بھی تمام تفصیلات ڈاکٹر خسرو کو بتائیں اور کہا انہیں بڑی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ انہوں نے نرس کو بلایا اور سر کے نیچے تکیہ Adjust کرنے اور بستر (پلنگ) کو سر کی طرف سے اونچا کرنے کی ہدایات دیں تا کہ وہ بیٹھ سکیں، لیکن فوراً ہی بستر کو دوبارہ نیچے کرنے کے لیے کہا۔ سیدھا لیٹنے کے بعد انہوں نے خسرو سے کہا کہ انہیں بہت زیادہ گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ خسرو نے فوری طور پر ریذیڈنٹ ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر ابھی پوچھ ہی رہا تھا کہ کیا بات ہے کہ مشفق بھائی جان نے پلنگ کو دونوں طرف سے پکڑا اور جھٹکے کے ساتھ دوبارہ اُچھلے اور بے ہوش ہو گئے انہیں فوری طور پر آکسیجن لگانے کے بعد حرکت قلب بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔ دو تین منٹ کے بعد حرکت بحال ہوگئی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آئی، سی، یو، Intensive Care Unit میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر حرکت قلب میں خلل واقع ہوا۔ خسرو کے پوچھنے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ مشفق بھائی جان کی حالت تشویشناک ہے کیوں کہ بیس منٹ تک حرکت قلب میں خلل واقع ہوا اور ۲۵ منٹ کے بعد حرکت بحال ہوئی لیکن یہ نارمل نہ تھی۔ ۹ بجے شب (۲۱ر فروری) ان کی حالت انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی تقریباً آدھا گھنٹہ ڈاکٹروں نے ان کی جان بچانے کی کوشش کی، لیکن بے سود، ٹھیک ساڑھے نو بجے انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا..... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ نماز عصر کے بعد رحمانیہ مسجد طارق روڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس

کے بعد انہیں سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا۔ دنیائے ادب کا مشفق
خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان اب والدین کے قدموں میں ابدی نیند سو رہے
ہیں"۔[1]

مشفق خواجہ کے انتقال کے وقت کا تفصیلی حال جاننے کے بعد ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ان کا انتقال کس قدر تکلیف سے ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، ۲۰



مشفق خواجہ کی ابدی رہائش گاہ

(ب) شخصیت

شخصیت کسی شخص کی باطنی خصوصیات اور ظاہری رویوں کے مجموعے کا نام ہے۔ کوئی شخص اپنے چہرے قد و قامت، بول چال، رکھ رکھاؤ اور طور طریقوں سے سماجی زندگی میں دوسروں پر اپنا جو تاثر قائم کرتا ہے۔ وہی اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔ لفظ ''شخصیت'' کا انگریزی ترجمہ پرسنیلٹی (Personality) ہے اور یہ لاطینی لفظ ''پرسونا'' (Persona) سے ماخوذ ہے۔ پرسونا "Persona" کے معنی ہوتے ہیں ماسک یعنی وہ نقلی چہرہ جو رومن تہذیب کے عروج کے دور میں وہاں کے ڈراموں کے کردار اپنے چہرے پر لگایا کرتے تھے۔ چنانچہ ''لفظ ''پرسونا'' کے معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء میں یہ لفظ ظاہری خد و خال اور حرکات و سکنات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یعنی شخصیت کا خارجی پہلو جیسے رنگ و روپ، وضع قطع، چال ڈھال وغیرہ۔

شخصیت کا دوسرا پہلو باطنی خصوصیت ہے شخصیت کا خارجہ پہلو جتنا روشن اور عیاں ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا داخلی اور باطنی پہلو پے چیدہ اور پُر اسرار ہوتا ہے باطنی خصوصیت کے ذیل میں شرافت، معصومیت، بلند اخلاق، ہمدردی، مددگار، ملنساری، خلوص وغیرہ آتی ہیں۔ غرض شخصیت دراصل انسان کی داخلی و خارجی خصوصیات کے مجموعے کا نام ہے اور یہ تمام خصوصیات ماحول تعلیم و تربیت سماجی اثرات کے ذریعہ کسی انسان میں پیدا ہوتی ہیں اور کبھی ان خصوصیات میں نسلی محرکات و عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے تو کبھی شخصی طور پر یہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

بہر کیف کسی کی شخصیت کا مطالعہ ایک دلچسپ عمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پیچیدہ عمل بھی ہے۔ مشفق خواجہ کی شخصیت بھی ان خصوصیات سے مبرا نہیں ہے، مشفق خواجہ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نسلی محرکات و

عوامل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ سماجی ،تہذیبی ،سیاسی ،معاشی ،علمی وادبی ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔مشفق خواجہ نے ایک ایسے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں ان کے خاندان کے کئی بزرگوں نے ادب کواوڑھنا بچھونا بنایا تھا اوروہ ادبی دنیا میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔اس علمی وادبی ماحول میں مشفق خواجہ کی تربیت ہوئی۔ان کی ذہانت کمال کی تھی بچپن سے وہ ذہین اور با اخلاق طالب علموں میں شمار ہوتے تھے اور جب انہیں مولوی عبدالحق سے قربت حاصل ہوئی تو پھر ادب سے باضابطہ ان کا لگاؤ بڑھا۔اس طرح ان کی شخصیت کی تشکیل میں مولوی صاحب کی تربیت کو بہت بڑا دخل ہے۔ان کے علاوہ مشفق خواجہ کی ذہنی تربیت میں جن بزرگوں نے حصہ لیا ان میں شوکت سبزواری،شاہد احمد دہلوی،سید ہاشمی،فرید آبادی، جوش ملیح آبادی اور شان الحق حقی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔غرض مشفق خواجہ کی سیرت کی تشکیل میں نہ صرف ان کے خاندانی بزرگوں کا ہاتھ رہا بلکہ مذکورہ بالا ادبی ہستیوں کی صحبت کا ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا حصہ رہا۔

مشفق خواجہ گونا گوں اوصاف کے حامل،غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اورایک متحرک فعال انسان تھے ۔وہ نہ صرف ایک بلند پایہ محقق ،نامور نقاد بلکہ ایک اچھے شاعر تھے بے لاگ صحافی اور کامیاب مزاح نگار بھی تھے۔وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے۔ان کی شخصیت بڑی پہلو دار، ہمہ رنگ اور پرکشش تھی۔تاریخ ، سماجیات،لسانیات،ادبیات،سیاست اور صحافت غرض ہر موضوع پر ان کی گہری نظر تھی۔وہ انتہائی مصروفیت کے باوجود کسی بھی مسئلے پر کسی بھی موضوع پر اور کسی بھی محفل میں بالکل تروتازہ ذہن سے بات کرتے تھے۔وہ نہ صرف اپنی طرز گفتار ہی سے حاضرین پر چھا جاتے تھے بلکہ اپنی مخصوص مسکراہٹ، چہرے کی چمک،مزاحیہ واقعات کے بیان،اوراپنی جاذب شخصیت سے دوسروں کا دل موہ لیتے تھے۔وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی بات بالکل مدلل طریقے سے بیان کرتے اگر کوئی بات قابل اعتراض بھی ہوتو ایسا کہتے تھے کہ سننے والا ناراض نہ ہو،ان کی باتوں میں ظرافت کے پھول جھڑتے تھے۔وہ ادبی محفلوں میں ہو یا دوستوں کی بزم

میں ہر جگہ اپنی شگفتہ گفتگو سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔غرض مشفق خواجہ کی شخصیت میں بیک وقت کئی خوبیاں جمع تھیں۔جس کی وجہ سے جو بھی ان سے ملتا وہ ان سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

حلیہ

مشفق خواجہ کی وضع قطع کچھ اس طرح تھی، گوری رنگت مناسب جسم، پر کشش ناک نقشہ، چہرہ شاداب چمکتی ہوئی آنکھیں چہرے پر مسکراہٹ غرض مشفق خواجہ کی شخصیت میں بڑی دلکشی و جاذبیت تھی، کوئی ان سے ملتا تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔محیط اسمٰعیل اپنے ایک مضمون میں مشفق خواجہ کی وضع قطع کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سفید کرتہ پاجامہ میں ایک صحت مند شخص سامنے تھا۔پر کشش ناک نقشہ، چہرہ شاداب ، آنکھوں میں دلوں کو کھینچ لینے کی جاذبیت تاثرات میں خوش گواریت،تبسم کا اجالا موتیوں کی مالا سے زیادہ دمکتا ہوا اور کلیوں سے بڑھ کر مہکتا ہوا آواز ایسی شیریں، خلوص کی کھنک سے بھرپور شفق میں ڈوبی، سماعت کو مسحور کرتی روح و قلب کو مسرور کرتی، تعلق خاطر کو لمحہ بہ لمحہ منور کرتی، ذہنوں کے تیز و نیم تاریک گوشوں کو جگمگاتی کو لفظ کو نیا ادا نہ ہوتا (سب وہی جو لغات میں پائے جاتے ہیں) لیکن مشفق خواجہ صاحب کے لہجے میں صوتی قدرتی مٹھاس عجب لطف دیتی''۔[1]

مشفق خواجہ نے کم عمری ہی میں بلند پایہ علمی و ادبی کام انجام دیئے تھے جنہیں پڑھ کر اکثر ادبی ہستیوں کو حیرت ہوتی اور وہ کہ تصور کرتے تھے کہ یہ کوئی عمر رسیدہ شخص ہوگا۔ جب خلیق انجم پہلی بار مشفق خواجہ سے ملاقات کی غرض سے کراچی گئے تھے تو اس وقت اُن کے ذہن میں بھی مشفق خواجہ کی جو تصویر تھی وہ ایک عمر رسیدہ بزرگ کی تھی۔ چنانچہ خلیق انجم مشفق خواجہ سے اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کے وضع

---

[1] محیط اسمٰعیل روٹھ کر آپ نے اچھا نہ کیا۔مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص،۱۸۹

قطع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مئی ۱۹۷۹ء میں جب میں کراچی گیا تو ملاقات کے لیے جن بزرگوں کی فہرست بنا کر گیا تھا ان میں مشفق خواجہ صاحب کا نام بھی شامل تھا۔

کراچی پہنچے ہوئے دوسرا ہی دن ہوا تھا کہ صبح ہی صبح ایک ٹیلی فون آیا معلوم ہوا کہ مشفق خواجہ بول رہے ہیں۔رسمی دعا سلام اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے اطلاع دی کہ وہ تھوڑی دیر میں تشریف لا رہے ہیں میں نے خواجہ صاحب کا نام بزرگوں کی اس فہرست میں لکھا تھا جن سے ملاقات کے لیے مجھے خود جانا تھا۔کچھ دیر تک تکلف ہوتا رہا۔خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ وہ تشریف لا رہے ہیں اور میری یہ خواہش تھی کہ آپ میرے بزرگ ہیں اس لیے میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔لیکن ان کے بہت اصرار پر میں خاموش ہو گیا خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ ایک گھنٹے میں تشریف لائیں گے اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور میں ان کے استقبال کے لیے باہر آیا۔ایک خوب صورت تندرست ذہانت سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا انتہائی سلیقے کے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔میں سمجھا کہ ماموں جان (جن کے ہاں میرا قیام تھا) سے ملنے کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔نوجوان نے بہت شائستہ اور دھیمی آواز میں بتایا کہ وہ مشفق خواجہ ہیں! حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔مشفق خواجہ !!ہم دونوں بہت گرم جوشی سے گلے لگے۔خواجہ صاحب کے ادبی کارناموں نے میرے ذہن میں ان کی جو تصویر بنائی تھی وہ تو ساٹھ ستّر سال بزرگ کی تھی اس لیے میں نے ٹیلی فون پر انتہائی ادب اور احترام سے بات کی تھی۔یہاں معاملہ برعکس نکلا۔خواجہ صاحب عمر میں مجھ سے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔بعد میں گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ واقعی

میرے بزرگ ہیں اورانہوں نے جہاں رنگ و بو میں مجھ سے تین دن قبل
آنکھیں کھولی تھیں''۔ [1]

غرض مشفق خواجہ سے جو بھی ملتا وہ ان کی علمیت اور ادبی سمجھ بوجھ کا قائل ہو جاتا۔

معمولاتِ زندگی

مشفق خواجہ کی صبح و شام مصروفیات میں صبح دیر سے اٹھنا دس ساڑھے دس بجے تک ناشتہ کرنا اور اپنے کام میں جٹ جانا ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ایک گھنٹہ قیلولہ فرماتے اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے تحقیقی کام میں کھو جاتے رات دس ساڑھے دس بجے وہ رات کا کھانا کھاتے اور پھر نیند آنے تک تازہ آمدہ کتب و رسائل اور خطوط کا مطالعہ کرتے اور تقریباً ایک دو بجے کے قریب وہ سوتے تھے۔ اتوار کے دن کی مصروفیات کچھ اور ہوتی تھی دن کے گیارہ بجے ان کے دوست احباب ان کے ناظم آباد والے گھر میں جمع ہوتے جو بیک وقت ان کی رہائش گاہ کتب خانہ اور دارالمطالعہ تھا۔ یہ دوست احباب کی مجلس دو ڈھائی بجے تک جاری رہتی تھی۔
ڈاکٹر انور محمود خالد ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ خود بہت کم بلکہ پرہیزی کھانا کھاتے لیکن کھانے کا نفیس ہونا شرط تھی
میں نے جب بھی ان کے معمولات زندگی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے
بتایا کہ یہی میرا چلن ہے۔ ہفتے میں چھ دن ڈٹ کر کام کرتا ہوں اور اتوار کا دن
تفریح کے لیے وقف ہے۔ اس دن شام کو وہ کلفٹن چلے جاتے اور مشتاق احمد
یوسفی اور چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ رات گئے ساحل سمندر پر ہلا گلا
کرتے۔ ہاں اگر بھارت سے یا کسی یورپی ملک سے کوئی اسکالر یا بے تکلف
دوست ان سے ملنے کے لیے آجاتا تو وہ اپنے معمولات میں تبدیلی بھی کر لیتے
تھے۔ لیکن عموماً وہ اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ اپنے کاموں میں صرف کرتے۔ [2]

---

[1] خلیق انجم، ذکر خیر مشفق خواجہ، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' ۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۲
[2] مشفق خواجہ انسان، لاجواب محقق، مشمولہ، مشفق من خواجہ من۔ ص ۴۳

مشفق خواجہ کوئی امیر آدمی نہیں تھے وہ ایک معمولی سی زندگی بسر کرتے تھے۔لیکن اس بات کا انہیں کوئی ملال نہ تھا والد مرحوم کی طرف سے جو کچھ ورثے میں ملا تھا اسے انہوں نے فکسڈ ڈپازٹ کروادیا تھا اور شیرز وغیرہ بھی خریدا کرتے تھے، دوسری طرف مکتبہ اسلوب سے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی تھی اور ان کی کالم نگاری کا بھی انہیں معاوضہ ملا کرتا تھا۔ڈاکٹر محمد ذکریا ان کی مالی حالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مالی ضروریات بہت کم تھیں ۔ ہفتے میں ایک دن کالم نویسی اور سکرپٹ تحریر کرنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا ۔اس دن جتنا کام کرتے تھے اس سے کچھ مالی وسائل مہیا ہوجاتے تھے اور باقی ایام تحقیق کی پیچیدگیوں اور گتھیوں کو سلجھانے میں گزر جاتے تھے''۔ ۲

(۲۔مشفق من خواجہ من،ص،۳۵)

مشفق خواجہ اپنی زندگی میں خوددّار واقع ہوئے ہیں اپنی تمام تکلیفوں اور دکھوں پر پردہ ڈال کر زندگی گذری ہے ان کے گھر میں زندگی گذارنے کی بنیادی ضرورتیں بھی مکمل نہیں تھی۔لیکن ایسی حالات میں بھی وہ کسی سے مدد لینا نہیں چاہتے تھے۔خواجہ عبدالرحمن طارق نے ان کی گھریلو زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کے گھر میں زندگی کی وہ بنیادی، آسائشیں بھی موجود نہ تھی جو غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والوں کو بھی میسر ہوتی ہیں ۔انہیں اس بات کا قطعاً کوئی ملال نہ تھا ۔انہیں ان آسائشوں سے طبعاً رغبت نہ تھی ۔جن کی مدد ان کے اپنے وسائل میں ممکن نہ ہوتی، ان کی حاجتیں روا کرنے کے لیے اپنے صاحب حیثیت احباب سے رجوع فرماتے''۔ ۱

نفاست پسندی اور سلیقہ مندی:

مشفق خواجہ عام زندگی میں بہت نفاست پسند واقع ہوئے ہیں وہ اپنے آس پاس کے ماحول کی بے ترتیبی

۱۔خواجہ عبدالرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش،:ص،۱۶

کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔سید مرتضٰی حسین بلگرامی اپنے ایک مضمون میں ان کی نفاست پسندی کے بارے میں کہتے ہیں:

''اپنے اردگرد بے ترتیبی کو گوارا نہ کرتے تھے۔نفاست پسندی بدرجہ اتم تھی''۔[1]

مشفق خواجہ نے اپنی زندگی کے نظام کو بہت ترتیب اور سلیقہ سے بنائے رکھا تھا۔ان کا گھر ہو یا ان کا کوئی کام کسی میں بھی بے ترتیبی کا گمان نہیں ہوتا طاہر مسعود نے ان کی زندگی کے نظم وضبط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کی زندگی نظم وضبط اور سلیقہ وترتیب کی ڈوری سے بندھی ہوئی نظر آتی ہے ان کا گھر رہائش گاہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھے بھلے ادارے کی صورت اختیار کر گیا ہے''۔ [2]

مشفق خواجہ کا گھر رہائش گاہ کم اور کتب خانہ زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھی لیکن یہ کتابیں گھر میں اتنے سلیقہ مندی سے ترتیب دی گئی تھی کہ کہیں بھی پورے کتب خانہ میں بے ترتیبی کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میرزا ادیب ان کی سلیقہ مندی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

خواجہ صاحب کشمیری نسل کے موروثی حسن و وجاہت سے بہرہ مند اور خوش ذوق بھی ہیں۔ان کے ہاں جاؤ تو ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی کمرے میں زیادہ گنجائش نہیں مگر کتابوں کو انہوں نے اس طرح مختلف جگہوں پر ترتیب دیا ہے کہ بے ترتیبی کا گمان نہیں ہوتا،لگتا ہے کتابیں بلکہ حسن ترتیب کے ساتھ پہلے رکھی گئیں اور بعد میں ان کے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ [3]

---

[1] بحوالہ سید مرتضٰی حسین بلگرامی، ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء۔ص، ۳۷

[2] بحوالہ، طاہر مسعود، ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء، ص، ۱۸۷

[3] تحقیق کا مشفق، مرزا ادیب، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص، ۱۷۵

اصول پسندی

مشفق خواجہ اپنے اصول پر چلنے والے شخص تھے انہوں نے زندگی کے کسی بھی معاملے میں جانبداری سے کام نہیں لیا ان کے دوست ہو یا دشمن سبھی کے لیے یکساں ہوتے میرزا دیب نے آگے ان کی سخت اصول پسندی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''خواجہ صاحب دوستوں کے دوست ہیں بہت محبت اور تواضع کرنے والے مگر اپنے اصولوں کے بھی پکے ہیں کسی کی محبت انہیں اصول شکنی پر آمادہ نہیں کر سکتی''۔[1]

مشفق خواجہ اپنا ہر کام اخروی فائدہ کو سامنے رکھ کر کرتے تھے اگر کسی کام میں انہیں اخروی فائدہ نظر آجاتا اس کام کو پوری صلاحیتوں اور لگن کے ساتھ انجام دیتے اور اس بات کی نصیحت دوسروں کو بھی کرتے، کہتے کہ تم کوئی کام کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ اس میں اخروی فائدہ ہے یا نہیں، اس اصول پر وہ سختی سے عمل کرتے۔ چنانچہ وحید الرحمن خان ان کی شخصیت کی اس خوبی ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''خواجہ صاحب کو کسی کام میں اخروی فائدہ نظر آتا تو وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کام کو خوش اسلوبی اور تندہی کے ساتھ سرانجام دیتے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتے کہ کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں کوئی اخروی فائدہ ہے یا نہیں اگر کسی کام میں اخروی فائدہ ہو تو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے وہ خود بھی اس اصول پر زندگی بھر سختی کے ساتھ کار بند رہتے۔[2]

نرم گفتار

مشفق خواجہ کا لب ولہجہ بہت دھیما ہوتا تھا۔ وہ خوش گفتار اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ گفتگو کرتے

---

[1] تحقیق کا مشفق، مرزا ادیب، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص، ۱۷۵

[2] مشفق خواجہ کی یاد میں، وحید الرحمن خان، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص، ۷۶

تو اکثر ان میں طنز کا ہلکا نشتر ہوتا اور کبھی کبھی مزاح کی پھلجھڑی بھی ہوتی۔ لہجہ نہاتی شیرین، متاثر کن اور دھیمہ ہوتا تھا۔ زیر لب مسکرانے کے قائل تھے۔ بحث و مباحثہ سے انہیں شدید نفرت تھی ان کی شخصیت کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے لکھا ہے:

> ''کبھی انہیں کسی سے اونچی آواز سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا میں نے کبھی انہیں زمین پر اکڑا کر یا تیزی سے چلتے ہوئے نہیں دیکھا میں نے کبھی انہیں قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ دھیما لہجہ آہستہ روی اور ہونٹوں پر معصوم سی شرارت آمیز مسکراہٹ ان کی جاذب نظر شخصیت کے نمایاں اور دل پذیر پہلو تھے۔ لڑائی جھگڑا اور بحث و مباحثہ سے انہیں شدید نفرت تھی''۔[1]

مشفق خواجہ نرم گفتاری اور لہجے کی مٹھاس بہت سے لوگوں کو متاثر کرتی تھی، ان کے ایک ایک لفظ میں محبت جھلکتی تھی اکثر وہ ٹیلیفون پر جب کسی سے بات کرتے تو نہایت میٹھے انداز میں ''فرمایئے'' کہتے تھے۔ یہ لفظ اتنے پیارے انداز میں ادا کرتے تھے کہ اس میں پاسداری، باہمی احترام اور اعلیٰ اقدار کا جذبہ جھلکتا تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت کی اس خوبی کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر معین کاظمی لکھتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ کی بہت سی انفرادی صفات میں ایک نمایاں صفت یہ تھی کہ ٹیلیفون پر جو پہلا لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ اور ان کی بھرپور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے ''فرمایئے'' اس ایک لفظ میں روایات کی پاسداری، باہمی احترام اور اعلیٰ اقدار کی توانائی سب کچھ موجود ہے۔ [2]

شگفتہ مزاجی

مشفق خواجہ ایک سنجیدہ محقق اور نقاد اور ایک کامیاب تخلیق کار بھی تھے۔ لیکن روزمرہ زندگی میں حد درجہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے وہ ان ادیبوں میں سے نہیں تھے جن کی افسردہ دلی، ساری انجمن کو افسردہ کر دیتی ہے

۱۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، :ص ۱۰

۲۔ مشفق خواجہ کی یاد میں، پروفیسر معین کاظمی، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، مرتب، ص ۸۹۔

بلکہ ان کی موجودگی سے محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ نقاد اور محقق بہت سنجیدہ طبع خشک مزاج ہوتے ہیں بلکہ نکتہ چین قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ تو مردم بے زار بھی ہوتے ہیں لیکن مشفق خواجہ پایہ کے محقق اور نقاد ہونے کے باوجود انتہائی دلچسپ اور شگفتہ مزاج انسان تھے مبین مرزا نے ان کی شگفتہ مزاجی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''محققین کے بارے میں عام تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ خشک مزاج اور سنکی طبعیت کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ہم نے خواجہ صاحب کو اس کے بالکل برعکس پایا۔ وہ بے حد زندہ دل، خوش مزاج، بذلہ سنج اور شگفتہ طبعیت کے مالک تھے۔ احباب کی محفل میں ان کی جولانی طبع خوب بہار دکھاتی عام سے عام بات میں بھی وہ شوخی طبع کی گنجائش پیدا کر لیتے''۔[1]

مشفق خواجہ کی شگفتہ بیانی کا یہ عالم تھا کہ وہ سنجیدہ باتوں کو بھی شگفتہ انداز میں کہتے معمولی سے معمولی بات بھی ان کی شگفتہ بیانی کی وجہ سے غیر معمولی ہو جاتی مرزا ادیب نے عطاء الحق قاسمی کے حوالے سے ان کی شگفتہ بیانی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ایک اعلیٰ پایہ کے محقق ہونے کے باوجود مشفق خواجہ بے حد شگفتہ بیان تھے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ ان کی شگفتہ بیانی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مونث؟ تو بولے ''میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں''۔[2]

مشفق خواجہ کی شگفتہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ بات بات پر کوئی نہ کوئی فقرہ اچھال دیتے مگر اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہ جس کے خلاف وہ فقر کہا گیا ہے وہ بھی اس سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بے حد سنجیدہ

۱۔ مہربان سائے مٹتے جاتے ہیں، مبین مرزا، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۹۷۔

۲۔ عطاء الحق قاسمی، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، مشفق من خواجہ من، ص ۴۶

مصروفیات کے باوجود بھی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔میرزا دیب نے ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی خوش طبعی کا ذکر کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں ایک مرتبہ رات کو شان الحق حقی کے ہاں مشاعرہ تھا۔صدارت میرے حصے میں آئی،مشاعرہ شروع ہوگیا شاعر آتے جاتے رہے، اچانک ایک بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی '' حقی صاحب ! میرزا صاحب سے بھی سُنیے''۔ سامنے دیکھتا ہوں تو خواجہ صاحب کھڑے ہیں، میں نے معذرت کرلی مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا خواجہ صاحب ! یہ آپ کو کیا سوجھی، آپ جانتے ہیں میں شعر نہیں کہتا''۔بولے''اور آپ کو یہ کیا سوجھی کہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔آپ کو ہوش میں لانے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا ورنہ اچھا خاصہ تماشا بن جاتے''۔[1]

مشفق خواجہ نے عملی زندگی میں ایک گوشہ نشیں زندگی گذاری ہے ادبی تقریبات،مشاعروں اور ضیافتوں میں بہت کم شرکت کرتے تھے لیکن جنہیں ہو عزیز رکھتے تھے ان کی قدر کرتے اور ان کے ساتھ محفلوں میں جایا کرتے تھے۔ڈاکٹر سلیم اختر ان کی شخصیت کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ صحبت ناجنس سے الرجک تھے اسی لیے ادیبوں اور ادیبوں کے اجتماعات، ادبی تقریبات، مشاعروں اور ضیافتوں سے خود کو محفوظ رکھا لیکن جنہیں وہ دوست سمجھتے تھے۔جن سے پیار کرتے تھے یا جن کے علم، ذہانت یا شرافت کے قائل تھے اُن کے لیے جی جان سے حاضر، وہ مجلسی انسان نہ تھے لیکن جس مجلس میں ہوتے وہاں صرف وہی بولتے کہ علم کی ہنڈیا میں طنز کا بگھار لگانے میں ماہر تھے،مگر وہ طنز برائے طنز نگار نہ تھے''۔[2]

مشفق خواجہ بڑے ہمدرد انسان دوست واقع ہوئے ہیں انہوں نے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں بغض و

---

[1] مرزا ادیب، تحقیق کا مشفق، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص،۱۷۵

[2] بحوالہ سلیم اختر، ہفتہ روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی، ۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ص،۱۰

کینہ نہیں رکھا انہوں نے گوشہ نشینی کی زندگی گذاری بعض مخلص دوستوں سے نقصان بھی پہنچا لیکن وہ بدلہ لینے کے قائل نہ تھے بلکہ احسان کر کے بھول جایا کرتے تھے۔طاہر مسعود ان کی شخصیت کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب سے میرے مراسم عرصہ پچیس سال پر محیط ہیں۔اس عرصے میں میں نے انہیں قریب سے دیکھا۔ظاہر ہے وہ انسان تھے ان میں خامیاں بھی تھیں جیسے سب انسانوں میں ہوتی ہیں لیکن ان کی خوبیاں ان کی خامیوں پر حاوی تھیں۔وہ بڑے ہمدرد اور انسان دوست واقع ہوئے تھے۔بہت متواضع اور مستقل مزاج تھے۔جن لوگوں پہ انہوں نے احسانات کیے ان میں سے بعض نے انہیں نقصان بھی پہنچایا لیکن خواجہ صاحب نے اس کا انتقام نہیں لیا۔یہ ان کی بڑائی تھی۔وہ کہتے تھے مجھے کسی سے کیا لینا دینا۔میں اپنے گوشہ عافیت میں مگن ہوں''۔[1]

مشفق خواجہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی خوشی وغم دونوں میں شامل ہوتے تھے وہ کم گو آمیز تھے لیکن دوستوں کی بیماری کی خبر سنتے تو عیادت کے لیے ضرور جاتے تھے اور کبھی شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی شریک ہوتے تھے ان کی انہی خصوصیات کے بارے میں طاہر مسعود نے ایک اور جگہ لکھا ہے:

''خواجہ صاحب گھر سے مشکل ہی سے نکلتے تھے سوائے شام کی سیر کے جو ان کا معمول تھا۔لیکن کسی دوست کی بیماری کی خبر سن لیتے تو اس کی عیادت کو پہنچتے کسی کا انتقال ہو جاتا تو اس کی آخری رسومات میں لازماً شریک ہوتے۔شادی بیاہ کی تقریبات کی دعوتوں کو بھی وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔خوشی اور غمی کے موقع پر خواجہ صاحب کو ہمیشہ شریک دیکھا گیا۔ان میں ایسی انسانی خوبیاں تھیں جو ہمارے ادیبوں میں خال خال ملتی ہیں''۔[2]

---

[1] طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشمولہ مشفق من خواجہ من''۔ص،۱۸۶

[2] طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشمولہ مشفق من خواجہ من''۔ص،۱۸۳

درویشانہ صفت اور قناعت پسندی

مشفق خواجہ کی شخصیت کی ایک اہم خوبی ان کی درویشانہ صفت اور قناعت پسندی ہے۔انہوں نے پوری زندگی درویشانہ طرز پر گذاری ، دولت اور شہرت کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ان کے خاندان کے بزرگوں کے علمی وادبی سرگرمیوں کی بہت شہرت رہی ہے جیسے پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے کہ اردو کی مشہور لغت ''جامع اللغات'' کے مرتب خواجہ عبدالمجید مشفق خواجہ کے چچا تھے۔ان کے ایک اور قریبی عزیز نامور محقق خواجہ عبد الرشید تھے جو میو ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر بھی رہے۔ اقبال پر پہلی کتاب کے مصنف احمد دین سے بھی ان کی قربت تھی۔ مشہور ماہر موسیقی خواجہ خورشید انور بھی ان کے عزیزوں میں تھے غرض ان کا خاندان لاہور کے کشمیریوں کا ایک انتہائی اہم خاندان تھا لیکن انہوں نے کبھی اپنے خاندان کا حوالہ نہیں دیا، اپنے بزرگوں کے نام سے کبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ تنویر احمد علوی ان کی شخصیت کی اس درویشانہ صفت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''مشفق خواجہ ایک گوشہ نشین قسم کے آدمی ہیں اور ان کے جینے کا انداز درویشانہ ہے جیسے باہمہ و بے ہمہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے''[1]

مشفق خواجہ نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ گوشہ نشینی میں گذارا ہے طاہر مسعود نے ایک انٹرویو میں ان کی گوشہ نشینی کے بارے میں سوال کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ '' آپ ان معدوے چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی ہوئی ہے مثلاً آپ شاعر ہیں، مگر مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے ادیب اور محقق ہیں لیکن ادبی جلسوں سے دور رہتے ہیں آپ کو کبھی کسی تقریب کی صدارت کرتے نہیں دیکھا آخر اس کی وجوہات کیا ہیں مشفق خواجہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی گوشہ نشینی کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تحقیق ایک وقت طلب کام یعنی اگر ہم کسی

---

[1] تنویر علوی، مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ص، ۵۸

موضوع پر کام کر رہے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اسی کام میں مصروف رکھیں اور کوئی دوسرا کام نہ کریں یہ جلسے جلوس اور مشاعرے ہیں اس میں جانے کے بعد آدمی اپنے کام پر پوری توجہ نہیں دے سکتا۔ انجمن ترقی اردو میں سترہ سال تک روزانہ جاتا رہا لیکن ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے محسوس ہوا کہ وہاں جانے کی پابندی میرے تحقیقی کام میں مخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں بالکل گوشہ نشین ہوگیا۔ پھر یہ کہ میرا رجحان بھی ان چیزوں کی طرف نہیں ہے۔ مثلاً میں نے نشر و اشاعت کے اداروں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ ان کے لیے لکھا ضرور ہے'' [1]

مشفق خواجہ سچ میں ایک درویش صفت انسان تھے شہرت کی انہیں ذرا بھی آرزو نہ تھی۔ دنیا سے بھی انہیں خاص رغبت نہ تھی۔ بس اپنے کام میں مگن رہتے اور اپنی گوشہ نشین زندگی میں اتنے وسائل کا بندوبست کرلیا تھا جو ان کی ادبی زندگی کے لیے کافی تھا انہوں نے اپنی زندگی میں کسی طرح کی کوئی کمی محسوس نہیں کی اور نہ ہی اپنی اس زندگی سے انہیں کوئی شکایت رہی اپنی زندگی سے وہ مطمئن اور خوش تھے، ان کے بھائی خواجہ عبد الرحمن طارق لکھتے ہیں:

''وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور ہر حال میں اللہ کا شکر بجالاتے رہے شاید اسی لیے بعض احباب انہیں کراچی کا قطب کہتے تھے۔ عالی صاحب کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں ''میں اپنی فقیری و گوشہ نشینی سے اتنا مطمئن ہوں کہ اس حصار عافیت سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا'' [2]

نام و نمود سے دوری

مشفق خواجہ کو نہ تو صلے کی لالچ تھی اور نہ شہرت کی تمنا رہی۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ان تمام چیزوں

---

[1] طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص، ۲۲۷

[2] خواجہ عبد الرحمن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش ص، ۱۴

سے دور رکھا دنیا میں درویشی کے دعوے کرنے والے لوگ تو بہت ہوتے ہیں لیکن عمل کرنے والے بہت کم لیکن مشفق خواجہ کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ جو بات کہتے اس پر ضرور عمل کرتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان کی درویشی اور لاتعلقی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''درویشی اور لاتعلقی کے دعوے تو سبھی کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے اہل قلم ملیں گے جو اپنے عمل سے اپنے دعووں کی توثیق بھی کر سکتے ہیں مگر مشفق خواجہ نے بے داغ عمل سے صلہ، انعام اور شہرت کو مسترد کر دیا بہت پہلے رائٹرز گلڈ کی جانب سے ان کی ایک کتاب کو انعام ملا تو انہوں نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ میں صلہ یا انعام کے لیے نہیں لکھتا''۔ [1]

مشفق خواجہ نے اپنی حیات میں بہت سے علمی و ادبی کام انجام دئے ہیں ان کا ہر کام ایک اعزاز کا مستحق ہے لیکن انہوں نے کبھی انعام یا اعزاز کی پرواہ نہیں کی۔ اگر ان کی کسی کتاب پر کوئی علمی و ادبی ادارہ انعام دینا بھی چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا وہ شہرت اور نام و نمود پانے سے ہمیشہ کوسوں دور رہے۔ چنانچہ میرزا دیب ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طرز ہیں:

> ''وہ کتابوں پر انعامات لینا بھی پسند نہیں کرتے''۔ جائزۂ مخطوطات اردو'' ان کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ داؤد ادبی انعام کے ججوں نے، جن میں یہ بھی شامل تھا۔ متفقہ طور پر اس کتاب کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا۔ مجھے بڑی خوشی تھی کہ ان کی کتاب کو نوازا گیا۔ خط بھی لکھ دیا۔ دوسرے دن اخبار میں کیا دیکھتا ہوں کہ خواجہ صاحب نے یہ اعزاز لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے لکھا میں نے اپنی کتاب انعام کے لیے بھیجی ہی نہیں تھی۔ میں انعامات کے قائل نہیں ہوں''۔ [2]

مشفق خواجہ شہرت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے ان کا نظریہ تھا کہ انسان اپنے کام سے پہچانا جانا چاہئے نام

---

[1] سلیم اختر، مشفق خواجہ، مشمولہ، مشفق من خواجہ من محمد عالم مختار حق۔ ص ۲۲

[2] مرزا ادیب، تحقیق کا مشفق، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۱۷۶

سے نہیں اصل اہمیت کام کی ہوتی ہے۔ بحیثیت محقق کے بعد انہیں ادبی دنیا میں اپنے کالموں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی لیکن انہوں نے یہ کالم ''خامہ بگوش'' کے نام سے لکھا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے ان کی شہرت سے اجتناب کرنے کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کے کالم جو اردو دنیا میں ان کی شہرت کا سبب بنے، یہ کالم رسالے و اخبار میں بھی اور کتابی صورت میں بھی خامہ بگوش کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ بہت سے کالم نگار اس پر حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ اتنے مقبول اور معیاری کالموں کو وہ اپنے نام سے منسوب کرنا کیوں پسند نہیں کرتے۔ اصل میں خواجہ صاحب اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ جتنا اپنے آپ کو چھپاتے تھے، ان کا نام اور ان کی شخصیت اتنی ہی زیادہ ابھر کر سامنے آتی رہتی تھی۔ وہ شہرت سے جتنا دور بھاگتے تھے، شہرت اتنی ہی زیادہ ان کے تعاقب میں لگی رہتی تھی، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آدمی اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے لہٰذا اصل اہمیت کام کی ہے، نام میں کیا رکھا ہے، شیطان سے زیادہ مشہور کون ہوگا آپ کتنی ہی کوشش کر لیجیے شیطان سے زیادہ مشہور تو نہیں ہو سکتے''۔[1]

مہمان نوازی

مشفق خواجہ محقق تھے ہر وقت ہر لمحہ کسی نہ کسی تحقیقی کام میں لگے رہتے تھے اتنی مصروفیات کے باوجود اگر ان سے ملنے کوئی مہمان آجاتا، تو وہ اس مہمان کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے اور اس کی خاطر تواضع میں کسی طرح کی کمی ہونے نہیں دیتے تھے، تعطیل کے روز ان کے گھر میں مہمانوں کا ہجوم رہتا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ مشفق خواجہ کی مہمان نوازی کی ستائش ان لفظوں میں کی ہے لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب تحقیق کے آدمی تھے، محقق کے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اگر چہ بعض اوقات ہفتوں کی نظر سوزی کے بعد بھی قابل اعتماد مواد ہاتھ نہیں

---

[1] ڈاکٹر طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق۔ ص ۱۸۲

آتا۔خواجہ صاحب اپنے وقت کو تحقیق کے لیے مختص رکھتے تھے اور اس کے باوجود جب اہل قلم اور اہل علم ان کے در پر دستک دیتے تو خواجہ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انہیں لیتے، چھٹی کے روز تو ایک تانتا بندھا رہتا اور بابائے اردو کا پرانا خدمات گار جسے سب صوفی کے نام سے جانتے ہیں اور جو اب خواجہ صاحب کا ہو کے رہ گیا تھا، مہمانوں کے لیے چائے بنا بنا کر تھک جاتا لیکن مہمان خواجہ صاحب کی بذلہ سنجی اور ساتھ ہی عالمانہ گفتگو سے سیر نہ ہوتے، نہ ہی خواجہ صاحب کی پیشانی پر بل آتا''۔[1]

مشفق خواجہ کے یہاں کوئی بھی مہمان آجاتا اس کی خاطر داری اور رکھ رکھاؤ کا خوب خیال رکھتے معمولی ادیبوں و شاعر بھی ہو تو اس کی قدر افزائی اس کی حیثیت سے زیادہ ہوتی۔اگر گھر پر کسی طرح مناسب نہ ہو تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کیا کرتے۔غرض حکیم سید ظل الرحمٰن ان کی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تواضع اور رکھ رکھاؤ کا یہ حال تھا کہ ہندوستان سے جانے والے معمولی ادیبوں اور شاعروں کی ان کی حیثیت سے زیادہ قدر افزائی کرتے اور اکثر لوگوں کے لیے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لذت کام و دہن کا انتظام کرتے ایسے موقعوں پر مہمان کے ہم ذوق کراچی کی دوسری شخصیتوں کو بھی مدعو کرتے''۔[2]

مشفق خواجہ کے گھر ہر ہفتے علمی و ادبی محفل منعقد ہوتی تھی جن میں پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے ادیب اور شاعر جمع ہوتے اور وہ ان تمام ادیبوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑتے باہر سے آنے والے ادیبوں کی نہ صرف خاطر خواہ تواضح کرتے بلکہ ان کی فرمائش پر اپنا پیسہ خرچ کر کے کتابیں خرید کر دیتے تھے۔اکثر احباب جو پاکستان سے باہر ہوتے وہ بھی ان سے کتابیں منگواتے تھے اور مشفق

---

[1] رؤف پاریکھ، خواجہ ادیب نواز، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۱۴۳

[2] حکیم سید ظل الرحمٰن، مشفق خواجہ ایک نامور محقق، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی ۱۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء ص ۲۸

خواجہ بڑے شوق سے انہیں کتابیں فراہم کرتے تھے، بقول طاہر مسعود کہ:

''وہ بڑے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ دلی یا لاہور یا کسی شہر سے کوئی بھی مہمان آتا وہ کلفٹن والے گھر میں یا پنک پینتھر ریسٹورنٹ میں اس کی شاندار دعوت کرتے اور شہر کے منتخب ادیبوں کو جمع کر لیتے۔ وہ ان ادیبوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ کوئی ہندوستانی ادیب کتابیں خریدنا چاہتا تو وہ اپنی جیب سے اسے کتابیں خرید کر فراہم کرتے۔ اس پیشکش کا بعض ادیب ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیتے اور کثرت سے کتابوں کی فرمائش کر ڈالتے۔ یا ہندوستان سے کسی ادیب کی کسی کتاب کے لیے درخواست آجاتی تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے۔ ان باتوں پہ وہ بے دریغ رقم خرچ کیا کرتے تھے''۔[1]

خلوص و محبت:

مشفق خواجہ کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بے حد مخلص و محبت کرنے والے واقع ہوئے ہیں، در اصل ان کی شخصیت مہر و محبت، لطف و کرم اور صدق و صفا کا پیکر مجسم تھی اپنے سے چھوٹوں سے ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش آتے ہم عمر لوگوں سے رکھ رکھاؤ سے ملتے، یہی وجہ تھی کہ ان کے عزیز و اقارب اور دوست احباب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

''چھوٹوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے ہم عمروں سے بھی بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خاندان کا ہر فرد ان سے محبت کرتا تھا۔ (اپنے تو اپنے ہیں، میں نے غیروں کو ان کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا ہے)۔[2]

مشفق خواجہ اپنے ہو یا پرائے سبھی کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے کسی کے لیے بھی ہو ان کی محبت و

---

[1] طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص، ۱۸۴

[2] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حئی بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص، ۱۰

شفقت میں کمی نہیں ہوتی۔ جس کسی سے وہ پہلی بار ملتے تو اس سے اتنی اپنائیت اور محبت سے ملتے جیسے اس شخص کو وہ برسوں سے جانتے ہوں۔ ہاشمی محمد بن قاسم ان کی شفقت و محبت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گذشتہ ۲۰ برسوں میں یہ ہماری ان سے صرف دوسری ہی مختصر ملاقات تھی۔ مگر ان کی شفقت اور اپنائیت کچھ اس قسم کی ہوتی کہ ایسا لگتا کہ وہ آپ کو اور آپ ان کو ایک طویل عرصہ سے جانتے ہیں۔ ان کی اس جیسی عمدہ انسانی اخلاقی صرف ان لوگوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ جو اپنی بڑائی اور علمی مقام کی اونچائی کے باوجود اپنے ملنے والوں کو کم تر نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں''۔[1]

مشفق خواجہ کی علم دوستی، علم پروری اور بندہ نوازی بے مثال تھی۔ بے شمار نوجوانوں ادیبوں کو ان کی نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا ہے ان کے نیاز مندوں میں کراچی شہر کے بے شمار ادیبوں کے علاوہ ہندوستان، اور پاکستان اردو دنیا کے کئی ممالک کے لوگ شامل ہیں۔ وحید الرحمٰن خان نے ان کی نیاز مندی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ان کی علم دوستی، علم پروری اور بندہ نوازی بے مثال تھی۔ وہ شفیق بھی تھے اور مرد خلیق بھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نیاز مندوں میں بے شمار نوجوان ادیب بھی شامل ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ''نیاز مندان مشفق'' کا ایک کافی بڑا حلقہ تشکیل پا گیا تھا اور اس حلقے کے افراد صرف کراچی شہر میں نہیں تھے بلکہ طول و عرض میں موجود ہیں''۔[2]

مشفق خواجہ علمی دنیا کی اتنی بڑی شخصیت تھی کہ ان کے بڑے سے بڑے کاموں سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہی عظمت نظر آتی تھی۔ ان کی محبت بھری شخصیت کی وجہ سے چھوٹے بڑے غرض ہر طرح کے لوگوں کی نظر میں وہ بے مثل انسان تھے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ان کی عظمت بیان کرتے ہوئے انہیں

---

[1] ہاشمی محمد بن قاسم، مشفق خواجہ: اردو ادب کا ایک زندہ دل درویش، اردو داستان ڈاٹ کوم، ص: ۳۔

[2] وحید الرحمٰن خان، ایک مشفق خواجہ کی یاد میں، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص، ۷۹۔

بے مثل انسان قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''مثل مشہور ہے کہ بڑے آدمی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی اس کی عظمت ثابت کر دیتی ہیں مشفق خواجہ بھی اپنے رکھ رکھاؤ محبت بھرے انداز اور ٹھہرے ہوئے، لہجے کے ساتھ بے مثل انسان تھے''۔ [1]

مشفق خواجہ کی ذات میں شفقت کا عنصر بہت زیادہ تھا وہ کسی سے گفتگو کرتے تو ان کے لہجے سے شفقت ٹپکتی تھی، وہ شائستگی اور شرافت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی مشفق خواجہ کی شخصیت کو اسم با مسمیٰ کہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آج ۲۳/فروری ۲۰۰۵ء کو اخبار سے یہ دل خراش خبر ملی کہ ۲۱/۲۲/فروری کی درمیانی شب میں (غالباً) رحلت خواجہ ہوئی تو تڑپ کیا۔ کیسی شفیق اور مشفق ذات تھی۔ اسم با مسمیٰ جب بھی ملاقات ہوتی، گفتگو کا لہجہ اور انداز تکلم نرم، الفاظ کو پرکشش ہی پاتا۔ فون پر بات کی اس میں بھی حلاوت کو دخل رہتا تھا۔ شائستگی اور شرافت۔ مزاج میں تندی ہوگی۔ مگر ظاہرہ نہیں معلومات سے پر مگر گفتگو میں خود اعتمادی کے سوا ظاہر داری کا شائبہ نہ ہوتا۔ ہجو ملیح کی بات بھی ہوتی تو شرافت کو ملحوظ رکھتے۔ تمکنت کو دخل رہتا۔ اختلاف رائے میں بھی احترام شخص کا عنصر ان کی تحریروں سے ہویدا ہے۔ [2]

ہمدردی و مہربانی:

مشفق خواجہ بہت مخلص و مددگار واقع ہوئے ہیں سہی معنون میں وہ ادیبوں، شاعروں اور محققوں کے سرپرست تھے۔ انہوں نے بے شمار ضرورت مند ادیبوں کی مدد کی۔ ان کے لئے مختلف اداروں سے وظیفے جاری کروائے۔ اور بعض ادیبوں کی مدد وہ خود اپنی جیب سے کرتے تھے یہ سب کچھ وہ پس پردہ کرتے۔ مبین

۱۔ ہارون الرشید تبسم، مشفق خواجہ علم و ادب کے خزانہ تھے، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص ۱۱۲۔

۲۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۔

مرزا نے ان کی شخصیت کی اس خوبی کو یوں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

''ہم نے دیکھا کہ اکادمی ادبیات یا بی سی سی آئی سے وظیفہ لگوانے، امداد دلوانے یا علاج معالجے کا بندوبست کرانے میں خواجہ صاحب نے اپنے ایسے لوگوں کے لیے بھی کبھی کوتاہی نہیں کی۔ خاص بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے انہوں نے جب بھی کچھ کیا، پس پردہ رہ کر کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی ایک آدھ واقعہ نہیں ہے، کئی ایک کے ساتھ ان کا یہ معاملہ رہا''۔ [1]

مشفق خواجہ اکثر لوگوں کی امداد اس طرح کرتے جیسے ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے کو خبر نہ ہوتی ڈاکٹر رؤف پاریکھ بھی ان کی شخصیت کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں ادیب نواز کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ صحیح معنوں میں خواجہ ادیب نواز تھے، ان کے گھر پر ہر ہفتے جمنے والی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور دوستوں کی محفل اس کا ادنیٰ سا ثبوت ہے۔ اکادمی ادبیات کی جانب سے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی مالی امداد ان کے کہنے پر کی گئی۔ کتنے ہی اہل قلم کے علاج معالج اور موت کے بعد کے لواحقین کے لئے رقم کی فراہمی میں مشفق خواجہ صاحب نے نہایت اہم کردار ادا کیا لیکن انہوں نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی''۔ [2]

مشفق خواجہ کا گھر ہمیشہ ادیبوں شاعروں اور طالب علموں سے بھرا ہوتا تھا، کوئی بھی پریشان حال ان کے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا یوں تو مشفق خواجہ کے مالی وسائل بہت محدود تھے۔ ایسے میں بھی وہ ادیبوں اور شاعروں بلکہ مرحومین کے اہل خاندان کی مالی مدد کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے چنانچہ خواجہ عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

''میں نے زندگی بھر کسی علمی و ادبی سائل کو ان کے در سے خالی ہاتھ لوٹتے

---

[1] مبین مرزا، مہربان سائے مٹتے جاتے ہیں، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۹۷۔

[2] رؤف پاریکھ، خواجہ ادیب نواز، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۱۴۲۔

نہیں دیکھا۔انتہائی محدود مالی وسائل کے باوجود، وہ نہ صرف بہت سے معذور اور بیمار ادیبوں اور شاعروں کی مالی مدد فرماتے بلکہ مرحومین کی بیواؤں اور بچوں کی مالی اعانت سے بھی سے دریغ نہ فرماتے ۔ان معاملات کے دو چار نہیں ، سینکڑوں دستاویزی ثبوت میری فائلوں میں موجود ہیں ۔یہ سب کچھ وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کرتے تھے''۔ [1]

غرض مشفق خواجہ بیماروں اور محتاجوں کی مدد کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ غریب اور بے روزگار ادیبوں کی مدد میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔مختلف علمی و ادبی اداروں سے ان کو امداد فراہم کرنے کے علاوہ اپنے محدود مالی وسائل سے بھی ان لوگوں کی مدد کرتے تھے۔مشفق خواجہ کو ایک ادارے سے 10,000 روپے ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔وظیفہ لے کر وہ اپنے مستحق احباب میں تقسیم کر دیتے تھے اور ہزاروں روپیوں کی کتابیں خرید کر ضرورتمندوں اور مختلف کتب خانوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔خواجہ عبدالرحمٰن طارق فرماتے ہیں:

''ایک ادارے نے خواجہ صاحب مرحوم کا 10,000 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا جو ہر چھ ماہ بعد یکمشت ادا کیا جاتا تھا، یہ رقم ملتے ہی خواجہ صاحب پہلے سے مرتب شدہ فہرست کے مطابق، اپنے مستحق احباب میں تقسیم فرما دیتے تھے۔جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خواجہ صاحب کے وسائل بہت محدود تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے، اس کے باوجود ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر ہندوستان کی لائبریریوں کو بھیجواتے اور اس عمل کو ثواب جاریہ سمجھتے تھے''۔ [2]

مشفق خواجہ نے ایک ایسے معاشرے میں اپنی زندگی کو حصول علم اور فروغ علم کے لیے وقف کر دیا جہاں ہر طرف مادہ پرستی کا غلبہ تھا۔لوگوں نے زندگی کا مقصد محض اب روپیہ جمع کرنا اور اس میں اضافہ کرنا بنا رکھا تھا۔ مشفق خواجہ نے اپنی تمام عمر میں اس طرز زندگی سے گریز کیا ان کی نظر میں حصول علم اور دوسروں کی علمی امداد

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، :ص 15۔

[2] خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، :ص ۲۶۔

ہی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ حصولِ علم اور فروغ علم کے لیے ان کے گھر کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوتے تھے۔ چنانچہ سجاد میر لکھتے ہیں:

''ایک بات اور عرض کروں کہ خواجہ صاحب تحقیق کے ایسے آدمی تھے کہ دور دور تک ان جیسا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جانے کتنے لوگوں کی تحقیقات خواجہ صاحب کی مرہون منت ہیں۔ ان کے دروازے سب کے لئے کھلے تھے اور فیض بھی سب کے لیے عام تھا''۔ [1]

مشفق خواجہ نہ صرف ضرورت مندوں کی مدد کیا کرتے بلکہ باصلاحیت افراد کی وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور ان کے علمی و ادبی کام کے لئے روپیہ پیسے کے علاوہ اور دیگر ضروریات کی مدد بھی فراہم کرتے ان کے علمی و ادبی کاموں میں ایک مشفق استاد کی طرح ان کی رہنمائی بھی کرتے تھے اور پھر ان کی رہنمائی سے کئی ایسے باصلاحیت ادیبوں نے بہت سے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کام انجام دیئے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر مسعود انہیں بہت بڑا مردم شناس قرار دیتے ہیں، ادیبوں، شاعروں اور محققوں پر ان کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''وہ ادیبوں، شاعروں اور محققوں کے صحیح معنوں میں سرپرست تھے۔ انہوں نے بے شمار ضرورت مند ادیبوں کی مدد کی۔ مختلف اداروں سے ان کے لئے وظیفے لگوائے اور ان میں سے بعض کی تو انہوں نے اپنی جیب سے مدد کی ان کے احسانات کا دائرہ ایک اور معنوں میں یوں بھی وسیع ہے کہ انہوں نے بہت سے ادیبوں اور محققوں کو بہ صد اصرار ادبی اور تحقیقی کام کی جانب راغب کیا۔ کسی سے خاکے لکھوئے، کسی سے کوئی کتاب مرتب کرائی، کسی سے خودنوشت لکھوائی۔ وہ بڑے مردشناس تھے۔ اور خوب پہچانتے تھے کہ کس ادیب یا محقق سے کیا کام لیا جا سکتا ہے وہ نہ صرف ادیبوں کو اسائنمنٹ دیتے تھے بلکہ ایک مشفق استاد کی

۱۔ سجاد میر، ہمارے خواجہ صاحب، مشفق من خواجہ من، ص ۴۰۔

طرح ہر طرح اس کی معاونت اور رہنمائی بھی کرتے تھے''۔ ۱

مشفق خواجہ باصلاحیت اور قابل لوگوں کی تعریف کشادہ دل سے کرتے تھے کسی ادیب کا کوئی اہم کارنامہ نظر آتا تو اس کی خوب تعریف کرتے ،اس کی محنت کو سراہاتے اور اس کی خوب حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ممتاز احمد خان ایک قصہ کے حوالے سے ان کی کشادہ دلی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''مشفق خواجہ عظیم انسانی خصوصیات کے حامل آدمی تھے، وہ لوگوں سے ملتے تو خوشگوار تاثر چھوڑتے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرورت کرتے کہ ملاقاتی اسے یاد رکھنے پر مجبور ہوتا۔ وہ تعریف کرنے میں کشادہ دل تھے، مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دوست جو فکشن کے انداز میں ایک ڈائجسٹ میں معروف و قابل ذکر شخصیات پر مضامین تحریر کر رہے تھے۔ان سے پہلی ملاقات پر اس کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ ان کے پاس پورا سیریز موجود ہے۔اس طرح وہ جس ادیب وشاعر اور نقاد میں تخلیقی چنگاری دیکھتے اس کی حوصلہ افزائی کرتے''۔ ۲

مشفق خواجہ نے مسلسل مطالعے اور محنت سے وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ اردو ادب کا خواہ کوئی موضوع ہو، تحقیق کرنے والا طالب علم ان سے ضرور مدد حاصل کرتا تھا اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان کی مدد کرتے تھے ان کی مدد کی بنا پر پی ایچ ڈی کرنے والے بیشتر طالب علم ڈگری حاصل کر پائے تھے۔ پاکستان سے باہر رہنے والے کسی ریسرچ اسکالر کو پاکستانی کتاب یا مضمون کی ضرورت ہوتی تو وہ مطلوبہ مواد کو اپنے خرچ پر بھیج دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''جب کبھی کسی ریسرچ اسکالر کو کسی پاکستانی کتاب یا مضمون کی ضرورت ہوتی تو میں مشفق خواجہ کو زحمت دیتا۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے معذرت کی

۱۔طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص ۱۸۳۔

۲۔ممتاز احمد خان، مشفق خواجہ نگینہ شخص رخصت ہوا، مشمولہ، سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو ادب ہند، دہلی، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء ص ۴۹۔

ہو، ہمیشہ مطلوبہ مواد بھیجنے میں عجلت کی''۔ ۱

مشفق خواجہ تحقیق کرنے والوں کی مدد کرنے کے معاملے میں بڑے دریا دل تھے کوئی ریسرچ اسکالران کے یہاں آتا اس کی بھرپور مدد فرماتے اور ساتھ ہی پر تکلف طعام کا بھی انتظام کرتے کبھی کبھی باہر سے آنے والے کسی طالب علم کے قیام کا انتظام بھی کر دیتے تھے۔عرفان احمد خان ان کی شخصیت کی اس خوبی کو سراہاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''انہوں نے بے شمار طالب علموں کو اعلیٰ سطح کے مقالے تیار کروانے میں ہر طرح کی مدد کی وہ ایسے طالب علموں کو قیام وطعام کی سہولت تک فراہم کرتے تھے اور طالب علم کی صلاحیت اور جذبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تحقیقی کام میں معاونت کرتے تھے''۔ ۲

غرض مشفق خواجہ سینکڑوں طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کی تحقیق کے میدان میں رہنمائی کی اور کتابیں بھی فراہم کیں۔انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے سبھی اعلیٰ ناشرین کو یہ ہدایت دی تھی کہ جب بھی نئی کتاب شائع ہو۔انہیں وی پی پی سے بھیج دی جائے۔اس کے علاوہ کئی ادبی رسائل مشفق خواجہ کے یہاں آیا کرتے تھے اور ان تمام کتابوں رسائلوں سے طالب علم استفادہ کیا کرتے تھے۔چنانچہ انہوں نے تشنگانِ علم کی مدد کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ڈاکٹر انور سدید کی رائے اس سلسلے میں بڑی درست معلوم ہوتی ہے:

''علمی ادبی اور تحقیقی کاموں میں علمی معاونت مشفق خواجہ کے لئے اہم ترین فرض کی حیثیت رکھتا تھا۔ان کے گھر پر تشنگان علم کا ہجوم رہتا تھا اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کا مواد جہاں سے بھی دستیاب ہوتا، تلاش کر کے فراہم کر دیتے تھے''۔ ۳

۱۔بحوالہ، ڈاکٹر مظفر حنفی، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء ص ۳۵۔

۲۔ عرفان احمد خان، آدھا کراچی، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۷۷۔

۳۔انور سدید، مشفق خواجہ خطوط کے آئینے میں، مشمولہ مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، ص ۵۴۔

بے لوث خدمت گذار

کچھ لوگ اس قدر ذہین، خوش طبع، شگفتہ مزاج اور پر خلوص ہوتے ہیں کہ ان سے بات کر کے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ مشفق خواجہ کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ مشفق خواجہ جس بے غرضی اور خلوص سے دوسروں کی علمی مدد کرتے تھے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ پوری اردو دنیا سے جو کوئی ان سے کسی نادر کتاب یا کوئی اہم مواد کے حصول کے لئے درخواست کرتا وہ بلا کسی تکلف کے اس کی درخواست فوراً قبول کرتے اور مطلوبہ مواد کی فوٹو کاپی کرا کے اپنے خرچ پر روانہ کر دیتے تھے۔ یقیناً اس طرح کی علمی امداد کی مثالیں ہمارے معاشرے میں بہت کم ملیں گی۔ ان کے اس جذبہ میں نہ کسی صلے کی تمنا ہوتی اور نہ کسی قسم کا کوئی لالچ وہ ہر ایک کی مدد بے غرض ہو کر کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر ان کی شخصیت کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عام تاثر کے برعکس وہ بے حد محبت کرنے والے اور دوسروں کے دکھ درد میں شرکت کرنے والے اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے انسان تھے اور اس پر مستزاد یہ نہ صلے کا لالچ اور نہ شہرت کی تمنا درویشی اور لاتعلقی کے دعوے تو سبھی کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے اہل قلم ملیں گے جو اپنے عمل سے اپنے دعوؤں کی توثیق بھی کر سکتے ہوں مگر مشفق خواجہ نے بے داغ عمل سے صلہ انعام اور شہرت مسترد کر دیا''۔ [1]

ہمارے معاشرے میں ایسی بے لوث خدمات گذار شخصیتیں موجود ہیں جو ہمیشہ نام و نمود سے دور رہی ہیں لیکن ایسی شخصیتوں میں بھی مشفق خواجہ کی شخصیت انفرادی حیثیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی اس عظمت اور بڑائی کے ہمیشہ معترف رہے ہیں۔ ممتاز احمد خان ان کی اس انفرادیت کو ستائش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''وہ عظیم المرتب حیثیت کے مالک اس لیے بھی بنے کہ شہرت اور نام و نمود

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ذکر خیر مشفق خواجہ کا، ہفتہ روزہ ہماری زبان، نئی دہلی، ۸ تا ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۔

سے دور رہے۔ بہت سے لوگ شہرت سے دور رہتے ہیں اور بہت قابل ذکر کام
کر جاتے ہیں، مگر ان کی بھی محدودیت ہوتی ہے''۔ [1]

اسی طرح ہاشمی سید محمد بن قاسم نے بھی مشفق خواجہ کی بے لوث شخصیت کو سراہتے ہوئے ''ان کی شخصیت اور کارناموں کی تفہیم کو اردو ادب کا حیرت ناک گوشہ'' کہا ہے لکھتے ہیں:

''ادبی دنیا میں یہ ایک ازلی بحث ہے کہ ایک مصلح معاشرہ ہوتا ہے یا ایک
پیشہ ور قلم کار یا پھر ایک ذاتی نام ونمود کا خواہش مند ایک ادنیٰ سا انسان۔ اردو
ادبی منظر نامہ میں خاصے ایسے نام نظر آتے ہیں، جو اپنے ہم عصروں میں اپنے
علاوہ کسی کو سب زیادہ ممتاز شخصیت نہیں سمجھتے اور ان میں سے چند عصری ادبی
چپلقشوں کا کھلے عام شکار بھی نظر آتے ہیں۔ اس پس منظر میں جناب مشفق خو
اجہ کی شخصیت اور کارناموں کی تفہیم اردو ادب کے ایک حیرت ناک گوشہ کو بے
نقاب کرتی ہے''۔ [2]

مذکورہ بالا مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ ایک ہمدرد، ملنسار مہمان نواز مخلص ومحبت کرنے والے انسان ہی نہیں تھے بلکہ وہ خوددار، قناعت پسند اور ادب کے بے لوث خدمت گذار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی شہرت ونام ونمود کی پرواہ نہیں کی اور بغیر کسی صلے کے ادب کے خاموش خدمت گذار کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اپنی تمام دولت علم وادبی کاموں کے خرچ کی۔ خلوص ومحبت، انسانی ہمدردی، خودداری و قناعت پسندی اور بے غرضی و بے لوثی ایسے انسانی جذبات ہیں جس سے انسان کی شریف النفسی ظاہر ہوتی ہے مشفق خواجہ بے شک ایک شریف اور نیک سیرت شخصیت کے مالک تھے۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ ایک فرماں بردار اور ذمہ دار بھائی، وفادار شوہر اور مجسی ہمدرد دوست بھی واقع ہوئے۔

---

[1] ممتاز احمد خان، مشفق خواجہ نگینہ شخص رخصت ہوا، ''سہ ماہی'' اردو ادب انجمن ترقی اردو ادب ہند، دہلی جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص:۴۹

[2] ہاشمی محمد بن قاسم، مشفق خواجہ: اردو ادب کا ایک زندہ دل درویش، اردو داستان ڈاٹ کوم، ص:۳۔

بحیثیت اولاد

بحیثیت اولاد مشفق خواجہ ایک فرمابردار اور ذمہ دار بیٹے واقع ہوئے تھے جب تک ان کے والدین حیات تھے وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد بھی وہ ان کا ذکر ادب واحترام سے کیا کرتے تھے۔ مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

> ''بزرگوں کا بے انتہا احترام کرتے۔ والدین کا ذکر بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کرتے (جس کرسی پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے، اس کے دائیں جانب رکھی لوہے کی ایک الماری میں والدہ مرحومہ کا ایک کپڑوں کا جوڑا رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر اور چھو کر کام کا آغاز کرتے، مہینے میں کم سے کم ایک بار ضرور والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتے)''۔[1]

بحیثیت بھائی

مشفق خواجہ ایک سعادت مند فرزند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری بھائی بھی تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کا خاص خیال رکھتے، اپنے بھائیوں کے ساتھ شفیق باپ کی طرح پیش آتے تھے، ان کی اس خوبی کو بیان کرتے ہوئے خواجہ عبدالرحمٰن طارق فرماتے ہیں:

> ''اگر چہ خواجہ صاحب عمر میں مجھ سے صرف تین سال بڑے تھے لیکن مجھ سے ان کا تعلق ایک شفیق باپ کی طرح تھا۔ مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے قدم قدم پر میری رہنمائی فرماتے۔ مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے زندگی بھر کبھی میری کسی بات یا فرمائش کو رد کیا گیا ہو''۔[2]

بحیثیت شوہر:

مشفق خواجہ ایک اچھے بیٹے، بھائی، ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وفادار اور مہربان رفیق حیات بھی تھے وہ

۱۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص:۱۵

۲۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش، ص:۱۲

شریک حیات کا بے حد خیال رکھتے تھے اپنی بے شمار علمی و تحقیقی مصروفیات کے باوجود اپنی شریک حیات کے لیے وقت نکالتے تھے۔ آمنہ مشفق اپنے ایک انٹرویو میں مشفق خواجہ کے بارے کہتی ہیں:

''بحیثیت ادیب تو نہیں کہہ سکتی، ہاں بحیثیت شوہر میرے شوہر بہت اچھے ہیں''۔[1]

بحیثیت والد

مشفق خواجہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن اپنے بھائیوں کے بچوں سے بے حد محبت وشفقت سے پیش آتے خواجہ عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

''عذرا اور میرے بچوں سے بے انتہا پیار اور شفقت کا اظہار فرماتے میرا سب سے چھوٹا بیٹا، ڈاکٹر خسرو، ان کا سب سے چہیتا بچہ تھا''۔[2]

مشفق خواجہ بحیثیت دادا اپنے بھائیوں کے پوتے پوتیوں سے بھی بے حد محبت وشفقت فرماتے تھے چنانچہ مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق رقم طراز ہیں:

''خواجہ صاحب میری پوتی حبہ (میرے بیٹے خرم کی بیٹی) سے بھی بے انتہا لاڈ اور پیار کرتے تھے۔ جب بھی تشریف لاتے بی بی باجی کے ہاں دوسری منزل پر جانے سے پہلے میرا دروازہ کھٹکھٹا کر آواز لگاتے حبہ اور خسرو کو اوپر بھیج دو''۔[3]

ان باتوں سے علم ہوتا ہے کہ وہ بچوں سے کس قدر محبت کرتے تھے۔

بحیثیت دوست

بحیثیت دوست مشفق خواجہ بہت مددگار اور ہمدرد دوست واقع ہوئے ہیں بڑے بردوبار طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے دوست واحباب کی ہمیشہ خبر رکھتے تھے وقتاً فوقتاً ان کی خیریت دریافت کرتے اپنے دوستوں کی

۱۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش،: ص ۴۰

۲۔۳ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، مشفق خواجہ اور میرے حیٔ بھائی جان، جوش اور خامہ بگوش،: ص ۱۲

صحت مندی کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتے تھے اور جب کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے حاضر رہتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید ان کے مخلوص دوستی کے دوستوں کے تئیں جذبۂ خلوص کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ اپنے دوستوں کی خیریت اور صحت مندی کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ دوست کی علالت کی خبر ملتی تو تشویش میں مبتلا ہوتے اور پھر ان کی عیادت میں تاخیر نہ کرتے''۔[1]

مشفق خواجہ نے کبھی کسی دوست کی دل آزاری نہیں کی، اگر وہ کسی کو پسند بھی نہ کرتے ہوں تو اس کا ذکر بھی مخلصانہ انداز میں کرتے۔ انور محمد خالد ان کی شخصیت کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ کی سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دل آزاری سے کوسوں دور تھے۔ جو لوگ انہیں پسند نہیں تھے، وہ ان کا ذکر بھی تحقیر آمیز پیرائے میں نہیں کرتے تھے، اسی طرح وہ دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر کبھی چلانے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی وہ کسی کو چشم و ابرو کار کا اشارہ کر کے کسی دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا شہکارہ دیتے تھے''۔[2]

مشفق خواجہ اپنے دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ جب کوئی دوست ان سے کسی طرح کی فرمائش کرتا فوراً اس کی تکمیل کر دیتے تھے یوسف ناظم نے ان کے اس پر خلوص جذبہ کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> ''جس کسی دوست نے ان سے کوئی فرمائش کی اس کی تکمیل میں ان سے کوئی فروگزاشت نہیں ہوتی۔ ان کے ظرف، ان کی بردباری اور ان کی بے ریا دوست داری کے احاطہ کرنے سے میں قاصر ہوں اپنے عجز بیانی کی وجہ سے جو مشفق خواجہ کے مزاج اور خمیر میں تھا۔ وہ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے اور ہندوستان میں بھی شاید ان کے دوستوں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی کہ پاکستان کے دوستوں

---

[1] انور سدید، مشفق خواجہ خطوط کے آئینہ میں، مشفق من خواجہ من، ص ۵۵۔

[2] انور محمد خالد، مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں، مشفق من خواجہ من، ص ۴۷

کی تھی۔ [1]

مشفق خواجہ اپنے ہر دوست کے ذوق سے مکمل آگاہ تھے کہیں کوئی کتاب اپنے کسی دوست کے مذاق کی ہوتی تو اس کو فوراً حاصل کر کے اپنے دوست کو بھیج دیتے تھے اور یہ کام وہ بڑی خوش دلی سے انجام دیتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے:

> ''وہ اپنے ہر دوست کے ذوق نظر کے جہت آشنا تھے۔ اور ان کی نظر سے اپنے دوست کے مطلب کی کتاب گزرتی تو اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے خریدتے اور بھجوا دیتے''۔ [2]

مشفق خواجہ کی شخصیت کے بارے میں مختلف ادیبوں اور دانشوروں کے تاثرات

مشفق خواجہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ایک اچھے انسان ایک اچھے دوست بلند پایہ محقق ایک اچھے شاعر، بے باک صحافی، منفرد کالم نویس، صاحب طرز طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں اور اردو دنیا کا ہر ادیب و دانشور ان کی شخصیت کی بے شمار خوبیوں کا معترف ہے، چنانچہ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی نے ان کی علمی فیاضی اور دریا دلی کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> ''جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ صاحب مرحوم انتھک کام کرنے اور خاموش کام کرنے والے شخص تھے۔ یہی ان کی سب سے اہم خصوصیت تھی، لیکن میری نظر میں اس سب کے ساتھ ان کی ایک اہم دوسری خصوصیت ان کی علمی فیاضی تھی۔ ان سے اگر کوئی بات پوچھی جائے تو وہ دریا دلی کے ساتھ بہت کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ میں اردو لغت کا کوئی نکتہ ان سے دریافت کرتا اگر وہ ان کو مستحضر نہ ہوتا یا انہیں اس بارے میں شک ہوتا تو مجھ سے کہتے ذرا توقف کیجئے اور فوراً کسی لغت یا تذکرے میں دیکھ کر جواب دے دیتے

---

[1] یوسف ناظم، خامہ بگوش کے بارے میں، ماہنامہ 'کتاب نما' نئی دہلی۔ مئی ۲۰۰۵ء ص، ۵۱

[2] انور سدید، مشفق خواجہ خطوط کے آئینے میں، مشفق من خواجہ من، ص، ۵۴

تھے۔ایسے بھی لوگ دیکھے اور سنے ہیں جو بہت ذی علم ہوتے ہیں۔لیکن اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بہت بخل سے کام لیتے، بخیل العلم ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کے بالکل برعکس مشفق خواجہ مرحوم بڑے سخی فی العلم بلکہ دریا دل تھے۔[1]

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی نے جہاں انہیں سخی فی العلم اور دریا دل کہا ہے وہیں ڈاکٹر انور سدید نے مشفق خواجہ کی ذات کو ایک انجمن اور ان کے وجود کو مجسم انسائیکلو پیڈیا اور ان کی شخصیت کو اردو ادب کی سب سے باخبر اور فعال شخصیت قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں؛

''میری نظر میں مشفق خواجہ کی وفات اکیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی سانحہ ہے۔ وجہ یہ کہ مشفق خواجہ صرف ادیب، محقق، نقاد، شاعر، کالم نگار اور دانشور ہی نہیں، وہ اپنی ذات میں ایک ایسی انجمن تھے جن سے گزشتہ چار عشروں کے دوران صدہا ادیبوں نے بلاواسطہ اور بالواسطہ استفادہ کیا۔وہ اپنے وجود میں ایک مجسم انسائیکلوپیڈیا تھے جس کے دماغ کا معلومات کا خزینہ بے دریغ تقسیم ہوتا رہا۔وہ بظاہر ''خانہ نشین'' شخصیت تھے لیکن ان کا رابطہ پوری دنیا کے اردو ادیبوں سے تھا اور ادبی دنیا کے تمام گوشوں سے لمحے لمحے کی خبریں ان تک پہنچی رہتی تھیں اور وہ اردو ادب کی سب سے باخبر اور فعال شخصیت شمار ہوتے تھے۔[2]

مشفق خواجہ کی شخصیت کا دائرہ بہت وسیع تھا یوں تو ادبی دنیا میں وہ محقق و نقاد کی حیثیت سے زیادہ جانے جاتے تھے لیکن وہ اپنے اندر ایک حساس شاعر کا دل بھی رکھتے تھے۔مشفق خواجہ نہایت ذہین اور اعلیٰ دماغ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اصولوں کے تحت زندگی گذاری ہے۔طاہر مسعود نے ان کی اعلیٰ دماغی کو سراہاتے ہوئے انہیں معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہا ہے اور ان

---

[1] ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، حق۔ ص، ۱۶۴

[2] ۔ڈاکٹر انور سدید، چند آہیں چند آنسو، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص ۱۳۰۔

کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''وہ معلومات کا انسائیکلوپیڈیا تھے اور ان کی زندگی نظم وضبط کی مضبوط ڈور میں بندھی تھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی کام کو ٹالتے ہوئے اور وقت کو ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا''۔ [1]

اسی طرح آگے طاہر مسعود انہیں اردو دنیا کا ایک بے حد وسیع المشرب اور وسیع اعلاقات انسان بھی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ اردو کی علمی وادبی دنیا کے بہت بڑے محقق بہت اچھے شاعر، کالم نگار، طناز اور انتہائی وسیع المطالعہ اسکالر تھے۔ ساتھ ہی وہ ایک بے حد وسیع المشرف اور وسیع اعلاقات انسان بھی تھے۔[2]

محمد اقبال جاوید مشفق خواجہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

''جناب مشفق خواجہ کی ذات میرے لیے بالواسطہ کئی اعتبار سے محترم رہی ہے''۔

☆.....اپنے شگوفوں کی طرح چٹکتے اور گلوں کی طرح مسکراتے جملوں کی بنا پر کہ وہ جملے ذہن کو مسرت اور نظر کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ نیز مصرعوں کی طرح ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆.....اپنے اجلے دل میں روشن دماغ کی وجہ سے کہ ایسے عطیات کسی کسی کو ارزانی ہوتے ہیں۔

☆.....اس لیے بھی کہ ان کی بزلہ سنجی میں سنجیدگی کی شان، ان کی حاضر جوابی میں انفرادیت کی آن اور ان کی برجستہ نویسی میں نشاط روح کا سامان حرف حرف منود یتا ہے۔

---

[1] طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار، ص ۱۸۷

[2] طاہر مسعود، مشفق خواجہ چند تاثرات، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار، ص ۱۸۱۔

☆.....اس باعث بھی کہ وہ اس عہد خود سپاس میں ستائش کی تمنا اور صلے
سے بے پروا ہوکر، گوشہ گمنامی میں مصروف عمل رہے جب کہ ان کے گرد و پیش،
اکثریت جلوت کی ہوس میں پاگلوں کی طرح سرگرداں تھی۔[1]

چنانچہ سرفراز سید نے بھی ان کی علمی شخصیت کو سراہاتے ہوئے ان کی شخصیت کو علم کا ادارہ کہا ہے اور ان کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ایک ایسا بڑا آدمی چلا گیا جو اول سے آخر، سرتاپا علم تھا، علم کی بات
کرتا تھا، علم کا اظہار کرتا تھا، علم کے ساتھ رہائش پذیر تھا اس کی دوستی صرف علم
والوں سے تھی۔ وہ اٹھا تو علم کا ایک پورا ادارہ اٹھ گیا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے
میں کہا گیا ہے کہ ''پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے
ہیں''۔ [2]

مشفق خواجہ کا شمار اردو دنیا کی ان تنہا پسند شخصیتوں میں ہوتا ہے جنہوں نے دنیا سے بے نیاز ہوکر اپنے کام میں مگن ہوکر علم کی دولت کو لوگوں تک پہنچایا ہے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین ان کی علمی شخصیت کو برصغیر کی چند اہم شخصیتوں میں شمار کرتے ہوئے ان کی اردو خدمات کی ستائش ان لفظوں میں کی ہے لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ جیسی شخصیتیں برصغیر کی اردو دنیا میں دو تین سے زیادہ نہیں
ہوں گی۔ جلسوں جلوسوں اور محفلوں کے طمطراق سے بے نیاز اپنے کام میں
مگن۔ علم کی دولت سمیٹتے ہوئے علم کی دولت لوگوں میں بے دریغ بانٹتے ہوئے
انہوں نے اتنے لمبے عرصہ تک اردو کی خاموش خدمت کی ہے کہ اب ان کی
خاموش خدمات کا شور ادب کے ایوان میں جگہ جگہ سنائی دینے لگا ہے۔ [3]

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ پہلو دار شخصیت کے مالک تھے ان کی شخصیت

---

[1] محمد اقبال جاوید، اٹھ گیا ناوک فگن، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص ۳۰۔
[2] سرفراز سید، مشفق خواجہ بھی چلے گئے، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار، ص ۴۳
[3] مجتبیٰ حسین، قطع کلام، ۱۴۵۔

ادبی حقیقت سے بھی ہمہ جہت تھی مثلاً وہ پایۂ کے محقق ایک اچھے شاعر، بے باک، صحافی، منفرد کالم نگار اور صاحب طرز طنز ومزاح نگار تو تھے ہی ساتھ ساتھ فرمانبردار اور حفظ مراتب کا خیال رکھنے والے تھے، مشفق و مہربان بھائی، محبی ووفادار شوہر، بے غرض وہمدرد دوست ان سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھے انسان تھے بحیثیت انسان ان کی شخصیت میں شفقت ملنساری، خلوص، مہمان نوازی بے غرضی وہمدردی، ایثار وقربانی، قناعت پسندی، خوش مزاجی اور سنجیدگی جیسی اعلیٰ اخلاقی خوبیاں بہ درجہ اتم موجود تھیں۔اور یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت مشفق خواجہ کی شخصیت آج بھی ادبی دنیا میں زندہ ہیں اور لوگ آج بھی انہیں یاد کر کے ان کی شخصی خوبیوں کی ستائش کرتے ہیں۔

غرض مشفق خواجہ ایک حساس دل رکھنے والے انسان دوست اور ہمدرد واقع ہوئے ہیں وحید الرحمن خان انہیں ایک عظیم انسان کہتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''مشفق خواجہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن ہمارے دلوں میں اور اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔وہ ایک عظیم انسان تھے اور جب ان کے لیے عظیم'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو بہ قطعاً مبالغہ معلوم نہیں ہوتا ہے بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ ان کی ''عظیم المرتبت عظمت کو بیان کرنے کے لیے اس لفظ میں اتنی وسعت اور معنویت نہیں کہ حق ادا کر سکے۔[1]

***

---

[1] وحید الرحمن خان، ایک مشفق خواجہ کی یاد میں، مشفق من خواجہ من''۔ص،۷۹

باب سوم

مزاحیہ کالم نگاری

(الف) کالم کی تعریف وخصوصیات

(ب) مزاحیہ کالم کا آغاز وارتقاء

(الف) کالم کی تعریف وخصوصیات

اردو صحافت میں کالم نگاری کی روایت بہت پرانی ہے اور پورے ایک صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے دانشوروں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان کے کالم نگاروں نے معاشرے کی اتنی صحیح عکاسی نہیں کی جتنی اردو کالم نگاروں نے کی ہے۔ اردو کے کالم نگاروں نے تمام سماجی خرابیوں، سیاسی برائیوں، اور معاشرتی مسائل اونچ، نیچ، چھوت چھات، استحصال، غربت اور جدید تہذیب کی کمزوروں کو بڑی تیکھی نظر سے دیکھا اور ان پر اکثر وبیشتر ہلکے پھلکے لیکن مؤثر انداز میں لکھا ہے۔

جدید صحافت میں بھی کالم کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، ہر صحافی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو اخبار میں کالم لکھنے کا موقع ملے تا کہ وہ مختلف مسائل ومعاملات کے متعلق اپنا نقطۂ نظر قارئین تک پہنچا سکے۔ اس طرح بہت سے ادیب بھی کالم نویس بن گئے۔ جدید دور میں ہم کسی ایسے اخبار کا تصور نہیں کر سکتے جو بغیر کالم کے شائع ہوتا ہو، سید اقبال قادری جدید صحافت میں کالم نویسی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> کالم نویسی جدید صحافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ مشہور کالم نویسیوں نے حالات حاضرہ پر تبصرہ نگاری کے ذریعہ پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور اہم مسائل کی توضیح کی ذمہ دار کامیابی سے انجام دی ہے۔ [1]

''کالم'' کے لغوی معنی قطار، کھمبا، ستون، مینار اور صفحے کا حصہ ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ فوج سے لیا گیا ہے جہاں ایک نظم کے ساتھ کھڑے ہونے یا چلنے کو کالم کہا جاتا ہے۔ جامعہ فروز اللغات میں کالم کے لغوی معنی اس طرح درج ہیں:

''ا)۔ صفحے کا حصہ، خصوصاً اخبار کا

---

[1] ۔ سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 2008ء ص:315

۲)۔فوج کا ایک دستہ [1]

علمی اردو لغت میں بھی کالم کے یہی معنی درج ہیں، اوکسفر ڈ انگلش اردو ڈکشنری میں کالم کے لغوی و اصطلاحی معنی اس طرح ملتے ہیں:

Column ۱)تعمیرات: ستون، تھم، اکثر اوپر سے قدرے پتلا اور محراب یا چھت کو سہارے ہوئے، یا تنہا بطور یادگار قائم ۔۲) ستون کی طرح کی تعمیر یا شکل ،۳) دھویں، پانی یا بھاپ وغیرہ کی لاٹ ۔۴) (الف) جدول یا صفحے کی عمودی تقسیم جس میں اعداد وغیرہ اوپر ہوں (ب) وہ اعداد یا اندراجات ۔۵) اخبار کا وہ حصہ جو کسی خاص موضوع کے مختص ہو Gossip Column گپ شپ کا کالم ۔[2]

اسی طرح انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں کالم اور کالم نویس سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''ایک اخبار میں لکھنے والے کے نام کے ساتھ ایک مستقل عنوان کے تحت باقاعدگی سے شائع ہونے والی تحریر کے مصنف یا مدیر کو کالم نویس کہتے ہیں جو تازہ حالات اور واقعات پر اظہار خیال کے لیے وقف ہوتی ہے۔ کالم مزاحیہ بھی ہوسکتا ہے اور سنجیدہ بھی۔ یہ کسی ایک موضوع پر بھی ہوسکتا ہے اور زندگی کے متعلق عمومی بھی۔ یہ ہلکا پھلکا بھی ہوسکتا ہے اور اس میں مختلف اخلاق و آداب اور دلچسپی کے دوسرے تصور پر ثقیل قسم کی بحث دلائل اور مشورے وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں ایک کالم لازمی طور پر لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور نقطۂ نظر کا عکس ہوتا ہے خواہ یہ اشیائے ضرورت سے متعلق ہو۔ خارجہ پالیسی سے متعلق یا منڈی کے رجحانات سے متعلق''۔

مذکورہ بالا تعریفوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کالم دراصل صحافتی مواد یا موضوعاتی تحریر ہے جو کسی مستقل عنوان کے تحت پابندی سے شائع ہوتی ہے اور اس کی جگہ اخباری صفحہ پر متعین ہوتی یعنی کسی بھی اخبار یا

---

[1] مولوی فیروزالدین، جامع فیروز اللغات، ایڈیشن 2006، ص 977

[2] اوکسفر ڈ انگلش اردو ڈکشنری، شان الحق حقی، صفحہ: 282

رسالے میں مقررہ موضوع پر اپنے مخصوص انداز بیان واسلوب پر لکھی جانے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں اور کالم لکھنے والا کالم نگار یا کالم نویس کہلاتا ہے۔اخبار یا رسالہ کا ہر صفحہ کالموں میں تقسیم ہوتا ہے۔اخبار میں تحریریں عموماً قارئین کی سہولت کے لیے آٹھ مختلف حصوں میں تقسیم کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ان میں سے ہر حصے کو بھی کالم کا نام دیا جاتا ہے۔

کالم کو فیچر کی ایک قسم بھی قرار دیا گیا ہے اور ادارے کا متبادل بھی۔ پروفیسر سید اقبال قادری کالم کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کالم میں تازہ خبروں پر انوکھے انداز میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔اداریہ سے جو کام ہوتا ہے وہی کالم ذریعہ ہوتا ہے مگر کالم زیادہ شگفتہ اور عموماً غیر رسمی ہوتے ہیں''۔ [1]

آگے وہ لکھتے ہیں:

> ''مجموعی طور پر کالم ''ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملہ کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے''۔ [2]

کالم میں عام طور پر وقتی،قومی،ملی،ثقافتی،علمی،ادبی،تہذیبی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے، کچھ کالم روزانہ شائع ہوتے ہیں۔ کچھ سہ روزہ اور ہفت روزہ ہوتے ہیں۔ کالم نویس حالات حاضرہ پر تبصرہ، پیچیدہ معاملات کی وضاحت اور اہم مسائل کی تشریح کالم کے ذریعہ کرتا ہے اور انفرادی طور پر اپنی رائے کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔اس لیے دانشور کالم نگار کو صحافی بھی کہتے ہیں۔

صحافت کا مقصد قارئین کو تازہ حالات وواقعات سے مطلع رکھنا،ان کے لیے تفریح فراہم کرنا اور ان کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔خبریں،مضامین فیچر اور اداریے عموماً ان ہی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے لکھے

---

[1] ۔سید اقبال قادری،رہبر اخبار نویسی، ص:315

[2] ۔سید اقبال قاری،رہبر اخبار نویسی،ص:318

جاتے ہیں،اس طرح کالم نویسی کے بھی کئی ایک مقاصد ہیں۔کالم نویس قارئین کے لیے مختلف موضوعات پر ایسی دلچسپ تحریریں فراہم کرتا ہے جو اخبار میں کسی دوسری جگہ نہیں ہوتیں ۔یہی نہیں کالم نویس قارئین کے دوست کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔وہ ایسے موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہے جس سے کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعلق ہوتا ہے۔اس کا انداز ایک بے تکلف دوست کا سا ہوتا ہے ۔اس کے کالم میں جو موضوعات زیر بحث آتے ہیں اس سے اکثر عوام کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کی صورت بھی نکل آتی ہے۔

کالم نویس قارئین کو معاشرے کی حالات پر سوچنے کی عادت ڈالتے ہیں اور اپنے کالم میں ایسے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں جو معاشرے کے لیے کسی نہ کسی طرح اہم ہوتے ہیں۔ان موضوعات پر یقین کے ساتھ اظہار کرنے کے لیے کبھی وہ اشارے اور کنایے کا استعمال کرتے ہیں تو کبھی واضح طور پر موضوع بحث کے اہم نکتہ پر اس دور اندیشی سے روشنی ڈالتے ہیں کہ قارئین سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں چنانچہ کالم نویس کی اس دعوت غور فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے سید اقبال قادری نے کالم نویس کے مقاصد پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

> ''کالم نویس اپنے خیالات کا اظہار یقین کامل کے ساتھ کرتے ہیں،کبھی وہ کنایتاً لکھتے ہیں اور کبھی علانیہ طور پر اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کرتے ہیں ۔عموماً ان کے جائزوں میں دور اندیشی کا عنصر ہوتا ہے۔وہ اپنے قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں،کالم نویس اپنی معلومات کی فراوانی سے قارئین کو متحیر کرتے ہیں۔وہ مبصر بھی ہیں اور مشرح بھی ۔وہ مختلف النوع موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں،عموماً کالم نویسیوں کا خیال ہوتا ہے کہ قارئین ان کے نظریات سے اتفاق کریں یا نہ کریں مگر ان کی رائے ضرور پڑھیں گے۔'' [1]

---

[1]۔ سید اقبال قادری،راہبر اخبار نویسی،ص:316

کالم شخصی صحافت کی کمی کو پورا کرتے ہیں اور قارئین کے اخبار سے لگاؤ اور وابستگی کی صورت پیدا کرتے ہیں اور اسی طرح کالم نویس کو بھی کھل کر اپنی ذات کے اظہار کا موقع مل جاتا ہے، سید اقبال قادری نے کالم کو انفرادی صحافت کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کالم نویس کے چاہنے والوں کا بھی ایک حلقہ بن جاتا ہے چونکہ کالم انفرادی صحافت کا ایک بہترین نمونہ ہے کالم نویس اپنے کالم کے ذریعہ اپنے ذاتی خیالات کا اظہار پوری توجہ سے کھلم کھلا کرتا ہے''۔ [1]

کالم نویس کے وسائل کافی وسیع ہوتے ہیں اس کا رابطہ اعلیٰ سیاسی سماجی اور سرکاری حلقوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اس لیے قارئین کو ایسی اہم خبریں بھی فراہم کرتا ہے جو انہیں کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں کیوں کہ تمام رپورٹروں کی ان خبروں تک رسائی نہیں ہوتی لہٰذا یہ بھی کالم کا ایک اہم مقصد ہے، سید اقبال قادری نے کالم نویس کے وسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کالم نویس کے وسائل کافی وسیع ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ گہرا ہوتا ہے، وہ مخفی مگر معتبر ذرائع سے بھی اطلاعات جمع کرتے ہیں ان کے تعلقات بھی مختلف لوگوں سے وسیع اور مفید ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بلند نظری، ہنر مندی اور حکمت سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ رائے عامہ کے ترجمان اور پاسبان بن کر وہ قومی اور بین الاقوامی معاملات پر اظہار رائے کرتے ہیں''۔ [2]

کالم نویسی ایک تکنیکی ہنر ہے کالم کی تکنیک کم و بیش اداریہ کی تکنیک جیسی ہوتی ہے۔ زبان و بیان ہی اداریہ اور کالم میں خط فاصل کھینچتے ہیں، عموماً اداریہ میں قصہ، کہانی، لطیفہ، چٹکلہ، پھبتی وغیرہ سے پرہیز کیا جاتا ہے لیکن کالم میں موضوع سے متعلق اہم نکات بیان کرتے ہوئے موضوع کے پس منظر، لوگوں کی رائے، اور ان کی پیش کش میں کوئی لطیفہ، پھبتی، مزاحیہ جملہ اور کبھی کبھی کوئی قصہ یا کہانی کا سہارا لیا جاتا ہے، کالم نگار

---

[1] ۔سید اقبال قادری، راہبر اخبار نویسی، ص:316

[2] سید اقبال قادری، راہبر اخبار نویسی، ص:317

بہ بانگ دہل اپنی رائے دیتا ہے،اس لیے تحریر میں کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔خبروں پر مبنی کالم میں موضوع کا انتخاب بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح رپورٹر خبروں کا انتخاب کرتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں موضوع کی تشریح وتوضیح کا فریضہ انجام دیتا ہے ۔موضوع میں ربط اور تسلسل کا ہونا بھی لازمی ہے۔کالم میں جو خیالات ،واقعات ،حقائق ،تجاویز ،آراء اور نتائج دیئے جائیں،ان سب کا آپس میں تال میل ضروری ہے۔ ورنہ قاری اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جائے گا۔کامیابی اور مقبولیت ان ہی کالموں کے حصے میں آتی ہے۔جن میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد کو دلچسپ پیرائے اظہار میں بیان کیا جاتا ہے،قاری کو ایسا لگے جیسا کالم نگار صرف اور صرف اسی سے مخاطب ہے اور یہ کالم اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔

کالم نویسی ایک تکنیکی ہنر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تخلیق فن کا درجہ بھی رکھتی ہے۔اس کے لیے دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے ہر تخلیقی صلاحیت رکھنے والا شخص کالم نگار نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ کالم لکھنے کے آداب سے واقف نہ ہو، کیوں کہ کالم غور وفکر کے بعد پوری ذمہ داری اور اس احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ کالم میں حالات کے رخ کو موڑنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے، کالم نویس اخبار کے بیشتر قارئین کو جواب دہ ہوتا ہے۔اس کی ذرا سی کاہلی ،تساہلی ،اور غفلت سے قارئین کی نظر میں کالم اور کالم نگار کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

کالم کی شان اس کی زبان و بیان سے ہے بنیادی طور پر صحافت کی زبان دو اور دو چار والی زبان ہوتی ہے آج کے دور میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات پہنچانے کا کام کیا جاتا ہے۔چونکہ کالم کا مطالعہ نہ صرف دانشور طبقہ بلکہ کم پڑھے لکھے قارئین بھی ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔اس لیے کالم کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے، کالم نویس یہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جو ایک عام قاری کی سمجھ سے باہر ہو۔اس لیے کالم کی تحریر کو جامع اور ٹھوس اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب اس میں مشکل الفاظ مبہم فقرے پیچیدہ تراکیب اور نا قابل فہم علامتوں سے پاک کیا جائے۔ ہر سطح کے قائین کا خیال کرتے ہوئے

کالم میں زبان استعمال کی جاتی ہے البتہ کالم نویس اپنی زبان کو چٹخارے بنانے کی کوشش کرتا ہے جو کالم کے زبان کے لیے بے حد ضروری ہے کیونکہ موضوع خواہ کتنا ہی سنجیدہ اور خشک کیوں نہ ہو کالم کی چٹخارے بنانے والی زبان موضوع کی خشکی اور سنجیدگی کو ایک حد تک کم کر دیتی ہے۔ یہی کالم کی کامیابی کا بنیادی پہلو ہے۔ مزید یہ کہ کالم میں چونکہ ذاتی رائے کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کالم نگار اپنے کالم میں ذاتی خیالات کا اظہار برملا کرتا ہے۔اسی لیے کالم نگار اس میں انفرادی طور پر اپنی رائے کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہے اور شاید اسی لیے اس میں ہم کے بجائے ''میں'' میرے، جیسے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔

چنانچہ سید اقبال قادری نے کالم کی طرز تحریر اور خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کالم کیطرز تحریر عام طرز سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔کالم میں چٹخارے دار زبان ہو تو قارئین بہت محظوظ ہوتے ہیں۔کالم میں ''ہم'' نہیں استعمال ہوتا بلکہ ''میں'' میرے'' میری'' میرے خیال میں'' میری رائے میں'' جیسے الفاظ زیادہ مستقل ہوتے ہیں۔ایک معمولی بات کو غیر معمولی ڈھنگ سے پیش کرنا کالم نویس کا خصوصی ہنر ہوتا ہے۔کالم میں شائستگی کے ساتھ زندہ دلی اور سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی کا ہونا ضروری۔دیگر تحریروں کے مقابلہ میں مستقل کالم میں ایک زمزمہ ہوتا ہے۔کالم میں کوئی بھی بات زیادہ کشادگی، فراخ دلی، استقلال اور اثر کے ساتھ لکھی جاسکتی ہے، ذاتی رائے کو جس ذہانت اور صلاحیت کے ساتھ کالم میں سمویا جاسکتا ہے وہ اداریہ میں سمونا ذرا مشکل ہے۔کالم میں کالم نویس رعایت ،ملائمت اور راحت سے قلم چلا سکتا ہے۔اگر فکاہیہ ہو تو وقت کی رفتار کا خصوصی خیال رکھنا ہوتا ہے۔جس طرح لطیفہ کوئی میں لطیفہ سے زیادہ بیانیہ انداز سے سامعین زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں بالکل اسی طرح کالم میں بات کتنی ہی سیدھی سادی یا غیر اہم ہو قارئین زبان و بیان کی شوخی سے زیادہ مسرور اور محظوظ ہوتے ہیں''۔ [1]

---

[1] سید اقبال قادری، راہبر اخبار نویسی، ص:319

اقبال قادری کی اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالم میں طرز تحریر کی خاص اہمیت ہوتی ہے اس لیے کالم نگار کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے لطیف اور شگفتہ پیرایہ اختیار کرے اور اس طرح اپنے کالموں کو زبان و بیان کے کمال سے دلچسپ بنائے۔

کالم کی اقسام

اخبارات میں بے شمار کالم شائع ہوتے ہیں۔ موضوع، اسلوب اور دیگر حوالوں سے انہیں مختلف اقسام میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کالم نویس کا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے۔ اکثر کالم نویس اتنے متنوع موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ ان کے کالم کی کسی ایک قسم میں درجہ بندی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف کالموں کے اسلوب بیان بھی مختلف ہوتے ہیں۔

ماہرین صحافت کا خیال ہے کہ چونکہ کالم لکھنے کا نہ تو کوئی متعین طریقہ ہے اور نہ ہی متعین اسلوب ہے، اس لیے ایک ہی کالم نویس کے مختلف کالموں کی مختلف اقسام میں درجہ بندی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ کالم کی اقسام کا تعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کالم کی مندرجہ ذیل تین حوالوں سے تقسیم کی گئی ہے:

(۱) موضوع

(۲) اسلوب

(۳) مشاہدہ

1۔ موضوع:

موضوع کے حوالے سے کالم کی متعدد اقسام کی جاسکتی ہیں۔ ان میں کسی خاص شعبے، پیشے، مشغلے یا مضمون کے متعلق لکھے جانے والے کالم شامل ہیں۔ ایسے کالم لکھنے والے کے لیے متعلقہ علم اور فن کا ماہر ہونا ضروری ہے ایسے کالموں میں عموماً خیال آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی اور یہ عموماً قارئین کی معلومات، رہنمائی اور

تربیت کے لیے لکھے جاتے ہیں تاہم ایسے کالم نویسیوں کے لیے صحافتی زبان پر دسترس ضروری خیال کیا جاتی ہے کیونکہ عام قارئین کو فنی معاملات سے آگہی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات سب ایڈیٹر کو بھی ایسے کالموں کی افادیت کی بنا پر ان پر محنت کر کے قارئین کے لیے آسان بنانا پڑتا ہے۔ ایسے کالموں کی اہم اقسام درج ذیل ہیں۔

طبی کالم

ایسے کالم میں قارئین کو کسی بیماری کی علامات، وجوہات، علاج اور احتیاطی تدابیر سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ موسمی سبزیوں، پھلوں اور ان کے استعمال کے متعلق بھی مشورے دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی وبائی مرض پھوٹ پڑے یا ایسا کوئی امکان ہو تو متعلقہ مرض کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ اور اس کا علاج بھی تجویز کیا جاتا ہے۔

قانونی کالم

عام آدمی کا قانون کے متعلق علم واجبی ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں اسے جو مسائل و معاملات پیش آتے ہیں اسے ان سے متعلق قانونی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے مگر نہ تو اس میں قانونی کتب سے استفادہ کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور نہ ہی فرصت۔ اس لیے لوگوں کی ضروریات قانونی کالم پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کالم میں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل و معاملات کے قانونی پہلوؤں پر عام فہم انداز میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے نئے قواعد وضوابط، نئی اصلاحات، آرڈیننسوں، اسمبلیوں میں منظور ہونے والے نئے بلوں اور نئے سرکاری احکامات کی قانونی نقطہ نظر سے عام فہم انداز میں وضاحت کی جاتی ہے۔ کالم نویس ماہ رمضان میں احترام رمضان آرڈی ننس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے اسی طرح ملاوٹ کے خلاف سرکاری مہم کے دوران ملاوٹ سے متعلقہ قوانین کی آسان زبان میں وضاحت کرتا ہے۔ قارئین کے مسائل کے حل کے لیے انہیں قانونی مشورے

بھی دیے جاتے ہیں۔

دینی کالم

اس کالم میں اہم دینی امور کے متعلق عام فہم انداز میں ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ مختلف مذہبی تہواروں پر ان کے تاریخی پس منظر اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے بھی کالم لکھے جاتے ہیں اس کے علاوہ اہم دینی شخصیات اور شریعت کے مسائل کے متعلق بھی لکھا جاتا ہے۔ دور جدید کے مسائل کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

دینی کالم عموماً علماء اور دینی علوم پر عبور رکھنے والے افراد لکھتے ہیں۔ ان کالموں میں اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ متنازعہ معاملات پر نہ لکھائے اور کوئی ایسی چیز بھی نہ شائع کی جائے جس سے کسی فرقے کے جذبات مجروح ہونے کا امکان ہو۔

نفسیاتی کالم

نفسیاتی کالموں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ قارئین ان کالموں کو ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنے روزمرہ کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کالم میں انسانی نفسیات پر بحث کی جاتی ہے۔ مختلف نفسیاتی مسائل کے حل کے لیے ماہرانہ مشورے دیے جاتے ہیں۔ یہ کالم ایسے ماہرین نفسیات تحریر کرتے ہیں جنہیں زبان وبیان پر عبور حاصل ہو۔

معاشی کالم

اس کالم میں معاشی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے ملکی معیشت پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کا جائزہ لے کر حکومت کو مختلف اقدامات کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ یہ کالم عموماً ماہرین معاشیات لکھتے ہیں اور اس کے قارئین بھی مخصوص ہوتے ہیں تاہم اب معاشی کالم لکھنے والے بھی عام قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہیں اور ایسے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جن سے معاشرے کا ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی صورت میں

متاثر ہور ہا ہو۔

کھیلوں کے کالم

اخبارات میں عموماً کھیلوں کا ایڈیشن با قاعدگی سے شائع ہوتا ہے تاہم اہم میچوں، کھلاڑیوں اور کھیل سے متعلقہ دوسرے معاملات کی وضاحت کے لیے کھیلوں کے متعلق کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ کالم عموماً سابقہ کھلاڑی یا ایسے صحافی لکھتے ہیں جن کا کھیلوں کے متعلق وسیع تجربہ ہوتا ہے۔

پامسٹری اور علم نجوم

مغرب میں پامسٹری اور علم نجوم نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ کثیر الاشاعت اخبارات متذکرہ علوم کے متعلق با قاعدگی سے کالم شائع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تقریباً تمام بڑے اخبارات میں یہ کالم با قاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کالم میں دست شناسی اور ستاروں کے اثرات کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے اور قارئین کے خطوط کے جوابات دیے جاتے ہیں۔

امور خانہ داری

خواتین کی دلچسپی، معلومات اور رہنمائی کے لیے متعدد اخبارات امور خانہ داری کے متعلق کالم شائع کرتے ہیں ان میں خواتین کو گھر بہتر انداز میں چلانے کے لیے مشورے دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں مختلف پکوان کے طریقے بھی درج ہوتے ہیں اور خواتین کی خانہ داری کے متعلق سوالات و جوابات بھی اس کالم کا حصہ ہوتے ہیں۔

فیشن

یہ کالم بھی خواتین کے لیے ہوتا ہے اور اسے عموماً خواتین ہی لکھتی ہیں۔ اس کالم میں ملبوسات، تزئین و آرائش، ہیر اسٹائل وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

(2) اسلوب

کسی بھی کالم نویس کی کامیابی میں اس کا اسلوب اہم کردار ادا کرتا ہے۔مقبول کالم نویسیوں کے کالم اگر ان کے نام کے بغیر بھی شائع کیے جائیں تو قارئین انہیں فوراً پہچان لیتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ کالم کا موضوع اس کے اسلوب کو متعین کرتا ہے۔اسلوب کے حوالے سے کالم کی مندرجہ ذیل اقسام متعین کی گئی ہیں۔

فکاہیہ کالم

برصغیر کے اخبارات میں کالم نویسی کی ابتدا فکاہیہ کالموں سے ہوئی ہے۔آج بھی فکاہیہ کالم انتہائی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور انہیں کالم کی مقبول ترین صنف قرار دیا جاتا ہے۔فکاہی کالم عموماً ایسے ادب اور صحافی لکھتے ہیں جنہیں زبان وبیان پر مکمل عبور ہوتا ہے اور جو مختلف واقعات کے دلچسپ پہلوؤں کو فنکارانہ چابکدستی سے بیان کرتے ہیں۔بعض اوقات کالم نویس طنزیہ انداز میں تلخ معاشرتی حقائق کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔فکاہیہ کالم عموماً کسی دلچسپ خبر کے حوالے سے لکھے جاتے ہیں قارئین کے خطوط بھی کالم کا حصہ بنتے ہیں۔

سنجیدہ کالم

اس کالم میں سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھایا جاتا ہے۔اس میں طنز ومزاح کی گنجائش قدرے کم ہی ہوتی ہے۔اپنے انداز او اسلوب کے حوالے سے یہ اداریے کے قریب ہوتا ہے مگر سنجیدہ کالم اور اداریے میں فرق یہ ہے کہ جہاں اداریے میں پیش کیے گئے خیالات کو اخبار کے خیالات سمجھا جاتا ہے، وہاں اس میں کالم نویس کے ذاتی خیالات ہوتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ اخبار کی پالیسی سے بھی مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

سنجیدہ یا اداریہ نما کالم لکھنے والے عموماً ایسے اصحاب ہوتے ہیں جن کا وسیع علمی یا سیاسی پس منظر ہوتا ہے اور وہ معاملات کا تجزیہ کرکے انہیں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔قارئین انہیں رہنمائی کے لیے

پڑھتے ہیں اور مختلف سیاسی اور سماجی واقعات کے پس منظر اور پیش منظر سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

مکتوباتی کالم

وہ کالم جن میں قارئین کے خطوط کو کالم کا حصہ بنایا جاتا ہے، مکتوباتی کالم کہلاتے ہیں۔ کالم نویس کبھی کبھار کسی خط سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اس خط کا پیغام قارئین تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہے۔ اکثر وہ اس خط کے ساتھ اپنی رائے بھی پیش کرتا ہے۔ بعض اوقات مختلف خطوط کو اس انداز سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ کالم نویس خود کچھ کہے بغیر قارئین تک اپنے دل کی بات پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

علامتی کالم

علامتی کالم میں استعارے، کنایے اور محاورے کا استعمال کیا جاتا ہے تا کہ تحریر پر صحافتی انیسن کے ذریعے گرفت نہ کی جا سکے۔ یہ کالم صرف ایسے کالم نویس ہی لکھ سکتے ہیں جن کی حالات پر گہری نظر ہو اور وہ واقعات کے پس منظر اور پیش منظر سے بخوبی آگاہ ہوں۔ مزید برآں زبان و بیان پر انہیں عبور حاصل ہو۔ ایسے کالم عموماً مارشل لاء یا ہنگامی حالات کے دوران ہی لکھے جاتے ہیں تاہم بعض اوقات کسی خاص مذہبی فرقے یا خاص علاقے کے لوگوں کے جذبات مجروح ہونے کا اندیشہ ہو یا دوسری کوئی ایسی صورت ہو جس سے نقصانِ امن کا خدشہ ہو تو علامتی انداز کے کالم لکھے جاتے ہیں۔

(3) مشاہداتی کالم

اردو صحافت میں مشاہداتی کالم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ قارئین میں خاصی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ مشاہداتی کالموں کی مندرجہ ذیل دو اقسام ہیں۔

سفرنامہ یا سیاحتی کالم

اس کالم میں کسی سفر، تفریح یا مہم کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ بیرون ملک، اندرون ملک بلکہ

اندرون شہر کے سفر کو کالم کا موضوع بنایا جاتا ہے۔بعض اوقات کسی سمینار، مذاکرہ یا ورکشاپ کی روداد بھی اس کالم میں جگہ پاتی ہے۔کبھی موضوع کی وسعت کی وجہ سے کئی روز تک ایک ہی واقعے یا سفر پر کالم لکھا جاتا ہے۔

شہر نامہ یا ڈائری نما کالم

اس کالم میں شہر کے مختلف واقعات اور مسائل کے متعلق کالم نویس اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہے۔اس میں ادبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔کالم نویس ایک رپورٹر کی طرح شہر کے مختلف حلقوں میں گھوم کر اپنے تاثرات کے ساتھ مختلف واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔بعض اوقات کالم نویس سنجیدہ موضوعات پر بھی قلم اٹھاتا ہے تاہم قارئین کی دلچسپی برقرار رکھنے کا خصوصی طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

فن کالم نگاری کے اس اجمالی تعارف کے بعد اب ہم اردو میں کالم نگاری کے آغاز وارتقا پر نظر ڈالتے ہیں۔

برصغیر میں صحافت کا باقاعدہ آغاز 1780ء میں ہوا۔اس سال 29 جنوری کو جیمز آگسٹس ہکی نے ہفت روزہ ''ہکیز گزٹ'' یا کلکتہ جنرل ایڈورڈ ٹائزر کی اشاعت کا آغاز کیا۔انگریزی زبان میں شائع ہونے والا یہ اخبار انگریز حکمران طبقے کے لیے پریشانیاں لے کر آیا کیونکہ ہکی کمپنی کی حکومت پر تنقید کرتا تھا اور اس ضمن میں احتیاط کا دامن بھی اس کے ہاتھ سے بار بار نکل جاتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر یہ اخبار بند ہو گیا اور ۱۷۹۳ء میں اس نے لارڈ وارن ہسٹنگز کو ایک توہین آمیز خط میں استدعا کی کہ وہ اسے کوئی چھوٹی سی نوکری دلانے میں مدد کرے۔

انگریز برصغیر پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے کے لیے یہاں ایسی ثقافتی اور معاشرتی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں اس کے ایسے دیسی وفادار پیدا ہو جائیں جو اس کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں اس کی مدد کریں۔انیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں انگریزی رائج کرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ

اسے سرکاری زبان بنایا جاسکتا تھا اسی لیے حکمران طبقہ فارسی زبان کے اثرات کا خاتمہ چاہتا تھا کیونکہ وہ فارسی کو مغلوں کے اقتدار کی نشانی اور مسلمانوں کے تمدن اور علم وادب کی علامت سمجھتا تھا۔ فارسی زبان کی بجائے اردو زبان کو رائج کرنے کا فیصلہ ایک سیاسی فیصلہ تھا جس کے ذریعے انگریز نے ثقافتی اور معاشرتی طور پر ایک عہد کے خاتمے اور دوسرے عہد کے آغاز کا اعلان کیا اور ۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔

اردو برصغیر کے لوگوں کی زبان تو تھی مگر ادب یا صحافت میں اس کو عمومی طور پر اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ برصغیر کا پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' تھا۔ جس نے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو اشاعت کا آغاز کیا تھا۔

برصغیر میں اگر ہم کالم کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو یہ ہمیں کئی تبدیلیوں سے گذرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہمیں کالم کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ آغاز میں یہ خبری کالم تھا یعنی خبروں کو کالم کی صورت میں درج کر دیا تھا تاہم ان میں سے بعض خبروں میں فکاہیہ کالم کی سی شگفتگی ملتی ہے۔ دوسرے دور میں کالم مضامین کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کا آغاز ''اودھ پنچ'' نے کیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کی اور پھر یہ قاعدہ ایک مستقل عنوان کے ساتھ کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع ہونے لگا۔

اردو صحافت میں کالم نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہوا لیکن اردو اخبارات کی تحریریں پہلے ہی دن سے اپنے اندر کالم کا رنگ ڈھنگ اور طرز و اسلوب سموئے ہوئے تھیں۔ ۲۷ر مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو کا سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' جاری ہوا۔ اس وقت کالم کے نام سے کوئی آشنا نہ تھا، نہ ہی مستقل عنوانات کے ساتھ کالم کو اپنی کوئی علحدہ حیثیت حاصل تھی مگر کالم کا وجود اخبار کی خبروں اور مضامین کے اسلوب و بیان، مواد اور فکر و خیال میں یوں موجود تھا جیسے انسانی جسم میں روح کی اہمیت ہوتی ہے۔ ابتداء میں اردو اخبارات نے خبر کی تازگی، جامعیت یا تکنیک پر کوئی توجہ نہیں دی گئی بلکہ زبان و بیان

میں چٹخارے، شگفتگی اور ندرت بیان پر زور دیا گیا۔خبریں محض واقعاتی حقائق کا بیان ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان میں کالم کی طرح خیال آرائی اور تنقید وتبصرہ، خیال آرائی اور زبان و بیان کی حسن ورعنائی بھی موجود تھی۔ ابتدائی دور کی اکثر وبیشتر خبریں ہر لحاظ سے کالم کی ہیئت اور اسلوب میں لکھی جاتی تھیں۔

اس دور میں فارسی اخبار بھی اردو ضمیمے شائع کرتے تھے ان میں بھی ایسی خبریں ہوتی تھیں جن میں کالم کا انداز ملتا تھا۔مثلاً ''آئینہ سکندر، ۲۶/اپریل ۱۸۲۲ء کو بمبئی سے جاری کیا گیا۔۱۸۳۳ء کے اواخر تک یہ صرف فارسی کا اخبار تھا جب کہ ۱۸۳۴ء میں اس کے ساتھ اردو ضمیمہ کا بھی اضافہ ہو گیا اس کی خبروں میں تبصرہ اور خیال آرائی ایک لازمی جزو ہوتا تھا۔

سر سید احمد خاں نے اردو صحافت کے اسلوب میں نئے اضافے کیے۔انہوں نے صحافت کو قوم کی خدمت کا ذریعہ بنایا تو ان کا خلوص ان کی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کی رگوں میں ایک تازہ ولولہ کا خون بن کر دوڑنے لگا۔انہوں نے صحافت میں ایک ایسے اسلوب کو جنم دیا جو بنیادی طور پر منطق اور دلائل پر مبنی تھا۔ ان کی تحریروں میں فکاہیہ کالم کا انداز تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کی تحریریں کالم سے زیادہ قریب نظر آتی ہیں۔

۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے ''اودھ اخبار'' جاری کیا تھا۔اس اخبار نے برصغیر کی صحافت کی ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔سر سید احمد خاں نے بھی اس اخبار کی اہمیت کو سراہا ہے۔ گارساں دتا سی نے ۱۸۶۶ء میں اسے ہندستان کا سب سے ضخیم اخبار قرار دیا تھا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا اور ۱۸۶۶ء میں اس کے صفحات کی تعداد اڑتالیس تھی۔ اس اخبار سے کالم نما مضامین کی روایت کا آغاز ہوا جو پنچ اخبارات کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ''اودھ اخبار'' میں ظرافت کے عنوان سے فکاہیہ مضامین لکھتے تھے۔

برصغیر کی صحافت میں کلام نویسی کے حوالے سے اودھ پنچ کے دور کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

جنگ آزادی سے ۲۰ سال بعد شائع ہونے والے اس اخبار نے نہ صرف ہندستان کی صحافتی ، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

اس دور میں بلکہ اردو نثر پر جو اثرات مرتب کیے انہیں اب تک محسوس کیا جاتا ہے اور جہاں تک کالم نویسی کا تعلق ہے تو اودھ پنچ کی بیشتر تحریریں اپنے مزاج اور اسلوب کے حوالے سے کام کی تحریریں تھیں۔ یہی وجہ رہی کہ اکبرالہ آبادی نے اودھ پنچ کو لندن پنچ سے بہتر جریدہ قرار دیا تھا۔

اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، نواب سعید محمد آزاد اور اکبرالہٰ آبادی قابل ذکر ہیں۔ ان قد آور طنز و مزاح نگاروں نے صحیح معنوں میں اردو کے مزاحیہ ادب کو ایک اعتبار بخشا۔ اودھ پنچ کے بعد ہندستان کے گوشے گوشے سے پنچ نکلنے لگے۔ پنجاب پنچ ،لاہور پنچ ، جالندھر پنچ ، بنارس پنچ ،آگرہ پنچ ، دکن پنچ ،دکن پنچ ، اور نہ جانے کتنے ہی پنچ نکلے مگر جو مقام ''اودھ پنچ'' کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آسکا۔ ۳۶ برس تک ''اودھ پنچ'' نے اردو طنز و مزاح کے بے پناہ خدمت کی ہے۔ اودھ پنچ کا یہ کارنامہ قابل تحسین ہے کہ اس کے لکھنے والوں نے زبان کو نہ صرف آسان اور عام فہم بنایا بلکہ ان لکھنے والوں کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی پیدا کیا ہے۔ سیاسی ، سماجی اور ثقافتی کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو ان کی تحریر کی زد میں نہ آیا ہو۔ اودھ پنچ اور اس کے رسالوں کی ظرافت بحیثیت مجموعی اعلیٰ معیار کی بھلے ہی نہ ہو لیکن ان لکھنے والوں نے وہ بنیاد رکھی اور وہ ماحول پیدا کیا جو اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری تھا۔

(ب) مزاحیہ کالم نگاری

اخبارات ورسائل میں مزاحیہ کالم نگاری بیسویں صدی کی دین ہے ان اخبارات ورسائل میں جو کالم شائع ہوتے رہے ہیں ان کی اسلوب کے لحاظ سے دو بڑی قسمیں ہیں سنجیدہ کالم اور مزاحیہ کالم، نامی انصاری نے اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں کی اقسام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اخبارات کے کالم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جن میں روزمرہ کے سیاسی سماجی حالات پر طنزیہ مزاحیہ تبصرہ ہوتا ہے۔

بعض اوقات تہذیبی وتمدنی معاملات کی مضحکہ خیزیوں کو بھی کالم نگار اجاگر کرتا ہے اور ان نازک حقیقتوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتا ہے جن کا راست تعلق روز مرہ کی عمومی زندگی کے واقعات وحادثات سے ہوتا ہے اور اس طرح اخبار کے قاری اور کالم نگار کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہموار ہوجاتا ہے لیکن ہر دن ایک مزاحیہ کالم لکھنا آسان نہیں..... دوسری قسم کی کالم نگاری وہ ہے جس میں مزاح کے ساتھ ادبی حسن بھی ہوتا ہے اور اسی لیے اس کی مستقل حیثیت بن جاتی ہے۔ یہ کالم کبھی باسی نہیں ہوتے اور ایک اخبار سے دوسرے اخبار میں نقل ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا انتخاب کتابی صورت میں بھی شائع ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ عطاء الحق، مجتبیٰ حسین اور محمد خالد اختر ایسے ہی کالم نویسوں کے زمرے میں آتے ہیں''۔ [1]

مزاحیہ کالم نگاری کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے ہر طرح کے موضوعات کو مزاحیہ کالم کا موضوع بنایا جاسکتا ہے اس میں موضوع کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔

---

[1] نامی انصاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح، ص: 161

اس سے قارئین کو نہ صرف تفریح فراہم کی جاتی ہے بلکہ ان کی ذہن سازی کا فریضہ بھی انجام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کالم نگاری ایک مشکل فن ہے لیکن اس سے مشکل مزاحیہ کالم نگاری ہے کیونکہ یہ ایسی چیز نہیں جو تربیت سے سیکھی جاسکتی ہے بلکہ اس کے لیے طبعی میلان کا ہونا ضروری ہے اہم واقعات پر تو ہر کسی کی نظر جاتی ہے لیکن غیر اہم واقعہ یا غیر اہم کردار کو روشن کرنا اور منفی رویہ سے مثبت نقطہ نظر کو اپنانے کا عمل مزاحیہ کالم نگار کے یہاں ہوتا ہے۔

سید اقبال قادری کا کہنا ہے کہ ایک مزاحیہ کالم نگار کو موضوع کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اظہار کرنے کے لیے بہت زیادہ احتیاط برتنا پڑھتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> مزاحیہ کالم کے انتخاب میں زیادہ احتیاط برتنی ضروری ہے کیونکہ مزاح اور بیہودہ پن کے درمیان بہت ہی ہلکی لکیر ہوتی ہے۔ مزاح اگر ایک خاص سطح پر اور خاص حد کے اندر ہو تو گوارا اور تفریحی ہوتا ہے، اتفاق سے وہ شریفانہ سطح سے ذرہ بھر بھی ہٹ جائے تو وہ ناگوار اور سفلیہ ہوتا ہے۔ اردو کے کئی مزاحیہ کالم نویسیوں نے اردو مزاح نگاری کے چمنستان میں نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مزاحیہ کالم نگار کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کالم نویس کو زبان و بیان پر انتہائی عبور حال ہو۔ کلاسیکی اور جدید ادب کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہو اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ سنجیدہ بات کا مضحک پہلو بھانپ سکے۔ اس پر تبصرہ کرے لیکن مضحک پہلو بھانپ لینا مشکل ہے اور اس کے بعد اس کو نمایاں کرنے میں بھی طبعی میلان ضروری ہے یہ نہ ہو تو تصنع پیدا ہوگا اور تصنع مزاح کا قاتل ہے''۔[2]

---

[1] سید اقبال قاری، رہبر اخبار نویسی، ص: 318

[2] بحوالہ، پروفیسر محمد انورالدین، اردو صحافت نظریہ عمل، شعبہ فاصلاتی یونیورسٹی آف حیدآباد، ص: 293

مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ کالم نگاری کو اپنے اور عوام کے دکھوں کو چھپانے اور اجاگر کرنے کے علاوہ ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام کہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> پندرہ برس تک لگاتار مزاحیہ کالم نگاری کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کالم نگاری دراصل اپنے اور عوام کے دکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ چھپانے کبھی اسے اجاگر کرنے، درد کے چہرے پر خوشگواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام ہے۔[1]

اخبارات میں مزاحیہ کالم کی اہمیت وضرورت پر اظہار کرتے ہوئے سید اقبال قادری کہتے ہیں:

> ''چھوٹے اخبارات میں ایسے ہلکے پھلکے کالم ہوں جن سے قارئین کو ذرا ہنسی مذاق سے لطف ہونے کا موقع نصیب ہوجائے تو بہتر ہے۔ ہر معاشرہ میں۔ بخیل، شرابی، زندہ دل، پاگل، شاعر اور خبطی افراد ضرور ہوتے ہیں جن کی حرکات پر نظر رکھ کر دلچسپ تذکروں کا مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی فکاہیہ کالم تحریر ہوسکتا ہے۔ پرانے چٹکلوں کو نئے لباس میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ شائع ہونے والے کالموں کے مداح قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا ہے''۔ [2]

الغرض مزاحیہ کالم نگار اپنے اور عوام کے دکھ کبھی دکھاتا ہے تو کبھی چھپاتا ہے وہ بات سے بات پیدا کرکے الفاظ کی بازی گری سے قارئین کو خندہ زن کرتا چلا جاتا ہے فکاہیہ کالم کے ذریعۂ قارئین کو تفریح اور دلچسپی کا سامان بہم پہنچنے کا مقصد پورا کیا جاتا ہے۔ دنیا کے روکھے پھیکے، خشک اور سنجیدہ معاملات کو شگفتہ اور فنکارانہ طریقے سے پیش کرکے قارئین کی مسکراہٹوں کا سامان بھی کیا جاتا ہے۔ یہ تلخ اور ترش باتوں کے ذریعہ صرف دشمنی کو فروغ دینے کی بجائے گدگدیاں کرکے دوست بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ مزاحیہ

---

[1] بحوالہ، انور علی دہلوی، اردو صحافت، ص: 222

[2] سید اقبال قاری، رہبر اخبار نویسی، ص: 321

کلام کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ ہر موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ موضوع کے مثبت پہلو سے ہٹ کر منفی پہلوؤں کو کچھ اس طرح سے اجاگر کیا جاتا ہے کہ قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے تفریح بھی فراہم ہوتی ہے۔

اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی داغ بیل منشی سجاد حسین کے مشہور اخبار ''اودھ پنچ'' نے ڈالی۔ پہلی جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی کے بعد ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں ناامیدی اور مایوسی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس اداس ماحول کے بوجھل پن کو توڑنے کے لیے اردو مزاح نگاری نے اودھ پنچ کے ذریعہ ماحول کو زعفران زار بنانے کی بھرپور کوشش کی یہ نیا اسلوب ہندوستانیوں کو بہت پسند آیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے گوشے گوشے سے ''پنچ'' اخبار نکلنے لگے جیسے پنجاب پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ، کلکتہ پنچ، علی گڑھ پنچ، بنارس پنچ، شملہ پنچ، آگرہ پنچ اور دکن پنچ وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ''اودھ پنچ'' کے معیار کو نہ پہنچ سکا۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، ستم ظریف، اکبرالہ آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے مزاحیہ ادب کو ایک اعتبار بخشا مجتبیٰ حسین اردو میں مزاحیہ نگاری کے آغاز وارتقاء پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کم وبیش سو سال کے عرصہ میں اردو میں مزاحیہ کالم نگاری نے نہ صرف اپنی روایت کو مستحکم کیا ہے بلکہ نئی نئی جہتوں سے بھی آشنا ہوئی ہے۔ اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی داغ بیل منشی سجاد حسین کے ''اودھ پنچ'' نے ۱۸۷۷ء میں ڈالی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں ہندوستانی معاشرہ میں نہ جانے کونسے عوامل کارفرما ہوئے تھے کہ اچانک طنز و مزاح نگاروں کا ایک قافلہ سا نکل آیا ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں میں اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، رتن سرشار، مچھو بیگ، ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد اور اکبرالہ آبادی قابل ذکر ہیں۔ ان قد آور

> طنز ومزاح نگاروں نے صحیح معنوں میں اردو کے مزاحیہ ادب کو ایک اعتبار بخشا ''اودھ پنچ'' کے بعد ہندوستان کے گوشے گوشے سے ''پنچ'' نکلنے لگے۔ پنجاب پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ اور نہ جانے کتنے ہی ''پنچ'' نکلے مگر جو مقام ''اودھ پنچ'' کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آسکا ۳۶ برس تک ''اودھ پنچ'' نے اردو طنز ومزاح کے سرمایہ میں پیش بہا اضافے کیے۔ ان رسالوں کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف طنز مزاح کی اہمیت کو منوایا بلکہ بعد کے طنز نگاروں کو طنز کرنے کے ادب اور مزاح پیدا کرنے کا سلیقہ سکھایا۔

اودھ پنچ ایک ایسا اخبار تھا جس کے ذریعے ملک بھر میں ظرافت کا ذوق عام ہو دراصل یہ اخبار مشرقی ومغربی تہذیب کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے بعد ان کی تہذیب یہاں اپنے ہمہ رنگ پر پھیلائے کھڑی تھی اور ہمارے ''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں نے اپنے اپنے طنز وتنقید کی قینچیاں تیز کیے ان پروں کو کاٹنے میں مصروف تھے۔ اودھ پنچ مزاحیہ کالم نگاروں میں منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

منشی سجاد حسین اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے اس اخبار کی کامیابی ان ہی کی رہین منت ہے۔ اس اخبار میں ان کے طنزیہ ومزاحیہ کالم ''لوکل'' اور موافقت زمانہ'' کے عنوان سے مستقل شائع ہوتے تھے۔ ان کالموں میں سجاد حسین نے اپنے عہد کے حالات اور اہم واقعات پر طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف بھی اودھ پنچ کے اہم کالم نگار گذرے ہیں جو ظریف کے قلمی نام سے کلام لکھا کرتے تھے۔ انہیں محاورہ بندی پر بڑی دسترس تھی اپنی تحریروں میں بھی انہوں نے محاورات کا خوب استعمال کرتے ہوئے لکھنو کی عورتوں، نوابوں، وکیلوں وغیرہ کے حالات اور کارکردگیوں کو انہیں کی خاص زبان میں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔

---

[1] مجتبیٰ حسین، مزاحیہ کالم نگاری، مشمولہ، اردو صحافت، ص:223

تربھون ناتھ ہجر کا شمار بھی ''اودھ پنچ'' کے اہم کالم نگاروں میں ہوتا ہے ان کے کالم اپنے زمانے کی مخصوص شوخی اور ظرافت سے پر ہوتے تھے۔ظرافت ان کے مزاج کا ایک اٹوٹ حصہ تھی۔انہیں سرشار ثانی بھی کہا جاتا ہے۔کیوں کہ انہوں نے بھی سرشار کی طرح اہل لکھنو کی مذموم عادتوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جوالا پرشاد برق بھی اودھ پنچ کے ایک اہم کالم نگار گذرے ہیں یوں تو انہوں نے ایک مترجم کی حیثیت سے ادب میں نام کمایا ہے لیکن اپنے عہد کے اہم مسائل پر طنزیہ ومزاحیہ کالم بھی لکھے ہیں۔

اودھ پنچ کے کالم نگاروں میں ایک بڑا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا بھی ہے،ان کے کالموں میں طنز کی بہ نسبت مزاح کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ان کی تحریروں کو پڑھ کر قاری صرف ہنستا نہیں بلکہ قہقہے لگانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ان کیمزاحیہ تحریروں میں ہمیں مزاح نگاری کے تمام حربے ملتے ہیں جیسے لفظی الٹ پھیر، اردو فارسی کے بے میل الفاظ کا مضحکہ خیز استعمال،لطافت،حاضر جوابی،بذلہ سنجی،پھبتی اور ضلع جگت وغیرہ، سرشار کے رگ وپے میں لکھنو کی تہذیب اور لکھنو کی معاشرت سرایت کیے ہوئے تھی۔لکھنو کی ساری خرابیوں پر ان کی نظر ہوتی تھی جیسے افیون کی لت،بیڑی بازی کی لعنت،وقت برباد کرنے کے لیے طرح طرح کے کھیل کود وغیرہ کا سرشار نے اپنی تحریروں میں خوب مذاق اڑایا ہے۔اسی طرح اودھ پنچ کے دیگر قلم کاروں نے بھی اپنے عہد کی ناہموار صورت حال کی اصلاح کرنے کے لیے مزاحیہ کالم نگاری کا استعمال کیا ہے۔

اودھ پنچ کے قلم کاروں کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ''وہ ماحول پیدا کیا جو اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کو مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوا اس دور کے حالات اور اودھ پنچ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تہذیبوں کے خلاف ردعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ 1857ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کردی تھیں۔ سیاسی،سماجی اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔انتہاء پرستی

اپنے جوبن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہر شخص اس طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک
تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا..... چنانچہ اودھ پنچ نے اس قسم کی طوفانی دریا کو
کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی اور بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی
انتہائی کوشش کی اور اس دربار سے طنز وظرافت کی بے شمار چھوٹی نہریں نکال کر
اس کی طغیانی میں دھیما پن پیدا کرنے کا قابل رشک کام سرانجام دیا"۔ [1]

بیسویں صدی کے آغاز تک آتے آتے صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اردو میں نہ صرف طنزیہ ومزاحیہ رسالے نکلنے لگے تھے بلکہ ہر اخبار میں مزاحیہ کالم کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا۔ ان دنوں ملک کے سیاسی و سماجی حالات ایسے تھے کہ بہت سی باتوں کو راست طور پر بیان کرنے کی بجائے طنز ومزاح کے پیرائے میں بیان کرنا زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں ایسے ادیب بھی مزاحیہ کالم نگاری کی طرف مائل ہوئے جن کا طنز ومزاح سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ ان میں خواجہ حسن نظامی، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خاں، مولانا علی جوہر، قاضی عبدالغفار، عبدالماجد دریابادی، حاجی لق لق، شوکت تھانوی وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے فکاہیہ کالم نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔

خواجہ حسن نظامی کی طنز ومزاح کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریریں ہمیں ایک طرف اجڑے دلی کی کہانیوں سنا سنا کر رلاتی ہیں تو دوسری طرف معمولی معمولی چیزوں کے متعلق چند اہم نکات سے واقف کرا کر ہنساتی بھی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی عام طور پر کہانیوں اور علامتوں کے پردے میں نئی تہذیب اور اردگرد کی ناہمواریوں پر طنز کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر میں رعایت لفظی سے خوب کام لیتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے بعد اس دور کے ایک اہم کالم نگار عبدالمجید سالک ہیں۔

عبدالمجید سالک کا شمار اردو صحافت کے ان روشن چراغوں میں ہوتا ہے جنہوں نے سنجیدہ اخبارات میں فکاہی کالم کی ایسی مضبوط روایت قائم کی کہ آج تک اردو کے کئی اخبار اسی روایت کے پروردہ ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، ص:188

انہوں نے فکاہیہ کالم کا سلسلہ ''افکار وحوادث'' کے عنوان سے مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' سے 1923 ء میں شروع کیا تھا۔ 1927 ء میں انہوں نے اپنا اخبار ''انقلاب'' جاری کیا۔ اس میں بھی ان کے مذاحیہ کالموں کا سلسلہ بڑے تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ سالکؔ نے کم وبیش تیس برس تک ''افکار وحوادث'' کے ذریعہ مزاحیہ کالم نگاری کا ایک سنگ میل قائم کیا۔

عبدالمجید سالک کے بعد اردو کی فکاہیہ صحافت میں جس ادیب کا نام سب سے نمایاں ہے وہ چراغ حسن حسرت ہیں بقول ابنِ اسماعیل:

> ''اردو مزاحیہ ادب کے جدید دور آغاز چراغ حسن حسرت کے فکاہیہ ہفت روزہ شیرازہ سے ہوتا ہے''۔ [1]

شیرازہ میں اس زمانے کے تقریباً تمام اہم مزاح نگار لکھتے تھے۔ حسرت پہلے کلکتہ میں ''عصر جدید استقلال، نئی دنیا، وغیرہ میں کولمبس کے فرضی نام سے فکاہی کالم لکھتے رہے بعد میں مولانا ظفر علی خاں کے کہنے پر لاہور چلے گئے جہاں انہوں نے زمیندار'' شہباز، انصاف، پھول، تہذیب نسواں، احسان فوجی اخبار، امروز، پنچایت، مہاجر، اور نوائے وقت وغیرہ میں ''باغ و بہار''، ''فکاہات اور ''حرف حکایت'' وغیرہ کے مستقل عنوانات کے تحت مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ پھر اپنے پرچے ''شیرازہ'' میں مطائبات، کے تحت سندباد جہازی کے نام سے فکاہیہ کالم لکھنے لگے۔

حاجی لق لق کا شمار بھی اسی دور کے اہم کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے، زمیندار، صحافت، اور اپنے اخبار ''نوائے پاکستان'' میں فکاہیہ کالم لکھے، طبیعت میں مزاح کا ملکہ قدرتی طور پر موجود تھا۔ ان کے کالموں میں ان کے مزاح کی خوشگواری اور طنز کی سرشاری کا بہتر احساس نظر آتا ہے۔ شوکت تھانوی نے 1931 ء میں لکھنو سے ایک فکاہی رسالہ ''سرپنچ'' جاری کیا جس میں بے شمار فکاہیہ کالم لکھے۔ اپنے فکاہیہ کالموں میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کو نشانہ طنز بنایا ہے۔

---

[1] ابن اسماعیل، اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب، ص: 214

آزادی سے کچھ عرصہ پہلے اوراس کے بعد بھی مزاحیہ کالم نگاری کوفروغ حاصل ہوا۔اس اثناء میں جن ادیبوں نے مزاحیہ کالم نگاری میں انفرادی نقوش ثبت کیے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو،شوکت تھانوی، فکرتونسوی ،نصر اللہ خاں ابن انشاء،ابراہیم جلیس،احمد ندیم قاسمی، شاہد صدیقی،تخلص بھوپالی مجید لاہوری ، کنہیالال کپورنریش کمارشاد،خوشتر گرامی،حیات اللہ انصاری اوراحمد جمال پاشاہ،خواجہ احمد عباس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد بھی اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی روایت خاصی صحت منداورتوانا نظر آتی ہے خصوصاً پاکستان میں، ہندوستان میں اس روایت کے سب سے بڑے امین فکرتونسوی اورمجتبیٰ حسین ہیں جب کہ شاہد صدیقی ،خواجہ عبدالغفور، یوسف ناظم،ظ۔انصاری، دلیپ سنگھ،نریش کمارشاد،احمد جمال پاشاہ،تخلص بھوپالی،حیات اللہ انصاری،نصرت ظہیراورجعفرعباس وغیرہ بھی مزاحیہ کالم نگاری کی روایت کومستحکم بنایا۔

شاہد صدیقی نے روزنامہ سیاست میں شیشہ وتیشہ کے نام سےطنزیہ ومزاحیہ کالم لکھےان کی وفات کے بعد مجتبیٰ حسین نے تقریباًپندرہ برس تک یہ کالم لکھاان کے دہلی منتقل ہوجانے کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہوگیا۔لیکن ۱۹۹۵ء سے مجتبیٰ حسین دوبارہ روزنامہ سیاست کے ہفتہ وارادبی ایڈیشن میں ’’ہمارا کالم‘‘ کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھ رہے ہیں، اسی طرح حیات اللہ انصاری نے ’’قومی آواز لکھنو، میں ’’ گلوریاں‘‘ کے عنوان کے تحت ’’میزبان‘‘ کے قلمی نام سے مستقل مزاحیہ کالم لکھے بعد اذاں یہی کالم احمد جمال پاشاہ نے بھی لکھا،اسی اخبار کے ہفتہ وارادبی ایڈیشن میں دلیپ سنگھ نے بھی ’’گل گفت‘‘ کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھے۔

فکرتونسوی نے ’’اردواخبار’’ملاپ‘‘میں پیاز کے چھلکے‘‘ کے عنوان سےطنزیہ کالم لکھے یوسف ناظم انقلاب بمبئی میں ’’اتواریہ‘‘ کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے،اسی طرح جعفرعباس نے ’’نئی دنیا‘‘ دہلی میں مزاحیہ کالم لکھااورظ۔انصاری نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کچھطنزیہ ومزاحیہ کالم ادبی موضوعات پر

لکھے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد مزاحیہ کالم نگاری کو ہندوستان سے کہیں زیادہ پاکستان میں فروغ حاصل ہوا کیونکہ وہاں کے جبریہ سیاسی نظام کی وجہ سے کھل کر بات کہنے میں قید و بند کی صعوبتوں کا خطرہ تھا، اسی لیے ادیبوں اور دانشوروں نے حکومت کی پالیسیوں اور اعمال و حکام کی بے راہ رویوں پر طنزیہ و مزاحیہ کالموں کے توسط سے نہ صرف نکتہ چینی کی بلکہ اس کی مضحک صورتوں کو اجاگر کیا۔ پاکستان کے اخباروں میں شائع ہونے والے مزاحیہ کالم قارئین کی ذہنی تربیت کے علاوہ ان کی فکر و نظر کو روشنی بھی دی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے اخبارات و رسائل میں مزاحیہ کالم نگاری کو مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ پاکستان میں شوکت تھانوی ابراہیم جلیس مجید لاہوری اور ابن انشاء جیسے پرانے مشاق کالم نگاروں کے علاوہ نئے کالم نگار بھی اس میدان میں سرگرم رہے ہیں۔ جیسے انتظار حسین، مشفق خواجہ، منو بھائی، عطاالحق قاسمی، اختر امان، انجم اعظمی، شبنم رومانی، محسن بھوپالی، وغیرہ ان کالم نگاروں نے مزاحیہ کالم نگاری میں نہ صرف اپنی حیثیت منوالی ہے بلکہ ان میں بعض کالم نگار، مثلاً عطاء الحق قاسمی اور مشفق خواجہ نے ادبی کالم نگاری کو بام عروج تک پہنچادیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی گزشتہ تیس برس سے بھی زائد عرصے سے روزنامہ ''نوائے وقت اور جنگ'' میں کالم نگاری کررہے ہیں، انہوں نے اپنے کالموں میں ادب، صحافت، سیاست، مذہب اور فنون لطیفہ سے متعلقہ تقریباً ہر موضوع پر اپنے شوخ و شنگ اسلوب میں خامہ فرسائی کی ہے۔ اب تک عطاء الحق قاسمی کے کالموں کے کئی انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔

مشفق خواجہ بنیادی طور پر تحقیق اور تنقید کے آدمی ہیں لیکن اپنی اس تنقیدی بصیرت کو انہوں نے کمال ہنرمندی سے اپنے ادبی کالموں میں استعمال کیا ہے ان کی کالم نگاری کا سلسلہ 1970ء میں روزنامہ '' جسارت'' شروع ہوا۔ ان کے فکاہیہ کالم مختلف اخباروں میں مختلف عنوانات کے علاوہ مختلف فرضی ناموں سے شائع ہوتے رہے لیکن ان کا سب سے مشہور کالم ''سخن در سخن'' کے عنوان سے ''خامہ بگوش'' کے قلمی سے

شائع ہوتا تھا۔ان کے فکاہیہ کالموں کے موضوعات خالص ادبی ہیں۔انہوں نے ادب، ادیب، اور ادبی معاشرے کی ناہموار صورت حال ہی کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔بقول خلیق انجم:

> ''خامہ بگوش (مشفق خواجہ) اردو دنیا کے واحد کالم نگار ہیں، جن کے کالموں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے..... ہمیں کیا ہر ادیب کو رہتا ہے۔بشرط یہ کہ کالم اس پر نہ لکھا گیا ہو''۔[1]

پاکستان میں ایسے بے شمار کالم نگار گذرے ہیں جنہوں نے مزاحیہ کالم نگاری کو ایک وقار بخشا ہے اور آج بھی مزاح نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں بعض قلم کار کوشاں نظر آتے ہیں۔مجتبیٰ حسین ایک جگہ پاکستان میں مزاحیہ کالم نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں مزاحیہ کالم نگاری نہ صرف پروان چڑھی ہے بلکہ دن بدن ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔پاکستان کے سارے ہی اخبارات میں مزاحیہ کالم پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔اگر چہ اب وہاں بھی شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، مجید لاہوری، اور ابن انشاء جیسے پایہ کے کالم نگار نہیں رہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت کہ ان کی جگہ لینے کے لیے وہاں بہت سے نئے کالم نگار منظر عام پر آرہے ہیں۔نصر اللہ خان اور ندیم قاسمی تو خیر عرصہ سے لکھ رہے ہیں لیکن پاکستان آج کے کالم نگاروں میں مشفق خواجہ، انتظار حسین، منو بھائی، عطاء الحق قاسمی، اختر امان انجم اعظمی، انجم رومانی، محسن بھوپالی ایسے کالم نگار ہیں جنہوں نے مزاحیہ کالم نگاری کی روایت کو ایک نیا استحکام بخشا ہے''۔[2]

الغرض مزاحیہ کالم نگاری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو کالم نگاری کی، کیونکہ اردو کالم نگاری کی

---

[1] خلیق انجم، کچھ خامہ بگوش کے بارے میں مشمولہ کتاب نما دہلی، جولائی، 1995ء، ص:53

[2] بحوالہ مجتبیٰ حسین، مزاحیہ کالم نگاری، مشمولہ اردو صحافت، ص:226

ابتداء ہی مزاحیہ کالم نگاری سے ہوئی، اردو کالم کو فروغ دینے اور اسے مقبول بنانے میں مزاحیہ کالم نگاروں کا اہم رول رہا ہے اور آج بھی مزاحیہ کالم نگاری ہر اخبار کی زینت بنی ہوئی ہے موجودہ دور میں تقریباً ہر اخبار میں جو مزاحیہ کالم شائع ہوتا ہے۔ مزاحیہ کالم کی اسی اہمیت کے پیش نظر ابتداء سے لے کر آج تک قارئین اسے کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اردو میں مزاحیہ کالم کی مقبولیت واہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں بھی مزاحیہ کالم لکھے جانے کے امکانات روشن ہیں۔

***

باب چہارم

مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کا تعارف

مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کا تعارف

مشفق خواجہ کی طنز ومزاح نگاری کا آغاز ان کی کالم نگاری سے ہوتا ہے۔ان کی کالم نگاری کی ابتداء الطاف حسین قریشی کے روزنامہ ''جسارت'' کے اجراء سے ہوئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کے مطابق ''جسارت'' سے پہلے ان کی تحریریں ''اخبار جہاں'' کراچی میں شائع ہوئی تھیں جو کتابوں پر شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوا کرتے تھے۔ جب الطاف حسین قریشی کی نظریں ان شگفتہ تبصروں پر پڑیں تو انہوں نے مشفق خواجہ کو اپنے اخبار کے لیے باقاعدہ کالم لکھنے کی دعوت دی اور اس طرح ان کا پہلا کالم 15/نومبر 1970 کو روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں ''اندیشہ شہر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔اس کالم کے لیے انہوں نے قلمی نام ''غریب شہر'' اختیار کیا تھا۔

مشفق خواجہ نے 1971-72 تک روزنامہ ''زندگی'' میں بھی کالم لکھے پھر 1974ء میں روزنامہ ''صداقت'' کراچی سے منسلک ہو گئے۔ بعدازاں ہفت روزہ تکبیر میں کالم لکھنا شروع کیا۔تکبیر میں ان کے کالم ''سخن در سخن'' کے عنوان سے شائع ہوا کرتے تھے ''سخن در سخن'' کے لیے انہوں نے قلمی نام ''خامہ بگوش'' اختیار کیا تھا۔ہفت روزہ تکبیر میں ان کا پہلا کالم 23/مارچ 1984ء کو شائع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد سخن در سخن کا سلسلہ بند ہوا پھر ہفت روزہ تکبیر میں سخن در سخن کا دوسرا دور 31/مارچ 1994ء کو شروع ہوا اور یہ سلسلہ 1997ء تک چلتا رہا۔ مشفق خواجہ مختار الدین احمد کو ایک خط میں اپنی کالم نگاری کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آپ نے میری کالم نویسی کی تفصیلات دریافت کی ہیں تو عرض ہے کہ یہ کالم میں نے 15/نومبر 1970ء سے شروع کیا تھا۔الطاف حسین قریشی نے

کراچی روزنامہ ''جسارت'' جاری کیا تھا۔ 12/ اپریل 1971ء تک میں اس میں روزانہ ایک کالم ''اندیشہ شہر'' کے نام سے لکھتا رہا۔ پھر 1977ء اور 1978ء میں نو ماہ تک یہ کام کیا۔ پھر 1981 سے 1983ء تک 27 ماہ کالم لکھا۔ ''سخن در سخن (خامہ بگوش) کا سلسلہ ہفتہ وار تھا، جو 1982ء سے 1984ء کے شروع تک ''جسارت'' میں لکھا پھر 23 مارچ 1984ء سے تکبیر میں لکھ رہا ہوں 1971ء میں کچھ عرصہ ورق ناخواندہ اور خامہ بگوش کے نام سے ''زندگی'' میں کچھ کالم لکھے 1974ء میں روزنامہ صداقت کراچی میں سخن در سخن اور میر جملہ کے نام سے کالم نگاری کی''۔ [1]

غرض مشفق خواجہ نے مختلف اوقات میں مختلف اخبارات کے لیے کالم لکھے اور ہر اخبار میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف فرضی ناموں سے یہ کالم شائع ہوتے رہے لیکن ان کا سب سے مشہور کالم ''سخن در سخن'' ہے جو فرضی نام ''خامہ بگوش'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ یہ کالم اس دور میں اردو کا مقبول کالم کہلاتا تھا۔ اور اس زمانے میں یہ کالم کئی اخبارات ورسائل میں نقل ہوا کرتا تھا اور جس پرچہ میں اس کو نقل کیا جاتا اس پرچہ کی اشاعت دوگنا ہو جاتی تھی۔ قارئین اس کالم کو دیکھ کر ہی پرچہ خریدتے اور انہیں پڑھ کر داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ ابن الحسن عباسی کالم ''سخن در سخن'' کی مقبولیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ کالم اپنے زمانے میں اردو کا مقبول ترین کالم تھا اور اردو دنیا کے کئی اخبارات ورسائل میں شائع ہوا کرتا تھا جس پرچے میں ان کا کالم شائع ہوتا، اس پرچے کی اشاعت، دو تین گنا بڑھ جاتی ہماری طرح کئی قارئین اس کالم کو دیکھ کر ہی رسالہ خریدتے تھے۔ اس میں وہ کسی بڑے ادیب یا اس کی کتاب وتحریر

---

[1] مکتوب بنام مختار الدین احمد 23 مارچ بحوالہ فنون، لاہور شمارہ 126 صفحہ 37، مشمولہ ''سخن ہائے گستر انہ، مرتب ڈاکٹر انور سدید ص 14-15

کو لے کر اس پر تبصرہ کرتے اور خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں
چھپی ہوئی زبان و بیان کی خامیوں کو یوں اجاگر کرتے کہ نکتہ آفرینی پر انہیں بے
اختیار داد دینے کو جی چاہتا ان کا یہ کالم پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر صرف
مسکراہٹیں ہی نہیں بکھیرتا بلکہ انہیں کئی کتابوں کے تعارف کے ساتھ مذاق تحقیق
سے بھی آشنائی بخشتا۔ [1]

مشفق خواجہ نے اپنی کالم نگاری سے پوری ادبی دنیا کو متاثر کیا تھا۔ ان کی کالم نگاری مشکل موضوعات سے متعلق نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ادیبوں کو ان کی تحریروں اور انٹرویو اور ارشادات کے حوالے سے مزاح اور طنز کا نشانہ اس طرح بناتے تھے کہ ضرب کھانے والا بھی اس ضرب سے لطف اندوز ہو جاتا اور یہی ان کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کی انفرادیت تھی چنانچہ ممتاز احمد خان ان کے کالموں سے قارئین کی دلچسپی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''جس زمانے میں وہ کراچی کے ایک اخبار میں یہ ہفتہ وار کالم تحریر کرتے
تھے اس زمانے میں ہر شخص جمعہ کے دن ''خامہ بگوش کے قلم سے'' والا کالم پڑھنے
کے لیے بے چین ہوتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اب کس کی باری ہے'' [2]

مشفق خواجہ کے کالم کے موضوعات ادب، ادیب اور ادبی دنیا ہوتے تھے۔ دراصل یہی ان کی اپنی دنیا تھی۔ خالص ادبی ناہمواریوں کو ان سے پہلے کسی کالم نگار نے باقاعدہ موضوع نہیں بنایا تھا۔ ان کی کالم نگاری سے بیسویں صدی کے آخری ربع میں فکاہیہ کالم نگاری کی تاریخ میں ایک خوبصورت کالم نویس کا اضافہ ہوا اور اس طرح سے مشفق خواجہ نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کے ذریعہ بے پناہ شہرت حاصل کی۔ مشفق خواجہ نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنی کالم نگاری کی ابتداء کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ ابن الحسن عباسی، اردو زبان و ادب کی آبرو از، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص 145

۲۔ ممتاز احمد خان، مشفق خواجہ نگینہ شخص رخصت ہوا، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص 16

''کالم نگاری کا قصہ کچھ یوں ہے کہ میں بہت سی کتابیں پڑھتا تھا تو مجھے افسوس ہوتا تھا کہ ان میں فلاں بات نہیں ہے یا بہت سے علمی، ادبی مسائل ہوتے تھے جن پر اظہار خیال کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اب بہر حال اس کے ذریعے دو تھے کہ یا میں سنجیدہ نوع کالم لکھنا شروع کردوں یا پھر یہ انداز (طنز و مزاح) اختیار کروں، مجھے یہ انداز زیادہ پسند آیا کہ اس میں بات بھی کہہ دی جاتی ہے اور سننے والے کو ناگوار بھی نہیں گزرتی۔ میں نے بعض بہت ہی خراب کتابوں پر بھی کالم لکھے اور ان کے ان ہی پہلوؤں کو نمایاں کیا تو میرے یہ کالم ایک طرح سے تنقیدی کالم بھی ثابت ہوئے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے مذکورہ اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ادبی ناہمواریوں سے دل برداشتہ ہو کر ادب، ادیب اور ادبی دنیا کے مختلف مسائل کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن ان کے ان کالموں سے ادبی دنیا میں تنازعات بھی پیدا ہوئے۔ لوگوں نے اعتراضات بھی کیے غرض ان کی کالم نگاری سے ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا۔ مشفق خواجہ نے ان اعتراضات کے جواب میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''میں نے کبھی کسی کے بارے میں غلط بات نہیں لکھی، یعنی جو بات لکھی ہے، وہ دلائل کے ساتھ لکھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی کو ستانے کے لیے کوئی بات لکھی ہو، چھیڑ چھاڑ البتہ ہو سکتی ہے، میرے ہاں بہر حال آپ کو کسی کی تضحیک کا پہلو نہیں ملے گا بلکہ شاید آپ کو تعجب ہو کہ لوگ مجھ سے براہ راست رابطہ کرتے اور کہتے کہ خواجہ صاحب آپ خواہ خلاف لکھیے مگر لکھیے ضرور اور بعض لوگ تو اس پر ناراض بھی ہو گئے کہ میں نے ان پر نہیں لکھا اور میرے ایک دوست ہیں نظیر صدیقی، میں نے کوئی بیس کالم ان کے خلاف لکھے مگر وہ کبھی ناراض نہیں ہوئے میں لفظ خلاف استعمال کر رہا ہوں۔'' [2]

۱۔ انٹرویو: فیاض اعوان، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص 125۔

۲۔ انٹرویو: فیاض اعوان، مشمولہ، مشفق من خواجہ من ص 125

غرض مشفق خواجہ نے ادب، ادیب اور ادبی دنیا کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کے اس طنز ومزاح کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ ادب اور ادیب دونوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا اول وآخر مقصد رہا ہے ان کے کالموں کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں لکھتی ہیں:

> ''حقیقت میں وہ ادب لکھتے، پڑھتے اور سوچتے تھے اس کو بنانے سنوارنے کے لیے کوشاں رہتے ان کے سخت تنقیدی تبصرے تخلیق کاروں کو بھٹکنے سے بچاتے اور معاصر ادب کو جاننے میں معاون ثابت ہوتے تھے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اخبارات ورسائل کے لیے جو کالم لکھے وہ تمام کے تمام فرضی ناموں سے لکھے ہیں۔ جسارت میں فرضی نام ''غریب شہر''، ''سخن در سخن'' اور ''تکبیر''، کے لیے ''خامہ بگوش''، ''زندگی'' اور صداقت کے لیے خامہ بگوش، میر جملہ کے فرضی نام سے لکھتے رہے۔ ایک انٹرویو میں مشفق خواجہ سے کالم خامہ بگوش کے قلمی نام سے لکھنے کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا:

> ''خامہ بگوش کے نام سے کالم نگاری کی وجہ یہ تھی کہ میں کالم نویسی کو تفریح سمجھتا ہوں''۔ [2]

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ کا مقصد کالم نگاری کے ذریعہ شہرت حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے اپنے طنز ومزاح کے اثرات دیکھنے کے لیے اصل نام کی بجائے فرضی ناموں کا استعمال کیا۔ ایک اور جگہ مشفق خواجہ فرضی نام کے استعمال کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''قلمی نام اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طنز ومزاح کے کالم میں بعض غلط چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اصل نام سے لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا لکھا گیا بلکہ اس پر توجہ دینے لگتے کہ کس

۱۔ ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں، ایک گوشہ نشین عالم، مشمولہ، مشفق من خواجہ من حق، ص 179

۲۔ شخصی انٹرویو، فیاض اعوان، مشمولہ: مشفق من خواجہ من، ص 126

نے کیا لکھا ہے چونکہ میرے پیش نظر مقصد اہم تھا اس لیے میں نے فرضی نام
اختیار کرلیا۔اب یہ میری بدقسمتی ہے کہ کالموں کی اشاعت کے بعد لوگ اس
تحقیق میں پڑ گئے کہ لکھنے والا کون ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے کالم ''سخن در سخن'' کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک فرضی کردار استاد ''لاغر مرادآبادی'' کے نام سے ہے، مشفق خواجہ جب کسی ناہموار صورت حال کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔تب وہ اس فرضی کردار کا سہارا لیتے ہیں۔ان کا یہ فرضی کردار ان کے کالموں میں مشیر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے ہر جملہ میں طنز کی گہری کاٹ کا احساس ہوتا ہے۔سید قاسم محمد کے مطابق مشفق خواجہ نے 1971ء سے 1997ء تک مختلف اخبارات ورسائل میں دو ہزار سے زائد کالم لکھے ہیں۔

مشفق خواجہ کم وبیش 26 سال تک مختلف اخبارات ورسائل میں کالم لکھتے رہے اور 1997ء میں مکمل طور پر کالم نگاری سے دست بردار ہوئے۔دراصل وہ کالم نگاری کو اپنی پہچان نہیں بنانا چاہتے تھے۔اس بات کا ذکر انہوں نے مختار الدین احمد کے نام ایک خط میں کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''غرض یہ کہ اس کام میں خاصا وقت صرف کیا۔سچی بات یہ ہے کہ اس کام
میں کبھی دل نہیں لگا۔جب کبھی لکھا، اپنی طبیعت پر جبر کے لکھا۔مجھ سے فرمائش پر
کچھ نہیں لکھا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ بار بار میں اس کام کو چھوڑتا رہا مگر تقاضوں
سے مجبور ہو کر دوبارہ شروع بھی کرتا رہا۔میں کسی طرح نہیں چاہتا کہ یہ کام میری
پہچان بنے''۔ [2]

مشفق خواجہ کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کے اب تک پانچ انتخابات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

---

[1] انوار سدید، عرض سدید، مشمولہ سخن ہائے گسترانہ، ص 16

[2] مکتوب بنام مختار الدین احمد 23 مارچ 1990ء مشمولہ سخن ہائے گسترانہ، ص:5

1۔خامہ بگوش کے قلم سے:

یہ ان کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا پہلا انتخاب ہے یہ انتخاب پہلی مرتبہ کراچی اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی سے بیک وقت فروری 1995ء میں شائع ہوا اور اس انتخاب کو اردو کے نامور نقاد مظفر علی سید نے مرتب کیا ہے۔اس انتخاب کا دوسرا ایڈیشن 2007ء پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ یہ انتخاب کل 335 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 60 کالم اور ایک ''غلط نامہ'' کے عنوان سے مشفق خواجہ کا دیباچہ شامل ہے۔اس انتخاب میں 1983ء تا 1990ء تک کے منتخب کالم موجود ہیں۔

2۔سخن ہائے ناگفتنی:

یہ ان کے کالموں کا دوسرا انتخاب ہے۔ یہ پہلی بار اکادمی بازیافت کراچی سے اپریل 2004ء میں شائع ہوا اس انتخاب کو بھی مظفر علی سید نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب کل 208 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 35 کالم اور ایک مظفر علی سید کا دیباچہ شامل ہے اس کتاب کا انتساب مجتبیٰ حسین کے نام ہے۔

3۔سخن در سخن:

''سخن در سخن''، مشفق خواجہ کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا تیسرا انتخاب ہے۔اس انتخاب کو بھی مظفر علی سید نے ہی مرتب کیا ہے اس کی اشاعت بھی پہلی بار اپریل 2004ء کو اکادمی بازیافت کراچی سے ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب مشہور مزاح نگار یوسف ناظم کے نام ہے۔اس انتخاب میں کل 34 کالم ہیں اور اس کا دیباچہ مظفر علی سید نے لکھا ہے اور یہ انتخاب کل 232 صفحات پر مشتمل ہے۔

4۔سخن ہائے گسترانہ:

مشفق خواجہ کے منتخب کالموں کا یہ چوتھا مجموعہ پہلی بار 2007ء کو فضلی سنز (پرائیوٹ) لمٹیڈ کراچی سے شائع ہوا۔اس مجموعہ کو انور سدید نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ 359 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 80

کالم اور ''عرضِ سدید'' کے عنوان سے انوار سدید کا دیباچہ بھی شامل ہے۔اس کتاب کا انتساب یوں ہے ''مشفق خواجہ مرحوم کے بھتیجے ڈاکٹر خواجہ خسرو طارق اور خواجہ خرم طارق کی بیٹی صبا خرم کے نام جن سے مرحوم بے انتہا محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے تھے''۔

5۔ جوش اور خامہ بگوش:

مشفق خواجہ کے کالموں کا پانچواں انتخاب جوش اور خامہ بگوش کے عنوان سے ہے۔جس کو ان کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے مرتب کیا ہے۔ یہ انتخاب فضلی سنز (پرائیویٹ لمٹیڈ کراچی) سے شائع ہوا ہے اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔اس مجموعہ میں صرف انہی کالموں کو منتخب کیا گیا ہے جو جوشؔ ملیح آبادی سے متعلق ہیں۔اس کے علاوہ اس میں خواجہ عبدالرحمٰن طارق کا ایک مضمون ''دنیائے ادب کا مشفق خواجہ اور مرے حیٔ بھائی جان'' کے عنوان سے بھی شامل ہے جس میں انہوں نے مشفق خواجہ کے سوانحی حالات کو قلم بند کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جوش سے متعلق مذکورہ بالا 17 کالموں کے علاوہ ان کے نام جوش کا لکھا خط بھی موجود ہے اور کتاب کے آخر میں جوش اور خامہ بگوش کے عنوان سے مشفق خواجہ کی بیاض کا وہ حصہ بھی نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے جوش کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ یہ کتاب کل 127 صفحات پر مشتمل ہے۔

مشفق خواجہ اعلیٰ پایہ کے محقق، شاعر، مزاح نگار، کالم نگار ہونے کے باوجود ایک گوشہ نشین زندگی گذاری انہیں نام ونمود شہرت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔جس کا احساس خود مشفق خواجہ کو بھی تھا۔انہوں نے ایک مرتبہ مجتبیٰ حسین سے ہم کلام ہوتے ہوئے اپنے اس احساس کا اظہار کیا تھا جس کا ذکر مجتبیٰ حسین نے اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

> ''میں نے کہا ''خواجہ صاحب! یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنے اصل نام سے مزاح نگاری نہیں کرتے ''بولے'' بھئی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب صرف

مزاح نگاری کرنی چاہیے ہندوستان میں میری شہرت مزاح نگار کی حیثیت سے
ہے اتنا تحقیقی کام کیا۔شعر کہے۔کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ہر جگہ میرے فرضی نام
سے لکھے ہوئے کالموں کا ذکر ہوتا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے کالموں کی تین اہم خصوصیات ہیں جیسے موضوعات، مقاصد اور اسلوب۔ان کے کالموں کے موضوعات ادب،ادیب اور ادبی دنیا کی ناہموار صورتِ حال ہے۔ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ان کے کالموں کو جو مقصد ہوتا تھا وہ ادبی دنیا میں جو خرابیاں اور کمزوریاں در آئی ہیں انھیں دور کیا جائے وہ اردو ادب اور اردو داں طبقے میں جو کمیاں آ گئی تھیں ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔اسی مقصد کے تحت انھوں نے کالم نگاری کی طرف توجہ کی۔

ان کے کالم اردو کالم نویسی کی تاریخ میں موضوعات کے سلسلے میں جدّت پسندی کے حامل ہیں۔ انہوں نے پیشہ ور کالم نویسوں کی طرح کسی سماجی وسیاسی مسائل کو اپنے کالموں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کے کالم ادب،ادیب،اور ادبی ناہمواریوں کا احاطہ کرتے ہیں خالص ادبی ناہمواریوں کو ان سے پہلے کسی کالم نگار نے با قاعدہ موضوع نہیں بنایا تھا۔ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں ان کے کالموں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''بیسویں صدی کے آخری ربع میں فکاہیہ کالم نگاری کی تاریخ میں ایک
خوبصورت کالم نویس کا اضافہ ہوا۔''سخن در سخن'' کے عنوان سے مشفق خواجہ نے
لکھنا شروع کیا۔ان کا موضوع ادب،ادیب اور ادبی دنیا تھا۔کیوں کہ دراصل
یہی ان کی اپنی دنیا تھی خالص ادبی ناہمواریوں کو ان سے پہلے کسی کالم نگار نے
با قاعدہ موضوع نہیں بنایا''۔ [2]

مشفق خواجہ نے ادب کی ناہموار صورت حال کو نہ صرف موضوع بنایا ہے بلکہ وہ اس ناہموار صورت

---

[1] مجتبیٰ حسین، ''قطع کلام''،ص 145

[2] ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں ''مشفق خواجہ۔ایک گوشہ نشین عالم''،مشمولہ''مشفق من خواجہ من ص:178

حال سے ادب کے عام قاری کو بھی واقف کرواتے ہیں۔ ادب کی صورت حال کے ساتھ ساتھ ادیبوں و شاعروں کے خیالات ونظریات سے بھی آگاہ کرواتے ہیں۔ وہ قاری کو ادبی دنیا کی بگڑی صورتحال سے اس سادگی، معصومیت اور شائستگی سے آگاہ کرواتے ہیں کہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے اور ادیب اپنی غلطیوں پر نادم ہو جاتے ہیں۔

ادب سماج کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کا مصلح بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ رہی کہ مشفق خواجہ نے ایک ذمہ دار ادیب کی حیثیت سے سماج کو سدھارنے کے لیے پہلے ادب کو سدھارنا ضروری سمجھا ادب میں راہ پا گئی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ادیبوں اور شاعروں کی اصلاح کو بھی انھوں نے ضروری خیال کیا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے انھوں نے مختلف عنوانات کے ذریعے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ مجتبیٰ حسین ان کے کالموں کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''خامہ بگوش کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف ادبی موضوعات پر ہی کالم لکھتے ہیں اور کالم لکھتے وقت کسی مصلحت کے شکار نہیں ہوتے ادب، سماج کو سدھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن جب تک خود ادب کا سدھار نہ ہو تب تک وہ سماج کو کیسے سدھار سکتا ہے، اس لیے خامہ بگوش نے اپنی ساری توجہ ادب کو سدھارنے پر مرکوز کر رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ادیب اور شاعر حضرات پہلے تو ان سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں یہ ان کے بارے میں کالم نہ لکھ دیں مگر جب یہ لکھ دیتے ہیں تو اس کالم کو لیے لیے ہر جگہ جاتے ہیں کہ دیکھو خامہ بگوش نے ہمارے بارے میں کالم لکھا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ نے ادب یا اہل ادب کی اصلاح کے لیے اپنے کالموں میں جن واقعات اور مباحثوں سے کام لیتے ہیں اس سے ہماری ادبی سرگرمیوں کا مکمل انداز ہوتا ہے ان واقعات اور مباحثوں میں کوئی چیز

---

[1] مجتبیٰ حسین، ''ایک کالم خامہ بگوش کے کالموں کے لیے'' ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی جولائی ۱۹۹۵ء، ص: ۷۷

ہمیں غیر ضروری محسوس نہیں ہوتی ظاہری طور پر زیر مباحثہ موضوع وقتی ہوتا ہے۔لیکن بعد میں وہ مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

مشفق خواجہ نے ادب کی ناہموار صورت حال کی اصلاح کرنے کے لیے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اُن میں کتابوں کی رسم اجراء، اپنے بارے میں توضیح مضامین لکھانا انعام وشہرت کے لیے دوڑ دھوپ کرنا، ادبی جشن منانا اور ادب کے نام پر ایسی محفلیں آراستہ کرنا جو غیر ادبی ہو غرض اس طرح کے بے شمار موضوعات ہیں جو موجودہ عہد میں ادبی دنیا میں مستقل اور مرکزی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

> ''کچھ موضوعات اور رویے ان کی تحریروں میں ایک مستقل اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر کتاب چھپوانے کے بعد اس کے اجراء کی تقریب کا اہتمام کرنا، مار باندھ کر اپنے بارے میں مضمون لکھوانا، اپنے لکھے پر اترانا، انعام اور شہرت کے پھیر میں دوڑ دھوپ اور لابلینگ کرنا، جشن منانا اور ایسی محفلیں آراستہ کرنا جن کے مقاصد غیر ادبی، غیر شریفانہ اور محض کاروباری ہو، خامہ بگوش کو اس قسم کا ماحول پیدا کرنے والوں سے مطلق ہمدردی نہیں ہے اور ان پر لکھتے وقت کبھی کبھار ان کے قلم میں نوک سنان کی کیفیت اور طبیعت میں جھلاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔اسی طرح موضوعات کے اعتبار سے خامہ بگوش کے کچھ Obsessions ہیں۔ان میں اصناف بھی ہیں، مثال کے طور پر انشائیہ اور نثری نظم، اور اشخاص بھی ہیں''۔[1]

ادیب دراصل معاشرے کا سب سے حساس شخص ہوتا ہے اور اس کا حساس ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ سماج کا ایک ذمہ دار شخص بھی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ جب معاشرے میں کوئی ناہموار صورت حال پیدا ہو تو وہ سماج کو اس سے آگاہ کریں اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں لیکن موجودہ

---

[1] از شمیم حنفی، کالم خامہ بگوش کے قلم سے، ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی جولائی ۱۹۹۵ء، ص:58

معاشرے میں ادیب اس ذمہ داری کو فراموش کر چکے ہیں۔ وہ معاشرے کے دکھ و درد میں خود کو شامل کرنے کی بجائے مفاہمت اور منفعت پسندی کا شکار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے ادیب کے اس رویے کی اپنے کالموں میں طنز و مزاح کے پیرائے میں خوب مذمت کی ہے اور ادبی دنیا اور ادیبوں میں آئی ان خرابیوں کی اصلاح کی کرنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر انوار سدید ان کے کالموں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ ہمارے عہد کے واحد ادیب تھے، جنہوں نے ادب، ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ مجھے اس کی وجہ (جو میں نے مشفق خواجہ سے ملاقاتوں کے دوران اخذ کی) یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ادیب کو معاشرے کا احساس ترین فرد تصور کرتے تھے۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے۔ معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو، ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہے اور نظم، غزل یا افسانہ لکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کا ادیب دکھ کو اپنے اوپر وارد کرنے اور ذہنی کشمکش سے گذرنے کی بجائے مفاہمت مصلحت اور سہل نگاری کا شکار ہے، مقصد پرست اور منفعت پسند ہے اور در شہرت پر ہر وقت دستک دیتا رہتا ہے۔ ادبی فضا کے اس تکدر نے نہ صرف مشفق خواجہ کو غمزدہ کر دیا، بلکہ ادبی معاشرے کی ناہمواریوں اور ادبا کی بوالعجبیوں کا احساس بھی دلایا تو ان کے کالموں میں ایسی طنز لطیف پیدا ہو گئی۔ جو کبھی نوکِ خار بن جاتی، کبھی پھولوں کی چھڑی بن کر ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کرتی اور کبھی یہ اتنی شفاف ہو جاتی کہ موضوع کی تہہ میں بیٹھی ہوئی کثافت بھی قاری کو نظر آنے لگتی''۔ [1]

---

[1] انور سدید، عرض سدید، مشمولہ ''سخن ہائے گسترانہ''۔ ص:20

مشفق خواجہ نے ادب کی ناہموار صورت کی اصلاح کرتے ہوئے جن کتابوں اور علمی و ادبی شخصیتوں پر تنقیدی تبصرے کے ہیں ان میں کہیں بھی ذاتی طور پر کسی بھی امر کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا اگر کہنا بھی ہوتا تو اس نفاست سے کہا ہے کہ سننے والا نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لے گا۔ یوسف ناظم مشفق خواجہ کی تحریروں کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''خامہ بگوش کتابوں اور علمی و ادبی شخصیتوں پر تبصرہ و تنقید کرتے وقت بطور اصول ذاتی حملوں سے احتراز کرتے ہیں لیکن بین السطور میں بڑی نفاست کے ساتھ ایسے جملے لکھ جاتے ہیں جو کم از کم متعلقہ ادیب یا شاعر کے دل میں ایسے نشتر بن کر اتر جاتے ہیں۔ کہ عمر بھر کی بے قراری کے بعد بھی قرار نہیں آتا''۔[1]

مشفق خواجہ نے ادب کی موجودہ ناہموار صورتِ حال کی اصلاح میں کچھ بڑے برے ادیبوں کو ان کے چھوٹے پن کا احساس بھی دلایا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں ہر ادیب اپنے کو دوسرے سے بہتر یا اعلیٰ سمجھنے لگا ہے جو ہمارے ادبی معاشرے کی ایک بڑی خامی ہے مشفق خواجہ نے ہمارے ادبی معاشرے کی اس خامی کو دور کر کے اس کو درست کرنا چاہا ہے، چنانچہ محمود ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں ہمارے اس عہد کے ادبی معاشرے کی اصلاح کے لیے خامہ بگوش (مشفق خواجہ) جیسے قلم کار کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس عہد کو خامہ بگوش کی ضرورت ہے تبھی ہمارا، ادبی معاشرہ کچھ درست ہو سکتا ہے ورنہ یہاں ہر شخص ارسطو اور افلاطون کی ہمسری کا دعوے دار ہے، اور ہر شخص کے لیے (ہر ادیب اور ناقد کے لیے) ایک ایک خامہ بگوش کی ضرورت ہے''۔ [2]

---

[1] بحوالہ یوسف ناظم، شخصیت، خامہ بگوش، ''ماہنامہ، کتاب نما دہلی مئی ۲۰۰۵ء، ص: ۵۳

[2] بحوالہ محمود ہاشمی، شخصیت، خامہ بگوش، ''ماہنامہ، کتاب نما دہلی جولائی ۱۹۹۵ء، ص: ۷۵

مشفق خواجہ کے کالموں کی ایک اور اہم خصوصیات ظریفانہ تنقید ہے ان کے کالموں میں اعلیٰ تنقید کے تمام اجزاء پائے جاتے ہیں جیسے غیر جانبداری، حقیقت پسندی، تحقیق کی روشنی میں خامیوں اور خوبیوں کا یکساں محاسبہ کرنا وغیرہ اور تنقید کا یہ سارا کام وہ ظریفانہ اسلوب میں کرتے ہیں تا کہ قاری طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ فن پارے کے تنقیدی محاسبوں سے بھی واقف ہو جائے، چنانچہ قاری ان کے کالموں کے ذریعہ بیک وقت تنقید اور ظرافت دونوں سے محظوظ ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ کا انداز بعض کالموں میں جارحانہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ کالم عالمانہ اور عارفانہ بصیرت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اپنے عمیق مشاہدے کی بنا پر انہوں نے ان کالموں کے ذریعہ ایک باشعور نقاد کا کام انجام دیا ہے ان کے کالموں میں طنز و مزاح کے ساتھ تنقید نگاری کی جو خصوصیت نظر آتی ہے اس کو سراہتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''خامہ بگوش نے اپنے گہرے طنز کے ذریعہ ادب کے بڑے لوگوں کو ان کا چھوٹا پن دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا کالم جارحانہ ضرور ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ عالمانہ اور عارفانہ بھی ہوتا ہے۔ خامہ بگوش خود مایہ ناز محقق اور ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع، نظر بہت عمیق اور مشاہدہ نہایت تیز ہے۔ جو کام ہمارے ادب کے ناقدوں کو انجام دینا چاہیے تھا وہ کام اب خامہ بگوش اپنے طنز کے ذریعہ انجام دے رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ اپنے زیر مطالعہ ادب پاروں پر کچھ ایسے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں ایک نظر میں سامنے آجاتی ہیں اس کے لیے طویل بحثوں سے گریز کرتے ہوئے ایک دو پیراگراف میں ہی ادب پارے کا تجزیہ کر ڈالتے ہیں۔ اور اس اختصار کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے

---

[1] بحوالہ ''ماہنامہ، کتاب نما دہلی جولائی، ۱۹۹۵ء ایک کالم خامہ بگوش کے کالموں کے لیے، از مجتبیٰ حسین، ص: ۷۸

ہیں کہ ان کا مطمع نظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ان کے کالموں کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر محمد سلیم نے انہیں ایک صاحب طرز نقاد قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنے کالموں میں ایک صاحب طرز نقاد کا رول بھی ادا کرتے تھے اور ایک دو پیراگراف میں کسی بھی ادیب نقاد اور شاعر کی نگارشات کا تجزیہ کر ڈالتے''۔[1]

مشفق خواجہ کی تنقید روایتی سرسری انداز کی نہیں ہوتی وہ کسی بھی فن پارے کی تنقیدی تلخیص پیش کرنے سے پہلے اس فن پارے کا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں جو ایک سنجیدہ اور ذمہ دار نقاد کے لیے بے حد ضروری ہوتا ہے غرض ان کی تنقید کی اس خصوصیات کی بناء پر مظفر علی سید نے انہیں اردو زبان و ادب کا ایک ذمہ دار نقاد قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

> ''اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی بھی معروف نقاد کی بہ نسبت کسی بھی تازہ کتاب کا مطالعہ کہیں زیادہ توجہ اور تفصیل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ نقاد لوگ پڑھتے وڑھتے بالکل نہیں تو زیادہ تر درست معلوم ہوتا ہے پھر بھی، خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کو ایک سنجیدہ اور ذمے دار نقاد قرار دے کر انہیں اردو زبان کے ممتاز ناقدین کی مشہور یا بدنام زمانہ برادری میں شامل کرنا ان کی تمام غیر سنجیدگیو اور غیر ذمہ داریوں کے ہوتے ہوئے، ناقدین کے علاوہ خود ان کے ساتھ بھی بے انصافی ہوگا''۔ [2]

مشفق خواجہ کے کالم پڑھتے وقت ایک قاری بیک وقت تنقید اور ظرافت کا مزا لیتا ہے دراصل مشفق خواجہ کا یہ تنقیدی طریقہ کار ادبی تنقید میں ایک نئے ذائقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔موجودہ عہد میں ادب کو ادیب ذاتی تشریح کا ذریعہ بنائے رکھا ہے ہر ادیب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں لگا ہوا ہے جس کی

---

[1] بحوالہ محمد سلیم، محقق اور صاحب طرز ادیب، مشفق خواجہ، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص:133

[2] بحوالہ مظفر علی سید، ''دیباچہ''سخن ہائے ناگفتنی''، ص:۱۵

وجہ سے ادیبوں کی تحریروں کے علاوہ ان کی شخصیت بھی بڑی مضحکہ خیز ہوگئی ہے، جس کے نتیجہ میں ادب سے شفاف اور حقیقی سرچشموں کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ اگر ایسے ادبی معاشرے کو تنقید کا نشانا بنانا ہے تو ظریفانہ تنقید کا روایہ اختیار کرنا ہی بہتر ہوگا کیونکہ اس سے اصلاح بھی ہوگی اور ظرافت سے لطف بھی اٹھایا جائے گا۔ چنانچہ محمود ہاشمی ان کے کالموں کی اس سنجیدہ ادبی فکر اور تنقید کے اس نئے ذائقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''خامہ بگوش، (مشفق خواجہ) کے کالم برصغیر میں بے حد مقبول ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس پردہ زنگاری میں ''خامہ بگوش'' اپنے عہد کے ادیبوں، ان کی تحریروں اور ان کے بیانات کا محاسبہ کرتے ہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ کالم ادبی تنقید میں ایک نئے ذائقہ دار طرز فکر کے غماز ہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ سنجیدہ ادبی فکر اور تنقید کے ساتھ اس طرز نگارش کی ضرورت ان دنوں بہت زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے عہد کے ادیب، شاعر، نقاد اپنی انانیت، انفرادیت کے واہمہ اور غیر معمولی خود ساختہ آزادی کے ذریعہ ادبی معاشرے کو کچھ اس طرح گدلا کر رہے ہیں کہ شفاف اور حقیقی سرچشموں کا کہیں دور تک نام ونشان نہیں ہے لوگوں کو (یا ادیبوں کو) لکھنے کی آزادی ہے اس آزادی کا استعمال وہ یا تو گمراہ کن رویوں کے ذریعہ یا پھر خود اپنی شخصیت اور فن کی تشہیر میں کرتے ہیں۔ اس عمل میں خود ان کی اپنی شخصیت اور اپنی تحریر اتنی مضحکہ خیز بن جاتی ہے کہ اگر خامہ بگوش جیسے لکھنے والے اس کی وضاحت کردیں تو خامہ بگوش پر طنز و مزاح کا الزام عائد ہوتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے''۔

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں جس انداز سے کسی فن پارے کی تنقیدی تلخیص پیش کرتے ہیں اس کو پڑھ کر ایک عام قاری اصل کتاب سے رجوع ہونے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک اچھی تنقید کی خصوصیت ہوتی

---

[1] محمود ہاشمی، ''خامہ بگوش'' از، ماہنامہ، کتاب نما، نئی دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء، ص:۴۷

ہے کہ قاری کے دل میں کتاب کو پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو۔

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں ادیبوں کی خودنمائی، خودفروشی، جھوٹ، نقلی، سرقہ نویسی وغیرہ ناشائستہ رویوں کو ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ہدف نہیں بنایا بلکہ ادیبوں کے ان غیر اخلاقی افعال کو طنز ومزاح کے پیرائے میں ایک ادب کے سنجیدہ نقاد کی طرح تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ان کے کالموں کے اس خصوصایت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے لکھتے ہیں:

> ''وہ ادب میں ہر چیز کو برداشت کر سکتے ہیں، لیکن خودنمائی، خودفروشی اور اتھلے پن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح محض ''زبان'' کے نام پر برتری جتانے والے بھی ان سے داد وتحسین پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ جھوٹے، نقلی اور ''نان سنیس'' ادیبوں، سرقے کے مرتکب سفرنامہ نگاروں اور اس قبیل کے petty تنقید نگاروں کو معاف کرنا ان کے مسلک میں جائز نہیں..... وہ یہ سب کچھ ایسے انداز میں کرتے ہیں جو انہی سے مخصوص نظر آتا ہے..... یہ سب کچھ وہ ادب کے سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ محض طنز ومزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں''۔ [1]

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں ادب، ادبی اصناف اور ادیبوں کی ادبی خدمات اور ادبی نگارشات پر مسلسل تبصرے کیے ہیں ان کے تبصروں سے بقول محمود ہاشمی تبصرہ نگاری میں محاسباتی تبصروں کی ایک نئی روایت قائم ہوئی ہے۔

مشفق خواجہ کے کالموں کے ذریعہ شگفتہ تبصرہ نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے تنویر حسین نے شگفتہ تبصرہ نگاری میں پطرس بخاری کو ان کا پیش رو قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''شگفتہ تبصرہ نگاری میں مشفق خوجہ کے پیش رو پطرس بخاری تھے۔ مشفق خواجہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے یہ روایت بھی ختم ہوتی دکھائی دے رہی

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر اسلم انصاری، مشمولہ: سخن ھائے گسترانہ، ص:۲۱

ہے۔اب لوگ اپنی تعریفوں کے آئینے میں اپنی پسندیدہ صورت دیکھتے ہیں''۔

[1]

مشفق خواجہ کے کالموں کا اسلوب طنزیہ ومزاحیہ ہے اردو میں کالم نگاری کی ابتداء دراصل کالموں مزاحیہ نگاری سے ہی ہوتی ہے۔ اردو کالم کوفروغ دینے میں مزاح نگاروں کا اہم رول رہا ہے۔اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی داغ بیل منشی سجاد حسین کے اخبار''اودھ پنچ'' کے ذریعہ ۱۸۷۷ء میں ڈالی تھی، اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں اس کے مدیر منشی سجاد حسین کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ، محمود بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، وغیرہ، قابل ذکر ہیں۔ان قد آور طنز ومزاح نگاروں نے صحیح معنوں میں اردو کے مزاحیہ ادب کوایک اعتبار بخشا، بیسویں صدی کے اوائل میں، منٹو، فکرتونسوی، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، ملارموزی، احمد ندیم قاسمی، مجید لاہوری، خواجہ احمد عباس اور کنھیالال کپور وغیرہ نے مزاحیہ کالم نگاری کو فروغ دیا قیام پاکستان کے بعد یا پاکستان میں، انتظار حسین، منٹو، انجم اعظمی، عبدالمجید سالک، مشفق خواجہ جیسے قابل ذکر کالم نگاروں نے پاکستان میں مزاحیہ کالم نگاری کی روایت کوایک نیا استحکام بخشا ہے۔

مشفق خواجہ کے کالموں میں شگفتگی اور تازگی کا عنصر نمایاں ہے اشعار کا برمحل استعمال، ضرب الامثال اور نادر تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں وہ بات سے بات پیدا کرنے کے فن سے خوب واقف تھے ڈاکٹر روبیہ شاہجہاں ان کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتی ہیں:

> ''فنی لحاظ سے ان کے کالم اسلوب کی شگفتگی اور تازگی کا نمونہ ہیں ان کا ایک ایک جملہ معنوی وسعت کا حامل ہے، وہ مختصراً مگر جامع لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں جاندار اسلوب کو بڑا دخل تھا۔وہ فنکار کی توصیف سے بات شروع کرتے اور پھر آہستہ آہستہ جملوں کی بنت اور ساخت نیا روپ اختیار کر لیتی اور ہجویہ حصہ شروع ہو جاتا۔اور قاری اس گریز کو سمجھتے سمجھتے

---

[1] بحوالہ محمد اقبال جاوید ''اٹھ گیا ناوک فگن''، مشمولہ، مشفق من خواجہ من، ص:29

کسی اور جہاں میں پہنچ جاتا۔امیر خسرو کی کہہ مکریوں کا سایہ انداز ان کی تحریر کی
اصل روح ہے۔اشعار کا برمحل استعمال،ضرب الامثال، نادر تشبیہات اور بات
سے بات پیدا کرنے میں خواجہ صاحب کا کوئی ثانی نہ تھا"۔ "[1]

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں جب کسی ادیب کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں تو طویل طویل مباحث سے گریز کرتے ہوئے مختصر لیکن جامع انداز میں اس ادیب کو اپنے طنز کی گرفت میں لیتے ہیں ان کے اس اسلوب پر ڈاکٹر محمد سلیم اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ کالم طنز ومزاح کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ان میں عام طور پر مختلف
کتابوں پر تبصرہ ہوتا لیکن اس طرح کہ ادب کی بات نسبتاً کم ہوتی اور زیادہ تر
بیچارہ ادیب ان کے قلم کا ہدف ہوتا۔اسلوب ان کا ایسا تھا کہ ایک دو طنزیہ فقروں
ہی میں ادیب اتنا گھائل ہو جاتا کہ اس کے زخم عمر بھر مندمل نہ ہوئے"۔[2]

مشفق خواجہ کے کالم ذکاوت،حلاوت اور طنز ومزاح سے مالا مال ہیں وہ اپنے اس اسلوب میں اپنے طنز کے ذریعہ ادیبوں اور شاعروں پر اس طرح کاری ضرب لگاتے ہیں کہ ضرب کھانے والا شخص درد کے ساتھ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے ان کے اسلوب کی اس خصوصیت کو سراہتے ہوئے ہاشمی سید محمد بن قاسم ان کے اسلوب کو "سہل متمنع کا درجہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"مشفق خواجہ صاحب کے سر کئی بڑے ادبی کارناموں کا سہرا بندھتا ہے،مگر
ان کی ذکاوت،حلاوت،اور طنز ومزاح سے بھرپور ادبی تنقیدوں نے جو وہ "خامہ
بگوش" کے نام سے ہفت روزہ "تکبیر" اور روزنامہ "جسارت" میں لکھتے رہے،
اردو ادب کو ایک خوبصورت اور کھلکھلاتے ہوئے اسلوب نگارش سے مالا مال
کر دیا۔خطوط غالب کی طرح،ان کا یہ اسلوب قابلِ تقلید ہونے کے باوجود ایسے
"سہل متمنع" کا درجہ رکھتا ہے جیسے نقل کرنا آسان نہ ہوگا۔وہ اپنی تنقیدوں میں

---

[1] ڈاکٹر روبیہ شاہجہاں،مضمون،مشفق خواجہ۔۔۔ایک گوشہ نشین،مشمولہ،مشفق من خواجہ من،ص:179

[2] بحوالہ ڈاکٹر محمد سلیم،محقق اور صاحبِ طرز ادیب،مشفق خواجہ،مشمولہ من خواجہ من، 133

ایسی چٹکیاں لیتے، جن سے مضروب بجائے رونے اور چلانے کے ہنسنے اور قہقہے
لگانے لگتا۔ اور یہ ہی کہتا: ہل من مزید۔؟''۔ [1]

مشفق خواجہ کے کالموں میں صرف فکاہی رواروی نہیں ملتی بلکہ ان فکاہیہ کالموں میں تہہ داری و گہرائی کے ساتھ موضوع سخن کے ہر پہلو پر باریک بینی سے روشنی ڈالی گئی ہے ان کے اسلوب کے اس طرح داری سے پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نامی انصاری ان کی اسلوب ان خوبیوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ فکاہیہ کالموں میں جیسی تہہ داری، گہرائی اور وژن ملتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فکاہیے رواروی میں نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان پر خاصی محنت اور توجہ صرف کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کے ہر پہلو پر باریکی سے نظر رکھتے تھے، پھر جو نکتے وہ نکالتے تھے اس کو اپنے مخصوص انداز و اسلوب میں اس طرح داری سے پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والا لطف وانبساط کی شبنمی پھواروں میں بھیگ جائے''۔ [2]

ان کے کالموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب دکھائے یا بناوٹ سے پاک ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں بھی بجا دعوے یا دلیل کی صورت نہیں ملتی اور نہ ہی ایسی کوئی بات وہ خود سے منسوب کرتے جو نہ ہو، زبان وبیان کی سادگی اور حس مزاح عمدہ طور پر نظر آتا ہے:

مشفق خواجہ کے اسلوب میں، بلاغت واعجاز کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کے تمام اسالیب پائے جاتے ہیں۔ ان کے جملے، فقرے سن کر قاری داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ ان کے جملوں فقروں کا شکار ہی کیوں نہ ہو، بقول شمیم حنفی کے:

---

[1] بحوالہ ہاشمی سید محمد بن قاسم، ریاض، مضمون: ''مشفق خواجہ'' اردو ادب کا ایک زندہ دِل درویش'' مشمولہ Urduston.com سعودی عرب بتاریخ 02-11-1 ص:3

[2] نامی انصاری، مشفق خواجہ: ایک بے مثل'' ماہنامہ، ''ایوانِ اردو'' دہلی، ستمبر ۲۰۰۵ء، از ص:29

''خامہ بگوش، کے فقروں میں ہمیشہ وہ ارتکاز، بلاغت اور اعجاز پایا جاتا ہے، جس کا تصور زبان و بیان کے اسالیب پر گرفت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان تحریروں کے کسی بھی پڑھنے والے کی شخصیت اگر اپنی انا کی قتیل اور اپنی صحبت میں بہت زیادہ خراب نہیں ہوتی تو وہ اپنے بارے میں بھی خامہ بگوش کے فقروں کی داد ضرور دے گا، چاہے وار کتنا ہی کاری کیوں نہ ہو''۔ [1]

مشفق خواجہ کا اسلوب بے تکلف گفتگو کا ترجمان بھی ہے وہ اپنی تحریروں میں قاری کے ساتھ بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے اس کو اپنے اپنے تجربات و مشاہدات میں شریک بھی کرتے ہیں ان کے اسلوب کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے یوسف ناظم فرماتے ہیں کہ:

''ان میں اجلاس پن بھی، منسلک پن بھی اور ارتکاز بھی، ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے قارئین سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں، اور انہیں اپنے تاثرات میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ آؤ نظر سے بھی ذرا ان افراد واقعات اور حادثات کو دیکھ لو جنہیں تم تکلف و تذبذب یا تعصب اور خوش فہمی کے آئینے میں دیکھتے رہے ہو۔'' [2]

مشفق خواجہ کا یہ مزاحیہ اسلوب تہذیب و شائستگی کے علاوہ لطافت اور خوش سلیقی کا بھی ترجمان ہے۔ ان کے طنز کی تلخی مردم بیزاری نہیں بلکہ خوش طبعی کی حامل ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

مشفق خواجہ کے طنزیہ انداز میں ایک نوع کی تہذیب و شائستگی کے علاوہ لطافت، نزہت اور خوش سلیقگی بھی جلی ہیں۔ طنز و مزاح کے معروض کو وہ اس طرح (Expose) کرتے ہیں کہ سر بھی قلم ہو جائے تو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ ان کے طنزیہ واروں کی کاٹ میں تلخی مردم بیزاری اور کیف پروری کی آمیزش نہیں ہے بلکہ خوش طبعی اور انبساط کی موج تہہ نشین ہر جگہ ملتی ہے۔ [3]

---

[1] شمیم حنفی، خامہ بگوش کے قلم سے۔ ماہنامہ، کتاب نما، نئی دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء۔ ص: ۵۹

[2] یوسف ناظم، شخصیت خامہ بگوش، ماہنامہ، کتاب نما، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۵ء، ص: ۴۸

[3] نامی انصاری، مشفق خواجہ: ایک بے مثل، ماہنامہ، ایوانِ اردو دہلی، ستمبر 2005ء ص 27۔

مشفق خواجہ کے اسلوب کی ایک اور اہم خصوصیت ہجو ملیح یعنی اظہار کا ایسا طریقہ کار جس میں موضوع سخن کو بظاہر تعریف کی جاتی ہے لیکن اصل مقصد اس کو طنز کا نشانہ بنا کر اس کی ہجو کرنا ہوتا ہے۔ نامی انصاری ان کے اسلوب کی اس خوبی پر یوں اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

> جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں کئی حربوں سے کام لیا ہے، جن میں تحسین معکوس، ہجو ملیح اور استادِ لاغر مراد آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ کتاب اور صاحب کتاب کے عیوب کو اس ماہرانہ انداز سے ظاہر کرتے ہیں کہ بظاہر اس پر خوبیوں کا گمان ہوتا ہے مگر آگے چل کر یہی خوبیاں، ہجو ملیح بن جاتی ہیں۔ بقول شخصے ان کے طنز کا ہدف تڑپتا بھی ہے مگر مسکرائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔[1]

مشفق خواجہ کے کالم کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت ان کا ہمزاد کردار ''استاد لاغر مراد آبادی'' ہے۔ یہ کردار مشفق خواجہ کا ہمزاد ہونے کے ساتھ ان کے کالموں میں ایک مشیر کا کام انجام دیتا ہے۔ مشفق خواجہ کو جب موضوع سخن کے تعلق سے کسی طرح کی کٹھن گھڑی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو یہ کردار اچانک غیب سے نمودار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جب مشفق خواجہ کو موضوع سخن کے تعلق سے کڑی تنقید کرنی ہوتی ہے تب بھی یہ کردار وہ اس ہمزاد کا سہارا لیتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ کردار ہنر مند سماجی مبصر بھی ہے جو گرد و پیش کی پوری ادبی سرگرمی پر نظر رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر مشفق خواجہ کو مواد فراہم کرتا ہے۔ شمیم حنفی مشفق خواجہ کے اس مزاحیہ کردار استاد لاغر مراد آبادی سے روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''استاد لاغر مراد آبادی کی شکل میں خامہ بگوش نے حقیقت کا ایک نیا ارسطو خلق کیا ہے۔ یہ کردار اپنی بے ساختگی اور اپنی دائم الموجودگی کے باعث ایک طرح کی mythical حیثیت کو پہنچ گیا ہے جو خامہ بگوش کو درپیش بعض کٹھن گھڑیوں میں اچانک ایک غیبی سائے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور وہ کچھ

---

[1] نامی انصاری، مشفق خواجہ: ایک بے مثل، ماہنامہ، ایوانِ اردو دہلی، ستمبر 2005ء، ص 27۔

کہہ جاتا ہے، ایک نا قابل تقلید سادہ لوحی کے ساجسے کہنے کے لیے خامہ بگوش کو ہزار بہانے درکار ہوتے ہیں۔ استاد لاغر مراد آبادی خامہ بگوش کا ہمزاد (persona) ہی نہیں ایک ہنر مند سماجی مبصر بھی ہے جو گردوپیش کی پوری ادبی سرگرمی کو نظر میں رکھتا ہے اور حسبِ ضرورت خامہ بگوش کے پردے سے اچھل کر سامنے آجاتا ہے۔ خامہ بگوش نے یہ تصویر ایسی مہارت کے ساتھ بنائی ہے کہ اب ہمارے لیے اس کی ہستی سے انکار ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی صورت حال، اپنے ادبی کلچر کا جائزہ لیتے وقت، بار بار نمودار ہوتی ہے۔ جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایک استاد لاغر مراد آبادی کا وجود ناگزیر ہو جاتا ہے۔[1]

مشفق خواجہ کے کالم طنز و مزاح کی تمام خصوصیات جیسے، شگفتگی، طنز، بزلہ سنجی، ہجو ملیح، ظرافت اور خوش طبعی وغیرہ کے علاوہ زبان و ادب کی رمز شناسی اور نکتہ آفرینی سے بھی مالا مال ہیں۔ رمز شناسی اور لفظوں، فقروں اور ترکیبوں کی تخلیق کے سلسلہ میں نامی انصاری نے مشفق خواجہ کو مشتاق احمد یوسفی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> بظاہر تو یہ کالم ہیں لیکن اپنی جگہ یہ مستقل فکاہیہ مضامین ہیں۔ جس میں شگفتگی، طنز، بزلہ سنجی، ہجو ملیح، ظرافت اور خوش طبعی بہ یک وقت موجود ہیں۔ ان سب پر مستزاد خواجہ صاحب کی اردو زبان و ادب کی رمز شناسی اور نکتہ آفرینی جس کی وجہ سے ان کالموں کی ادبی قدر و قیمت ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اردو زبان کا اتنا بڑا رمز شناس اور لفظوں فقروں اور ترکیبوں کا تخلیقی استعمال کرنے والا اتنا بڑا لکھاری (نثر کی حد تک) مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کئی تیسرا پیدا ہوا ہی نہیں۔[2]

مشفق خواجہ کے کالموں کا مقصد ادب کی ناہموار صورتِ حال کی اصلاح ہے۔ موضوعات کو اپنے

---

[1] شمیم حنفی، خامہ بگوش کے قلم سے، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی جولائی ۱۹۹۵ء، صفحہ 59۔

[2] نامی انصاری، مشفق خواجہ: ایک بے مثل، ماہنامہ، ایوانِ اردو دہلی ستمبر ۱۹۹۵، ص ماہنامہ، ایوانِ اردو دہلی ستمبر، 27۔

کالموں کا موضوع بنایا جس سے ہمارا ادبی کلچر نہ صرف متاثر ہے بلکہ زوال کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان موضوعات کو بیان کرنے پر اظہار خیال کرنے کے لیے انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ پیرایہ اختیار کیا۔ خواہ تحقیقی حقائق ہو یا ظریفانہ اسلوب ہوتا ہے۔ لین ان کے اسلوب کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ نہایت شائستہ انداز میں طنز کرتے ہیں جس سے لوگوں کو اعتراض بھی نہیں ہوتا اور ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ غرض مشفق خواجہ کے کالموں کے مطالعہ کے بعد ہم بلاشبہ انھیں ہندو پاک کے ان چند گنے چنے کالم نویسیوں میں شمار کر سکتے ہیں جن کی عبارت، سلاست، روانی اور بیان کی سادگی کی بدولت طنز ومزاح کی بہترین مثالیں پیش ہیں۔

***

باب پنجم

مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار

(الف) موضوعات

(ب) اسلوب اور ٹکنیک

(الف) موضوعات

مشفق خواجہ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے گنے چنے کتاب شناسوں اور کتاب دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ پاکستان کے بلند پایہ محقق و ناقدین میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک طرف انہوں نیحیثیت شاعر اور صحافی کے اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، تو دوسری طرف اردو ادب میں معروف طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ہے۔

مشفق خواجہ نے 1970ء سے 1997ء تک مختلف اخبارات و رسائل میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف فرضی ناموں سے طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھے ہیں۔ پچھلے باب میں ان کی کالم نگاری کی ابتداء کے سلسلہ میں تفصیل سے ذکر آچکا میں ہے جیسے کہ مذکور ہو چکا ان کی کالم نگاری کی ابتداء الطاف حسین قریشی کے روزنامہ جسارت کے اجراء سے ہوئی۔ روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں ان کا پہلا کالم 15 نومبر 1975ء کو ''اندیشہ شہر'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کے لیے انھوں نے قلمی نام ''غریب شہر'' اختیار کیا تھا۔ یہیں سے کاان کی لم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد 1971-72ء تک روزنامہ ''زندگی میں'' ناخواندہ، اور خامہ بدوش کے نام سے کالم لکھے۔ پھر 1974ء میں روزنامہ صداقت کراچی سے منسلک ہوئے، جس میں ''سخن در سخن'' عنوان کے تحت ''میر جملہ'' کے فرضی نام سے کالم لکھا۔

بعدازاں ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ''سخن در سخن'' ہی کے عنوان کے تحت ''خامہ بگوش'' کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا۔ ہفت روزہ ''تکبیر میں ان کا پہلا کالم ۲۳ر مارچ 1984ء کو شائع ہوا۔ کچھ عرصے بعد یہ سلسلہ بند ہوا پھر ''تکبیر میں'' کالم کا یہ سلسلہ ۳۱ر مارچ 1994ء کو شروع ہوا اور 1997ء تک چلتا رہا۔

غرض مشفق خواجہ نے مختلف اوقات میں مختلف اخبارات کے لیے کالم لکھے جو مختلف عنوانات کے تحت مختلف فرضی ناموں سے شائع ہوئے، لیکن ان کا سب سے مشہور کالم ''سخن در سخن'' تھا، جو ''خامہ بگوش''

کے فرضی نام سے شائع ہوتا تھا۔ یہ کالم ہفت روزہ ''تکبیر'' میں جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا ''سخن در سخن'' اس دور میں اردو کا مقبول کالم کہلاتا تھا۔ کئی اخبارات ورسائل میں یہ کالم نقل ہوا کرتے تھے اور جس پرچے میں اس کو نقل کیا جاتا تھا اس کی اشاعت اس دن دوگنا ہو جاتی تھی۔ قارئین کالم کو دیکھ کر ہی پرچہ خریدتے تھے اور ہر کوئی ان کالموں کو پڑھ کر داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

مشفق خواجہ کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کے اب تک پانچ انتخابات شائع ہو چکے ہیں جیسے:

ا) خامہ بگوش کے قلم سے/ پہلا ایڈیشن 1995ء دوسرا 2007ء

2) سخن ہائے ناگفتی۔ اپریل 2004ء

3) سخن در سخن اپریل 2004ء

4) سخن ہائے گسترانہ 2007ء

5) جوش اور خامہ بگوش۔

مشفق خواجہ کے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا تعارف تفصیل سے پچھلے باب میں آچکا ہے لہٰذا تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے اس باب میں ان کے کالموں کے مقاصد وموضوعات اور اسلوب کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

مشفق خواجہ کے طنز ومزاحیہ کالموں کے موضوعات میں ادب، ادیب، کتاب اور مصنف ہیں۔ وہ ادیبوں کو ان کی تحریروں اور ارشادات کے حوالے سے اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں وہ جب بھی کسی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں تو وہ پوری ادبی دنیا میں معروف ہو جاتا ہے ان کے اس اسلوب میں کڑی تنقید، تیکھا طنز اور کڑوا مزاح ضروری ہوتا لیکن اس کو پڑھنے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر انور سید نے ایک جگہ ان کے کالموں کے موضوعات اور خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> کالم ''سخن در سخن'' روزنامہ جسارت کراچی کے ہفتہ وار ایڈیشن میں جاری کیا گیا تھا اس کا موضوع ادب اور ادیب کتاب اور مصنف تھا اور اس کا اسلوب تحریر

''سخن گسترانہ'' تھا جس میں کڑی تنقید، تیکھا طنز اور کڑوا مزاح ہی نہیں تحسین کا زاویہ بھی شامل تھا۔لیکن عالم یہ تھا کہ مشفق خواجہ جس مصنف پر کالم لکھتے وہ پورے برصغیر میں معروف ہو جاتا لیکن طنز کا وار نہ سہ سکتا تو منہ چھپاتا پھرتا لیکن نئی کتاب شائع ہوتی تو پھر کالم لکھنے کی درخواست لے کر حاضر ہو جاتا۔ چند کالموں کی اشاعت کے بعد ہی اس کالم کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور اسے پاکستان کے علاوہ بھارت کے متعدد روزناموں اور رسائل میں مکرر شائع کیا جانے گا''۔ [1]

ا۔ادب

مشفق خواجہ کے کالموں کا ایک اہم موضوع ادب ہے۔انہوں نے جابجا اپنے کالموں میں ادب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہیں ادب کی تعریف کی ہے تو کہیں موجودہ دور کے ادب کی ناہموار صورت حال کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔مشفق خواجہ کے نزدیک ادب ادیب کی ذات کا عکس ہوتا ہے اور ادب کو ادیب کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس بات کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ کے الٹ پھیر کے ذریعہ بڑی عمدگی سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ادب کو ہم ادیب کی ذات سے الگ نہیں کر سکتے، ادیب جو کچھ لکھتا ہے، وہ اس کی شخصیت یعنی ذات کا عکس ہوتا ہے ادب اور ذات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ادب بے ذاتی اور ذات بے ادب ہوتی ہے۔'' [2]

موجودہ دور میں ادب کے معیار کو جانچنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ پہلے ادب کا معیار اس کے موضوعات سے دیکھا جاتا تھا کہ کن موضوعات پر ادب لکھا جا رہا ہے اور کن موضوعات کی طرف ہمارے ادیبوں کا رجحان زیادہ ملتا ہے۔ پہلے ادب کے معیار کو ادبی کتابوں اور ادبی رسالوں سے بھی جانچا جاتا تھا

۱۔ڈاکٹر انور سدید ،مضمون چند آہیں چند آنسو، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص:132

۲۔سخن ہائے گسترانہ مرتب، ڈاکٹر انور سدید، فضلی لمیٹڈ، کراچی، ص 253

لیکن موجودہ دور میں ادب کے معیار کو دیکھنے کا طریقہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی اب ادب کا معیار اخبار میں چھپنے والی ادبی خبریں اور ادبی تقریبوں سے معلوم کیا جا رہا ہے۔ اسی صورت حال پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے لکھا ہے:

> ''آج کل ہمارا سب سے بڑا ادبی معیار بھی لٹریچر کی روح سے نا آشنائی ہے۔ ادب کتابوں اور رسالوں سے نکل کر اخباروں اور رونمائی کی تقریبوں میں آ گیا ہے''۔[1]

عصر حاضر کے ادیبوں کو اس بات کی شکایت ہوتی ہے کہ اب ادب پڑھنے والے نہیں رہے اور ادبی کتابوں کی فروختی نہیں ہو رہی ہے۔ کتابوں کی دکانیں بند ہو رہی ہیں لیکن یہ ادیب کبھی یہ نہیں سوچ رہے کہ ہم ادب کے ذریعہ قاری کو کتنا مطمعن کر رہے ہیں۔ چنانچہ رسالہ ''افکار'' کے ایڈیٹر حسن عابد نے بھی اسی بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور اپنے اداریے میں قاری سے شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شاعر کو سخن شناس اور ادب کو اپنا قاری نہیں ملتا۔ اس کے بعد کتابوں کے فروخت نہ ہونے، کتابوں کی دکانوں کے بند ہونے اور ان کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھل جانے پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ مشفق خواجہ نے حسن عابد کی اس شکایت سے اختلاف کرتے ہوئے ادب کی موجودہ صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا ہے، کہتے ہیں:

> ''اس افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر صورت حال وہ نہیں جو عابدی صاحب نے بیان کی ہے۔ سخن شناس اور ادب کے قاری تو موجود ہیں مگر خود ادب منظر سے غائب ہے۔ یہ جو رسالوں میں اور کتابوں کی صورت میں طوامیر اغلاط شائع ہوتے رہتے ہیں اگر انہیں کو آپ ادب کہتے ہیں تو پھر کتابوں کی دکانوں کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھلنے پر خوش ہونا چاہئے کہ جوتے بہر حال انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ پہننے کے کام بھی آتے ہیں اور چلانے کے بھی۔ اس کے برعکس ادب کا یہ حال ہے کہ

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، مرتب ڈاکٹر انوار سدید، ص 121

سوختنی نہ فروختنی ۔ادب کے معیار کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کاغذ جو بازار میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے جب اس پر شاعری یا افسانے چھپ جاتے ہیں تو ردی کے بھاؤ بھی نہیں بکتا۔ یہاں تک کہ لوگ اعزازی نسخے لینے سے بھی انکار کردیتے ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایسا بھی کیا اعزاز جو حاصل کرنے والے کے لیے شرمندگی کا باعث ہو"۔ [1]

حسن عابدی نے ایک اور جگہ ادب کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ادب کو اچھے اور برے میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کسی ادیب کی تخلیق پر اعتراض کرنے سے اسے اپنے دل کا خون ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے بڑے سخت اور کھرے لہجے میں قاری کی تائید کرتے نظر آتے ہیں:

"حسن عابدی کو اس پر بھی اصرار ہے کہ ادب کو اچھے اور برے کے درمیان تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ادب اچھا یا برا نہیں ہوتا ۔بس ادب ہوتا ہے۔ "تخلیق عمل کے مرحلے میں تخلیق کار کو یہ کب یاد رہتا ہے کہ وہ کس درجے کا شعر یا ادب تخلیق کر رہا ہے ۔اسے تو اپنے دل کا خون ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے"۔ حسن عابدی صاحب! آپ کو تخلیق کار کا خون ہوتا ہوا دل تو نظر آ گیا۔ کبھی فرصت ملے تو سخن شناسوں اور ادب کے قارئین کے دلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے ۔یہاں بھی آپ کو خون کے سوا کچھ اور نظر نہیں آئے گا" ۔[2]

اس طرح ایک اور جگہ مشفق خواجہ نے عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کے علمی و ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے موجودہ دور میں ادبی دنیا کی جو صورت حال ہے اس پر طنز کیا ہے۔ جہاں اچھے اور برے کی پہچان نہیں کیا جاتی، لکھتے ہیں

۱۔سخن ہائے ناگفتنی، مرتبہ مظفر علی سید، اکادمی بازیافت، کراچی، ص: 78

۲۔سخن ہائے ناگفتنی، ص: 79-80

''دنیائے موسیقی میں تو سلامت علی نزاکت علی اور نصرت علی فتح علی جیسی کئی جوڑیا ہر دور میں موجود رہی ہیں لیکن دنیائے ادب میں صرف عطا الحق قاسمی اور امجد السلام امجد ہی کی جوڑی نظر آتی ہے۔خدا اس جوڑی کو نظر بد سے بچائے کہ بازار ادب میں انہیں دونوں کے نام کا سکہ چلتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سکہ کھوٹا نہیں ہے۔ورنہ آج کل ادب کے بازار میں زیادہ تر کھوٹے سکوں ہی کا چلن ہے۔پڑھنے والوں کو بھی کھوٹے کھرے کی پہچان نہیں رہی، کھوٹے کی پہچان نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، کھرے کی پہچان نہ ہونا بہت بڑا المیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ نظیر صدیقی جیسے کھرے ادیب کو یہ شکایت رہتی ہے کہ زمانہ ان کی قدر نہیں کرتا''۔ [1]

عصر حاضر کے ادب میں ایک رجحان یہ بھی ملتا ہے کہ زیادہ تر ادیب ترجمہ کے ذریعہ ادبی سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔یا ترجمہ نہیں بھی کر رہے ہیں تو موجودہ دور کی ادبی کتابیں کسی دوسری زبان کی ترجمہ ہی معلوم ہو رہی ہیں۔چنانچہ مشفق خواجہ اس طرح کے رجحان کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ویسے بھی آج کل ہمارے ہاں جس طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کے پیش نظر یہی مناسب ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم زیادہ سے زیادہ شایع کیے جائیں، تاکہ ہمارے ''طبع زاد'' مصنفین کو معلوم ہو کہ ادب تخلیق کرنا کتنا مشکل کام ہے''۔ [2]

۲۔اصنافِ ادب

مشفق خواجہ نے اردو کی اصناف ادب کو بھی اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے جیسے، غزل، قصیدہ، نثری نظم، ہائیکو، علامتی افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، آپ بیتی، تنقید، تحقیق، دیباچہ نگاری، اور فیلپنگاری

۱۔سخن در سخن، مرتب مظفر علی سید، اکادمی بازیافت، کراچی 127

۲۔سخن ہائے گسترانہ، 57

وغیرہ وغیرہ۔

مشفق خواجہ نیقصیدہ کو کارآمد صنف اس لیے قرار دیا ہے کہ پہلے زمانے میں شاعر اس کو بادشاہ کو خوش کرنے اور اس سے انعام واکرام حاصل کرنے کی غرض سے لکھا کرتے تھے اور آج بھی قصیدہ کسی نہ کسی مقصد کے حصول کے لیے ہی لکھا جارہا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قصیدہ بھی کارآمد صنف ہے کہ پرانے زمانہ میں امیروں، رئیسوں اور بادشاہ کے قصیدے لکھ کر انعام واکرام حاصل کئے جاتے تھے۔آج کل بھی قصیدہ نگاروں کو محکمہ، اطلاعات اور ٹرسٹ کے اخباروں میں ملازمتیں آسانی سے مل جاتی ہیں''۔ [1]

ا۔غزل

صنف غزل اصناف شاعری میں سب سے مقبول صنف سخن ہے۔ ہر شاعر اپنی شاعری کی ابتداء عموماً غزل سے کرتا ہے اور ہر نقاد غزل پر کچھ نہ کچھ لکھ کر اپنی تنقید نگاری کا ثبوت دیتا ہے۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے ایسے شاعروں اور نقادوں پر طنز کرتے ہوئے موجودہ دور میں غزل کی اس خصوصیت پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

''صنف غزل کے ساتھ شاعروں اور نقادوں نے یکساں سلوک کیا ہے۔ شاعر زندگی بھر غزلیں کہتے رہتے ہیں اور نقاد صنف غزل کی خوبیاں بیان کرنے میں عمریں صرف کردیتے ہیں۔غزل کے بارے میں اب تک بلا مبالغہ سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں اور مستقل کتابوں کی تعداد بھی دوڈھائی درجن سے کم نہیں ہے۔غزل پر پہلی کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خان نے لکھی تھی۔پھر جو سلسلہ لا چلا تو بس چل ہی نکلا .....اور بہت دوسروں نے موٹی موٹی کتابیں لکھ کر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ صنف غزل بڑی سخت جان ہے اور بڑے سے بڑے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص250

صدمہ کو بآسانی جھیل سکتی ہے''۔ [1]

۲۔نثری نظم

مشفق خواجہ نے ادب کی دیگر اصناف کی بہ نسبت نثری نظم کو بہت زیادہ اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔انہوں نے نثری نظم کی حمایت میں ایک جملہ بھی کہیں نہیں لکھا ہے اور جب کبھی نثری نظم کے بارے میں کہنے کا انہیں موقع ملا ایک آدھ جملہ ایسا لکھ دیتے ہیں جس سے نثری نظم کے متعلق ان کے نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے کبھی اس پر طنز کے تیر چلاتے ہیں تو کبھی مزاح کی پھلجھڑیاں برساتے ہیں۔ایک جگہ نثری نظم کے متعلق مجروح سلطان پوری کی رائے درج کرتے ہوئے نثری نظم پر تبصرہ کیا ہے جس سے نثری نظم سے متعلق مشفق خواجہ کے نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے۔لکھتے ہیں:

''نثری نظم کے بارے میں مجروح صاحب نے بڑی سنسی خیز گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں ''نثری شاعری آج کل جس چیز کا نام ہے وہ صرف شاعر نہ ہوسکنے کی وجہ سے اپنی ہوس مٹانے کا نام ہے کہ مجھے بھی شاعر کہا جائے۔یہ شکست خوردگی کی ایک علامت ہے کہ آپ شاعر تو ہیں نہیں مگر زبردست شاعر بننا چاہتے ہیں۔یہ نثری شاعری کیا ہوتی ہے؟یا شاعری ہوگی یا نثر ہوگی۔ہمارے نزدیک اس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ کوئی شخص شاعر نہ ہو اور شاعروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھنا پسند کرے۔بڑی بات تو یہ ہے کہ شاعروں کی فہرست میں جن لوگوں کے نام شامل ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کی وجہ سے شاعری بدنام ہوتی ہے۔استاد لاغر مرادآبادی کا قول ہے کہ برے شعر کہنے سے بہتر ہے کہ آدمی نثری نظم لکھے۔بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شریفانہ زندگی بسر نہ کرسکے تو اسے خودکشی کرلینی چاہئے''۔ [2]

۱۔ سخن ہائے گسترانہ،ص 116

۲۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص316

مذکورہ اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ کے نزدیک وہ لوگ نثری شاعری کرتے ہیں جو شاعری کے میدان میں کامیاب نہیں ہوتے۔اسی طرح ایک اور جگہ نثری نظم نگاروں پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''نثری نظم بھی فائدے سے خالی نہیں کہ اس کے ذریعے ناموزوں طبع افراد شاعر بن سکتے ہیں''۔ [1]

قمر جمیل نے اپنے ایک اخباری بیان میں اپنے آپ کو نثری نظم کا بانی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری ذات سے اردو نظم نگاری میں ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے وہ نیا سفر نثری نظم کا تھا۔پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک بڑا اقدم ہے۔بڑا اقدم اٹھانے کے لیے آدمی کو پڑھا لکھا ہونا چاہئے۔اور نثری نظم کم پڑھے لکھوں کا کام نہیں ہے۔قمر جمیل کے اس بیان پر مشفق خواجہ کو اعتراض ہے۔انہوں نے اپنے مزاحیہ کردار استاد لاغر مرآبادی کے حوالے سے نثری نظم پر یوں طنز کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''استاد لاغر مرادآبادی کو اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ نثری نظم لکھنے کے لیے شاعر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔وہ فرماتے ہیں: اگر ایسا ہوتا تو نثری نظموں سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے جب کہ بیشتر نثری نظموں سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس کا ظاہر نہ ہونا ہی بہتر ہے۔اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ غالب سے لے کر اقبال وفیض تک وہ تمام شعرا جنہوں نے نثری نظمیں نہیں لکھیں ان کا پڑھا لکھا ہونا مشکوک ٹھہرتا ہے۔

استاد گرامی کی خدمت میں عرض ہے کہ جب میر وغالب اور اقبال وفیض نے نثری نظم نہ لکھ کر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان کا پڑھا لکھا ہونا ثابت کیا جائے''۔ [2]

۱۔سخن ہائے گسترانہ،مرتب،ڈاکٹر انوار سدید،ص250

۲۔سخن ہائے ناگفتنی،ص:49

نثری نظم فن عروض سے عاری ہوتی ہے جب کہ مشفق خواجہ عروض کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ نثری نظم سے اعتراض کرتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک میٹر شاعری کا بھی ہوتا ہے، جسے عروض کہتے ہیں، نثری نظم والوں کے پاس سرے سے ہی یہ میٹر نہیں ہے''۔ [1]

ایک جگہ انیس ناگی نے غالب کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ غالب کی نثر اکثر حالتوں میں نثری نظم میں منتقل ہوجاتی ہے۔ غرض انیس ناگی کے اس بیان سے بھی مشفق خواجہ اتفاق نہیں رکھتے وہ بڑے سخت لہجے میں انیس ناگی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''انیس ناگی نے غالب کی نثر پر جو مضمون لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے:
''غالب عظیم الشان نثر تخلیق کرتے جو اکثر حالتوں میں نثری نظم میں منتقل ہوجاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انیس ناگی کو اتنی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ غالب لاکھ گناہ گار سہی برا آدمی سہی لیکن اتنی بڑی سزا کا ہرگز مستحق نہیں تھا کہ اس کی نثر کو نثری نظم میں منتقل کردیا جائے''۔ [2]

ایک جگہ تو مشفق خواجہ نے نثری نظم کو دوزخ کی ایک سزا میں شمار کیا ہے جس سے ان کے نثری نظم کے متعلق خیالات کا علم ہوتا ہے وہ اپنے مزاحیہ کردار استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے قمر جمیل کے سوال کا اس طرح جواب دے رہے ہیں ملاحظہ کیجئے:

''سوال: کیا آپ نثری نظم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔
جواب: خدا نہ کرے ایسا ہو۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اہل دوزخ کو ایک سزا یہ بھی دی جائے گی کہ انہیں نثری نظمیں سنائی جائیں گی''۔ [3]

---

[1] ۔سخن ہائے گسترانہ، ص 47
[2] خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب مظفر علی سید، ص 216
[3] ۔سخن ہائے گسترانہ، مرتب، ڈاکٹر انوار سدید، ص 106

۳ ۔ ہائیکو:

ہائیکو ایک جاپان کی مقبول صنف سخن ہے۔ اسے ''سہ مصرعی'' نظم بھی کہا جا سکتا ہے اس کی فنی ہیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ مختصر ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ قدرے طویل ہوتا ہے اردو شاعری میں بھی اس جاپانی صنف کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشفق خواجہ نے اردو شاعری میں ہائیکو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ جس طرح جاپان کی دیگر ضرورت کی چیزیں ہماری زندگی کا حصہ بن گئی ہے اسی طرح یہ جاپانی صنف بھی ہماری زندگی کا جز بن گئی ہے اور موجودہ دور میں کسی بھی شاعر کو اپنے کمالات دیکھنے کا بھی واحد ذریعہ بن گئی ہے۔ ان کے مطابق ''ہائیکو لکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کراچی میں جاپانی سفارت خانے کی طرف سے ہر سال ہائیکو مشاعرہ ہوتا ہے جس میں شرکت کرنے کا معاوضہ بھی ملتا ہے۔ بہت سے شاعر تو صرف اس مشاعرے میں شرکت کے لیے ہائیکو لکھتے ہیں۔''

مشفق خواجہ کے نزدیک ہائیکو ایک غیر ضروری صنف ہے انہیں در اصل اس بات سے سخت اعتراض ہے کہ پاکستانی لوگ بیرونی اشیاء کو اپنانے اور اسے اپنا بنانے کے عادی ہو چکے ہیں اپنی کوئی چیز ایجاد کرنے کے بجائے وہ دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں پر اکتفا کرتے ہیں اس لیے وہ اس کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں اور جن ادیبوں نے ہائیکو کی صنف کو اپنایا ہے اس پر بھی اعتراض کرتے ہوئے وہ اسے غیر ضروری صنف کہتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''جاپان ہماری قومی اور نجی زندگی میں اس حد تک داخل ہو چکا ہے کہ ہماری ضرورت کی ہر چیز وہیں تیار ہوتی ہے۔ کاروں سے لے کر بال پوائنٹ پن تک اور ٹی وی سے لے کر بچوں کے کھلونوں تک شاید ہی کوئی چیز ہو جو جاپان سے نہ آئی ہو۔ ہم رہتے تو پاکستان میں سہی لیکن سانس جاپان میں لیتے (یہ بھی غنیمت ہے کہ قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے پاکستانیوں کو کہیں تو سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔ ہم تو یہ نہیں کہیں گے کہ ضرور چیزوں کے ساتھ ساتھ غیر ضروری چیزیں

بھی جاپان سے آنے لگی ہیں اور ہائیکو بھی انہیں میں سے ایک ہے۔'' [1]

مشفق خواجہ کا ہائیکو کے بارے میں یہ بھی خیال ہے کہ ہائیکو میں کسی بڑے خیال کو پیش نہیں کیا جا سکتا اور اردو شاعری میں اس طرح کی اصناف پہلے ہی سے اس کثرت سے موجود ہیں جن کو کوئی استعمال میں نہیں لا رہا ہے ایسے میں یہ صنف ہمارے لیے بلاضرورت اور بلا جواز ہے۔ یہی نہیں مشفق خواجہ اس صنف کو کوئی نئی صنف نہیں مانتے کیونکہ یہ ایک قدیم جاپانی صنف ہے غرض مشفق خواجہ نے ہائیکو کے متعلق اپنے اعتراضات کو اپنے ایک مزاحیہ کردار استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں:

> ''ہم نے استادِ گرامی سے پوچھا، آپ نے بھی کبھی اس کھلونے سے دل بہلایا ہے۔ فرمایا، کیا ہائیکو اور کیا ہائیکو کا شوربا۔ یہ صنف کسی بڑے خیال کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے عرض کیا ''آپ کے خیالات غزل میں بھی پوری طرح نہیں سما سکتے تو ہائیکو سے کیا شکوہ۔ فرمایا، یہ شکوے شکایت کی بات نہیں، اصول کی بات ہے جاپان نے صنعتی میدان میں ترقی کی ہے تو ہم بھی صنائع بدائع کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہمارے پاس پہلے سے ہی بے شمار اصنافِ سخن ایسی موجود ہیں جو استعمال میں نہیں آ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی صنفِ سخن باہر سے منگوانا تکلفِ بے جا ہے اور پھر بھی دیکھئے، جاپان سے جو چیزیں آتی ہیں بالکل نئی ہوتی ہے۔ صنفِ سخن بھی نئی ہوتی تو کوئی بات تھی ہائیکو صدیوں سے جاپانیوں کے استعمال میں ہے۔ ایسی گھسی پٹی چیز منگوا کر اپنے استعمال میں لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کی اترن پہن لی''۔ [2]

---

[1] سخن در سخن، مرتب، مظفر علی سید، اکادمی بازیافت، کراچی ص 177

[2] سخن در سخن، ص 177

۴۔علامتی افسانہ:

علامتی افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے لیکن اردو کے ادیب اس فن میں بھی مہارت رکھتے ہیں لیکن اردو کے عام قارئن اس فن سے اتنے ہی غافل ہیں، یہی وجہ ہے کہ قارئین کو علامتوں اور استعاروں کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور اسی سبب مشفق خواجہ عام قاری سے ہمدردی کا رویہ رکھتے ہیں چوں کہ علامتی افسانہ نگاروں نے افسانہ جیسی سیدھی سادی اور آسان صنف کو بھی مشکل صنف بنا دیا ہے۔اس لیے وہ علامتی افسانہ لکھنے والوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علامتی افسانہ لکھنے والوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ انہوں نے گفتگو میں علامتوں سے کام لیا تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو افسانے کی صنف کا ہوا ہے''۔ [1]

۵۔خاکہ:

علامتی افسانہ نگاروں کے علاوہ مشفق خواجہ نے خاکہ نگاروں کی خصوصیات پر بھی طنز کیا ہے خاکہ دراصل اردو ادب کی اہم صنف ہے جس میں کسی شخصیت کے ظاہری و باطنی خدوخال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگار جہاں شخصیت کی شکل وصورت کی تصویر کشی کرتا ہے وہیں اس کی عادات، مشاغل، کردار وغیرہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے کسی شخص کا خاکہ لکھنے کے لیے اولین شرط ذاتی تجربہ ومشاہدہ ہے۔اس کے بغیر خاکہ نہیں لکھا جاسکتا۔مشفق خواجہ خاکہ کی اس اولین شرط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شخصی خاکہ، لکھنے والے کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو خاکہ، خاکہ نہیں رہتا، جواب مضمون بن جاتا ہے۔[2]

مشفق خواجہ کے مطابق موجودہ دور کی خاکہ نگاری کا یہ حال ہیکہ خاکہ میں مرحومین کے بارے

۱۔خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب، مظفر علی سید، رائٹرس کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، پاکستان۔ص 282

۲۔سخن در سخن، مرتب مظفر علی سید، ص، 42

میں جھوٹ بولنا جتنا آسان ہے زندوں کے بارے میں سچ بولنا اتنا ہی مشکل ہوگیا ہے گویا خاکہ نگاروں نے اب یہ طریقہ اپنالیا ہے کہ خامیاں مرحومین کی گنا ؤاور خوبیاں زندہ شخص کی۔لہذا اس صورتحال پر وہ بھر پور طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شخصی خاکے مرحومین کے بھی لکھے جاتے ہیں اور زندہ لوگوں کے بھی، مرحومین کے بارے میں جھوٹ بولنا جتنا آسان ہوتا ہے، زندوں کے بارے میں سچ بولنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔اس صورت حال سے بعض خاکہ نگاروں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ شخصی خامیاں تو مرحومین کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں اور خوبیوں سے زندہ شخصیات کو سرفراز کیا جاتا ہے۔اس طرح طریقہ کار کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔مرحومین صرف شکایت زبان پر نہیں لاتے اور زندہ افراد مجوزہ خوبیوں کے مطابق اپنے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''[1]

ان کا خیال ہے کہ موجودہ خاکہ نگاری کی خامی یہ بھی ہے کہ خاکہ کا موضوع صرف عنوان تک ہی رہتا ہے اور باقی سب کچھ خاکہ نگار موضوع خاکہ کے حوالے سے اپنی شخصیت بارے میں لکھتا ہے۔خاکہ نگاری کی اس صورت حال پر وہ افسوس کرتے ہیں۔چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''شخصی خاکہ نگاری کا بھی وہی حال ہے جو دیگر اصناف ادب کا ہے۔ہر طرح کے لکھنے والوں نے اسے اپنالیا ہے۔کچھ لوگوں نے تو واقعی لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔بعض نے شخصی خاکے سے وہی سلوک کیا، جو استاد اختر انصاری اکبر آبادی غزل سے اور سلطان جمیل نسیم افسانے سے کرتے ہیں۔ہم نے ایسے شخصی خاکے بھی پڑھے ہیں۔جن میں موضوع کا ذکر صرف عنوان کی حد تک ہوتا ہے اور باقی سارا خاکہ لکھنے والے کی اپنی شخصیت کے بارے میں ہوتا ہے''۔[2]

۱۔سخن ہائے گسترانہ،ص109

۲۔سخن ہائے گسترانہ،ص108

اس اقتباس سے عصر حاضر کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے بے باکانہ انداز میں ادب کی صورت حال اور اس کی کڑوی صداقتوں کا بیان بڑی آسانی سے کر جاتے ہیں اور ہمارے خاکہ نگاروں کی ان خامیوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔

۶۔انشائیہ

مشفق خواجہ انشائیے کی صنف کے معترض نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے ایک مرتبہ کالم اور انشائیہ کا تقابل کرتے ہوئے کہا تھا کہ کالم دن غروب ہونے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں چنانچہ انور سدید کی اس رائے کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب ہماری بھی ایک چھوٹی سی بات مان لیں کہ انشائیے دن کے طلوع ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتے۔اس سے پہلے ہی پڑھنے والے پر غنودگی طاری کر دیتے ہیں''۔ [1]

مشفق خواجہ انشائیہ کو ادبی فساد کی جڑ کہتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اردو کی اتنی بے شمار اصناف ہیں جن کو ہر دور میں سراہا گیا ہے جب کہ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس نے صرف فساد کے علاوہ ادب کو کچھ نہیں دیا۔ ان کے مطابق جب سے اس کی تخلیق ہوئی ہے تب سے اسی سوال پر بحث چلی آرہی ہے کہ انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشفق خواجہ بھی ایک عام قاری کی طرح انشائیہ کے بارے میں پریشان نظر آتے ہیں، پاکستان میں اس صنف میں بہت سے ادیب طبع آزمائی کر رہے تھے اور اس پر بہت گرما گرم بحثیں بھی ہو رہی تھیں۔مشفق خواجہ اس صورت حال سے گھبرا کر طنز کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''بے شمار اصنافِ ادب ہیں ناول، افسانہ، مسدس، مخمس، مثنوی، مرثیہ ان سب اصناف کو ہر دور میں برتا گیا چھپاتے رہے۔لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، 178

صنف ادب بنائے فساد بن جائے۔ یہ اعزاز انشائیے اور صرف انشائیے کو ہی
حاصل ہوا ہے۔انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے جیسے سوالوں کے جواب فراہم
کرنے میں عمریں صرف کی جارہی ہیں۔"[1]

مشفق خواجہ چوں کہ ایک حساس ادیب ہیں اور سماج اور ادب کے سدھار کے خواہاں ہیں اس لیے وہ ادیبوں کو اس بات کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک اصناف کے نام پر نہیں چلتی بلکہ اصناف سے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اس صنف میں جو ادب پیش کیا جارہا ہے اس کا معیار کیسا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے ادیبوں پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے غم وغصے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"تحریک چلانے والوں کی خدمت میں بصد ادب عرض ہے کہ ادب میں
تحریکیں اصناف کے نام پر نہیں چلتیں۔کبھی کسی نے غزل مثنوی، رباعی، یا قصیدہ
کے نام پر تحریک نہیں چلائی۔.....انشائیے کی تحریک چلانے والوں کی خدمت
میں مزید عرض ہے کہ اصنافِ ادب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔اصل اہمیت اس
بات کی ہے کہ کسی مصنف کے ذریعے جو ادب پیش کیا جارہا ہے وہ کس معیار کا
ہے"۔ [2]

۷۔سفرنامہ:

دور حاضر میں نثری اصناف میں "سفرنامے" نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے۔سفرنامہ دراصل سفر کی روداد ہوتی ہے جس میں سفر کرنے والے اپنے تجربات ومشاہدات کو قلمبند کرتے ہیں۔مشفق خواجہ دور حاضر کے سفرناموں سے مطمئن نہیں ہیں۔موجود دور کے سفرناموں کے لکھنے کے طریقہ کار پر بھی انہیں سخت اعتراض ہے۔چنانچہ وہ اس حقیقت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اب سفرنامہ یوں لکھا جاتا ہے کہ گھر سے ایرپورٹ پہنچنے کے واقعات 30،

---

[1] ۔سخن ہائے گسترانہ، ص 250
[2] ۔سخن ہائے گسترانہ،ص 250

40 صفحات میں بیان کئے جائیں اس کے بعد 40، 50 صفحوں میں ہوائی
جہاز میں موجودہ ایرہوسٹوں کا ذکر ہوا اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کران لاتعداد
خواتین کا تذکرہوا جو مسافر کے لیے عرصہ دارز سے چشم براہ تھیں'' [1]

مشفق خواجہ کے نزدیک موجودہ دور کے سفرناموں میں ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ سفر کسی اور ملک کا ہوتا ہے اور روداد کسی اور ملک کی۔ یا پھر اپنے سفر کی روداد بیان کرنے کی بجائے ذاتی حالات قلم بند کیے جارہے ہیں قمر علی عباسی کے سفرناموں پر اظہارخیال کرتے ہوئے انہوں نے دیگر سفرنامہ نگاروں کی اس خامی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

''عباسی انتہائی محتاط مصنف ہیں۔ وہ جس ملک کا سفرنامہ تحریر کرتے ہیں،
اس میں وہیں کے حالات لکھتے ہیں۔ بعض غیرمحتاط سفرنامہ نگاروں کی طرح یہ
نہیں کرتے کہ سفرنامہ تو لندن کا ہوا اور حالات اپنے گھر کے لکھ دیئے جائیں۔
جن کے لکھنے کے لیے لندن جانے کی ضرورت نہیں ہوتی''۔ [2]

۸۔آپ بیتی:

آپ بیتی سے مراد ''خودنوشت سوانحی حیات ہے'' یہ ایک ایسی سوانح ہوتی ہے جس میں مصنف خود اپنی زندگی کے حالات وواقعات بیان کرتا ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں کئی جگہ آپ بیتی کا ذکر کیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس صنف سے خاص دلچسپی تھی۔ ایک جگہا نہوں نے آپ بیتی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں آپ بیتی لکھنے والوں پر طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

''آپ بیتیوں سے ہمیں خاص دلچسپی ہے۔ جب کسی آپ بیتی کے شائع
ہونے کی اطلاع ملتی ہے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اسے جلد سے جلد حاصل
کریں اور پڑھ ڈالیں۔ اس شوق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم جھوٹ بولنے کے مختلف

---

[1] ۔سخن ہائے گسترانہ،ص34
[2] ۔سخن ہائے ناگفتنی،ص:۱۵۵۔

طریقوں سے واقف اور واقفیت سے فائدہ اٹھانے کے لائق ہو گئے ہیں''۔[1]

آپ بیتی میں جو حالات بیان کیے جاتے ہیں دراصل وہ حقیقت آمیز ہونے چاہیے۔لیکن اکثر ادیب اپنے حالات کا بیان پوری صداقت کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ اپنی شخصیت کے صرف ایک رخ یعنی خوبیوں کا بیان کرتے ہیں وہ بھی بڑھا چڑھا کر جب کہ مشفق خواجہ غیر جانبداری کو ایک ادیب کے لیے ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ آپ بیتی لکھنے والوں پر برہم ہو کر کہتے ہیں:

''آپ بیتی لکھنے والے اپنا ذکر ایسی عقیدت و محبت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے حالات نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ خوش اعمال بزرگ اور محترم ہستی کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔اس مقصد کے لیے اپنے شجرہ نسب میں تبدیلی سے لے کر ہر قسم کے واقعات میں رنگ آمیز کو جائز سمجھا جاتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی کا دعویٰ خود سچائی کے نعم البدل بن جاتا ہے''۔ [2]

چوں کہ آپ بیتیوں میں اکثر صداقت کا عنصر کم ہوتا ہے اور غلو کا عنصر زیادہ ہوتا ہے اس لیے مشفق خواجہ کو اس پر سخت اعتراض ہے۔وہ اس خامی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آپ بیتی شاید لکھی ہی اس لیے جاتی ہے کہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جائے تا کہ لکھنے والے کی عظمت کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر بیٹھے۔قطع نظر اس سے کہ سکے کھوٹے بھی ہوتے ہیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے طرح طرح کے اسالیب اختیار کیے جاتے ہیں۔کوئی اپنی خاندانی عظمت جتانے کے لیے دوسروں کے آبا و اجداد کو اپنے شجرہ نسب میں درج کر لیتا ہے اور کوئی دوسروں کے کارناموں کو اپنے نامہ اعمال میں معمولی کام بنا کر شامل کر لیتا ہے۔سیاست داں یہ بتاتے ہیں کہ کرہ ارض پر جو اچھا کام بھی ہوا،وہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ادیب یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو ادب میں ایک پر نہ

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص262

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص159

ہونے والا خلا رہ جاتا''۔ [1]

آپ بیتی کا اصل موضوع مصنف کی زندگی ہوتا ہے لیکن اکثر ادیب، اپنی زندگی کے بجائے دوسروں کی زندگی اور ان کی ذات کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ مصنف حضرت اپنی حیات سے زیادہ اپنی آپ بیتی میں دوسروں کے حالاتِ زندگی بیان کرنے پر توجہ صرف کرتے ہیں آپ بیتی کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آپ بیتی ایک عجیب وغریب صنفِ ادب ہے جس کا موضوع بظاہر تو لکھنے والے کی اپنی ذات ہوتی ہے لیکن بحث عموماً دوسروں کے اعمال وکردار سے کی جاتی ہے۔ لکھنے والے کو اجازت ہوتی ہے کہ ہر اس بات کو پھیلا کر بیان کرے جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو اور ہر اس بات کو نظر انداز کر دے جس سے اصل موضوع پر روشنی پڑنے کا امکان ہو۔ آپ بیتی اس لیے نہیں لکھی جاتی کہ لکھنے والے کو کچھ کہنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے لکھی جاتی ہے کہ لکھنے والا بہت کچھ چھپانا چاہتا ہے اور بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے''۔ [2]

آپ بیتی دراصل مصنف کی یادداشتوں کی ایک دستاویز ہوتی ہے۔ اس لیے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ آپ بیتی نگار کے لیے بہترین حافظے کا مالک ہونا بے حد ضروری ہے وہ لکھتے ہیں:

''آپ بیتی لکھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لکھنے والا کا حافظا اچھا ہو، تا کہ وہ اپنے ماضی کو مطابق اصل صفحۂ قرطاس پر منتقل کر سکے''۔ [3]

مشفق خواجہ کے نزدیک آپ بیتی لکھنے والے کے لیے صرف بہترین حافظے کا مالک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس میں اخلاقی جرأت کا ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ ان کے مطابق اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو صداقت کے ساتھ کسی قسم کی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر لکھی جانے والی آپ بیتی ہی صداقت پر مبنی

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص 262

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص 159

[3] ۔سخن در سخن، ص 74

ہوتیہے۔ جہاں آپ بیتی کے سلسلے میں حافظے کی کمزوری کو وہ طنز کا نشانہ بناتے ہیں وہیں وہ آپ بیتی میں یادداشت کی زیادتی کو بھی خامی تصور کرتے ہیں کیوں کہ ان کے مطابق بعض آپ بیتیوں میں مصنف کی زندگی کے غیر اہم واقعات بھی آجاتے ہیں۔لہذا مشفق خواجہ اردو کے ممتاز نقاد حکم الدین احمد کی آپ بیتی کی مثال پیش کرتے ہوئے انہوں نے آپ بیتی کی اس خامی پر روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> اردو میں ایسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن پر ''حافظہ بناشد'' کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ان میں بے شمار سچے واقعات ملتے ہیں لیکن یہ ایسے واقعات ہیں جن کا بیان نہ کرنا بیان کرنے سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔اس کی بہترین مثال اردو کے ممتاز نقاد حکیم الدین احمد کی آپ بیتی ہے جس کا نام اگرچہ ''اپنی تلاش میں'' ہے لیکن دراصل یہ ان کی گمشدگی کا اعلان نامہ ہے۔انہوں نے صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔بے شمار بے مزہ واقعات لکھے ہیں جس میں اپنی تصانیف کی کتابت وطباعت سے لے کر جلد سازی تک کی تفصیلات بیان کر دی ہیں''۔[1]

۹۔ترجمہ نگاری

ترجمہ نگاری کے بارے میں مشفق خواجہ کا یہ خیال ہے کہ ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں پر عبور رکھنا بے حد ضروری ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو ترجمہ نگاری کی غلطیوں سے قارئین گمراہ ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اسے ایک خطرناک کام کہتے ہیں۔چنانچہ وہ اپنے مزاحیہ اسلوب میں فرماتے ہیں:

> ''ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ جب تک دونوں زبانوں پر قدرت نہ ہو، اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ یہ ایک خطرناک کام بھی ہے۔مترجم کی غلطیاں قارئین کی گمراہی کا باعث بن سکتی ہیں۔وہ لوگ جو اپنی زبان میں چار صحیح جملے بھی نہ لکھ سکتے ہوں انہیں تو

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 160

ترجمہ کرنے سے اسی طرح پرہیز کرنا چاہئے جس طرح ذیابیطس کا مریض شکر
سے پرہیز کرتا ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کے پس ماندگان کا جو حال
ہوگا وہی غلط ترجمہ پڑھنے والوں کا ہوگا۔''[1]

۱۰۔دیباچہ نگاری

اردو ادب میں دیباچہ نگاری کی ایک قدیم روایت ملتی ہے دراصل دیباچہ جس کو ہم کتاب کا مقدمہ یا پیش لفظ بھی کہتے ہیں اس کے لکھنے کا مقصد ہوتا ہے کہ کسی کتاب کی مختصر تلخیص بیان کرے یا اس کتاب کے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کریں جس کی وجہ سے یہ کتاب لکھی گئی۔بعض اوقات دیباچہ خود مصنف لکھتا ہے یا جس موضوع پر کتاب لکھی گئی ہے اس موضوع کے ماہر ادیب سے دیباچہ لکھواتا ہے۔دیباچہ لکھنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ کتاب پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالے اور ایک غیر جانبدارانہ رائے دے۔کتاب کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کریں۔لیکن مشفق خواجہ موجودہ دور کی دیباچہ نگاری سے مطمئن نظر نہیں آتے۔یعنی موجودہ دور میں جس طرح کے دیباچہ لکھے جارہے ہیں اسے بھی وہ اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔جیسے بغیر پڑھے کتاب پر دیباچہ لکھنا،جھوٹ ومبالغہ آرائی،تعریف میں بغیر سوچے سمجھے بیانات دینا، ممدوح کی حد سے زیادہ تعریف،اپنی تعریف آپ،من مانی،دیباچہ میں کلام کا بے حد استعمال کرنا،اور غیر ضروری طویل دیباچہ لکھنا وغیرہ۔

موجودہ دور میں دیباچہ لکھنے کا طریقہ بالکلد وسرا ہوگیا ہے۔اگر کسی ناول پر دیباچہ لکھنا ہوتو دیباچہ نگار اس ناول کی تعریف میں یا کسی دوسرے ناولوں سے تقابل کرنے کے لیے بے شمار ناولوں کے نام لیتا ہے مشفق خواجہ کے مطابق دیباچہ نہیں بلکہ مردم شماری کی رپورٹ تیار کی جارہی ہے،ایسا ہی طریقہ کار شہزاد منظر کی ناول ''اندھیری رات کا تنہا مسافر'' کے دیباچہ میں استعمال کیا گیا ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ اسے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے وہ لکھتے ہیں:

---

[1]۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۱۷

''جناب مصنف نے اپنے طویل دیباچے میں اس ناول کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں جن لوگوں کے پاس ناول پڑھنے کے لیے وقت یا حوصلہ نہ ہو، وہ صرف دیباچہ پڑھ کر شاد کام ہو سکتے ہیں۔ مصنف نے سب سے پہلے اس الزام کی تردید کی ہے کہ اردو میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا۔ اچھے ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے چار ناولوں کے نام لیے ہیں۔ امراؤ جان ادا، آگ کا دریا، ایسی بلندی ایسی پستی اور وہ ناول جس پر اس وقت یہ کالم لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں پہلے تین ناولوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ صرف چوتھے ناول کا تذکرہ کافی تھا کیونکہ مقصد الزام کی تردید ہے نہ کہ اچھے ناولوں کے نام گنوانا۔ نام کا کام تو شہزاد منظر اپنے تنقیدی مضامین میں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس دیباچے کو مردم شماری کی رپورٹ بنانے کی ضرورت نہیں تھی''۔ [1]

مشفق خواجہ کے خیال میں دیباچہ نگاری کی اتنی خراب حالت ہے کہ دیباچہ لکھنے والے اشخاص کتاب پڑھے بغیر ہی کتاب پر رائے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''بعض دیباچہ نگار اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کتاب پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے، حوالے کے طور پر دیے جانے والے اقتباسات بھی خود ہی تصنیف کر ڈالتے ہیں''۔ [2]

کسی زمانے میں دیباچہ لکھنا بہت مشکل فن تھا۔ لیکن موجودہ دور میں دیباچہ نگاری بہت آسان کام ہو گیا ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق دیباچہ نگار مصنف سے کہتے ہیں کہ وہ خود لکھ کر لائے اور ان سے دستخط کرالیں، دیباچہ نگاری کے اس سنگین مسئلہ کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

ایک زمانہ تھا کہ دیباچہ لکھنا خاصا مشکل کام تھا۔ اس کا ہمیں خود تجربہ ہے۔

---

[1] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 307

[2] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 318

دوچار کتابوں پر دیباچے لکھنے کا اتفاق ہوا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا اور پہاڑ کھودنا ایک ہی جیسے کام ہیں کیونکہ دیباچہ نگار کو کتاب کی وہ خوبیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں جو اس میں موجود نہیں ہوتیں ۔مگر اب دیباچہ نگاری بہت آسان ہوگئی ہے۔ دیباچہ نگاران مصنفین کی طرح جن کی کتابوں پر وہ دیباچے لکھتے ہیں، محنت سے جی چرانے لگے ہیں ۔اب دیباچوں میں رسمی مضامین کے سوا کچھ نہیں ہوتا گویا دیباچے نہ ہوئے اقبال صفی پوری کی غزلیں ہوگئیں کہ صدیوں سے ایک ہی جیسے مضامین باندھے جارہے ہیں ۔بعض دیباچہ نگار تو اتنے کاہل ہیں کہ وہ خود دیباچہ لکھتے ہی نہیں ،صاحب کتاب سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ لکھ کر لے آؤ اور دستخط کرالو۔نتیجہ یہ کہ دیباچہ بقلم غیر ہوتا ہے اور دستخط بقلم خود اس قسم کے دیباچے ان کتابوں سے بھی زیادہ بے مزہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ چھپتے ہیں۔ [1]

مشفق خواجہ کے خیال میں موجودہ دور کے دیباچوں میں جھوٹ کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور ایسے دیباچہ نگاروں کو اپنے اس فعل پر کسی طرح کا افسوس نہیں ہوتا کیونکہ سننے والا اس جھوٹ کو سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔غرض دیباچہ نگاری کی اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''یاد نہیں کہ یہ قول کسی مغربی فلاسفر کا ہے یا خود ہمارا کہ گداگری کو تو ایک سماجی برائی سمجھا جاتا ہے مگر دیباچہ نگاری کا شمار فلاحی کاموں میں ہوتا ہے۔اس قول برحق کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ دیباچہ نگار دیباچہ اس طرح لکھتا ہے جیسے اہل ثروت غریبوں کو خیرات دیتے ہیں اور دیباچہ لکھوانے والا اس خیرات کو اس طرح قبول کرتا ہے جیسے یہ اس کا حق ہو۔گویا ایک جھوٹ لکھ کر اور دوسرا اپنے بارے میں جھوٹ پڑھ کر خوش ہوتا ہے۔دنیا نے ادب میں خوشی کا انحصار اب ایسی ہی باتوں پر رہ گیا ہے یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ایک ایسے زمانے میں جب

---

[1] سخن در سخن، 154-155

کتاب لکھنے ہی سے نیک نامی حاصل نہیں ہوسکتی تو دیباچہ لکھ کر کوئی اپنی عزت میں کیا اضافہ کرے گا۔ [1]

کبھی کبھار دیباچہ میں ممدوح کی تعریف میں ایسے ایسے جملہ لکھے جاتے ہیں جس کا ممدوح کی ذات یا اس کے کارناموں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ایسی ہی ایک کتاب ''ارمغانِ خالد'' کے دیباچہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔

''کتاب کے دیباچے میں جناب مرتب نے لکھا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانوں کی اہمیت نہیں رہی۔اس وجہ سے عربی اور فارسی کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے۔خالد کی شاعری اس خلاء کو پر کرتی ہے۔ ہمیں اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ہمارے تعلیمی اداروں کو چاہئے کہ کلام خالد کا مطالعہ کرنے والوں کو مولوی فاضل اور منشی فاضل کی اسناد عطا کردیں۔ اس کے لیے کسی تحریری امتحان کی ضرورت نہیں کہ کلام خالد کا مطالعہ بجائے خود ایک امتحان کا درجہ رکھتا ہے''۔ [2]

بعض خودپسند شعرا اپنے کلام کے مجموعہ پر خود ہی دیباچہ لکھ کر اپنی شاعری کی تعریف خود ہی کرتے ہیں مشفق خواجہ کے نزدیک یہ ایک خراب صورت حال ہے دیباچہ نگاری کی خامی بھی ہے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر محمد حسن کے اس دیباچہ کی مثال پیش کی ہے جو ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مجموعہ کلام ''زنجیر نغمہ'' پر لکھا تھا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے محمد حسن کے اس دیباچہ پر سخت طنز کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کی کتاب پر دو دیباچے لکھے ہیں۔ایک شروع میں ہے اور ایک آخر میں ہم نے یہ تو دیکھا ہے کہ ریلوے کی مال گاڑی کے آگے اور پیچھے دو انجن لگا دیئے جاتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھا کہ کسی خالی گاڑی

۱۔سخن در سخن، ص 154

۲۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص 12

کے آگے بھی انجن ہوا اور پیچھے بھی۔ان دونوں دیباچوں میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعر کے محاسن اس طرح بیان کیے ہیں جس طرح ''مدرس نقاد'' یا ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کے الفاظ میں ''منشیان تنقید'' کلام غالب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے شاعر ہونے کا یہ جواز بھی پیش کیا کہ وہ نت نئے وسائل اظہار کی تلاش میں رہتے ہیں اور شاعری بھی ان کا ایک وسیلہ اظہار ہے۔یہ جواز ''عذر شاعری بدتر از شاعری'' کی بہترین مثال ہے۔[1]

ایسا ہی ایک دیباچہ بشیر بدر نے اپنے مجموعہ کلام ''آمد'' پر لکھا ہے مشفق خواجہ کے مطابق جس میں انہوں نے اپنے اسلوب کی بے شمار خوبیاں گنوائی ہیں اور کہا ہے کہ جس غزلیہ لفظ کو وہ چھوتے ہیں وہ اکثر غزل بنتے گئے اور ان سے پہلے لوگوں نے غزل نہیں بلکہ ہزل لکھی تھی۔بشیر بدر کے اس بیان پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشفق خواجہ بڑے سخت لہجے میں اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا ہے:

''بشیر بدر مزید فرماتے ہیں: نئے الفاظ کی شمولیت سے مجھ سے پہلے لوگوں نے غزل نہیں ہزل لکھی تھی۔میں جس غیر غزلیہ لفظ کو چھوتا گیا۔ان میں سے اکثر بیشتر غزل بنتے گئے۔میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن گیا ہے۔بلاشبہ بشیر بدر سے پہلے کے شاعر جھک مارتے رہے ہیں اور گھاس کاٹتے رہے ہیں۔یعنی غزل کے نام پر ہزل لکھتے رہے ہیں۔ہزل کو غزل بنا دینا بشیر بدر کا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے۔اس زبان کے پاس فخر کرنے کے لائق کوئی چیز نہیں تھی۔بشیر بدر نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کمی کو پورا کیا ہے۔[2]

کتابوں میں بعض دیباچے اس قدر طویل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کتاب کی حیثیت کم ہو جاتی ہے اور اگر کسی شاعر کے مجموعہ کلام پر دیباچہ ہو تو دیباچہ نگار اس شاعر کے کلام کو اپنے دیباچہ میں اس قدر نقل

---

[1]۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص 111

[2]۔خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب، مظفر علی سید۔ص 21

کرتا ہے کہ پورے مجموعہ کا ایک چوتھائی کلام دیباچہ میں آجاتا ہے۔ایسا ہی ایک دیباچہ سردار جعفری نے، عشرت آفرین کے مجموعے پر لکھا تھا۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے دیباچہ نگاروں کے اس فعل پر طنز کے تیر چلائے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''عشرت آفرین کے مجموعے کا دیباچہ سردار جعفری نے لکھا ہے جو 39 صفحات پر پھیلا ہوا ہے اگر اس دیباچہ کی کتابت بھی اس جلی خط میں ہوتی جس میں عشرت کا کلام ہے تو دیباچہ کلام کی ضخامت سے بڑھ جاتا ہے۔یا اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی کلام دیباچے والے باریک خط میں لکھا جاتا تو عشرت کی شاعری سردار جعفری کے دیباچہ کا ضمیمہ نظر آتی۔دیباچے کی جامعیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ جعفری صاحب نے عشرت آفرین کا تین چوتھائی کلام بطور مثال درج کردیا ہے۔اگر وہ باقی ایک چوتھائی کلام کو بھی استعمال میں لے آتے تو مجموعہ چھاپنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔دیباچہ کافی تھا۔[1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ طویل دیباچہ لکھنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ یہ فعل شاعری کی مقبولیت میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے جیسے مولانا حالی کے مقدمہ نے ان کی شاعری کے ساتھ کیا تھا۔غرض مولانا حالی کے حوالے سے طویل دیباچہ نگاری کو طنز کا ہدف بنا کر مشفق خواجہ کہتے ہیں:

''جون ایلیا کے کلام کے مطالعے سے دل خوش ہوا لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی اس طویل دیباچے کے مطالعے سے حاصل ہوئی جس کے ضمیمے کے طور پر کلام شائع کیا گیا ہے۔مولانا حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا تھا۔یہ مقدمہ ایسا مقبول ہوا کہ لوگ دیوان کو بھول گئے۔اندیشہ ہے کہ کہیں جون ایلیا کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش نہ آئے۔شاعروں کو طویل اور دلچسپ دیباچے لکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیوں کہ یہ شاعری کی مقبولیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں''۔ [2]

---

[1]۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص 124 [2]۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص 257

۱۱۔فلیپ نگاری

فلیپ نگاری کا مقصد ہوتا ہے کہ ایک نظر میں یا چند سطروں میں کسی کتاب کے متعلق یا کسی مصنف کے متعلق چند باتیں کہہ دیئے جائیں جس سے پڑھنے والے کتاب یا مصنف سے متاثر ہوں۔موجودہ دور میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہوگی جس پر کسی بڑے ادیب کا فلیپ نہ لکھا گیا ہو مشفق خواجہ کو بھی فلیپ نگاری کا بہت شوق ہے جس کی دلچسپی کا اظہار وہ مزاحیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

> ''ہم خدا کے فضل سے فلیپ نگاری اور دیباچہ نویسی میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ صرف مصنف اور کتاب کا نام سن کر موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں۔شفیقہ فرحت صاحبہ کا مقالہ چھپے گا تو انشاءاللہ ہماری مذکورہ رائے حرف بحرف درست ثابت ہوگی۔اگر خدانخواستہ معاملہ اس سے برعکس ہونے کا امکان ہوا تو ہم محترمہ سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنا مقالہ شائع نہ کرائیں تا کہ ہماری تنقیدی بصیرت کا بھرم رہ جائے''۔ [1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ کسی کتاب پر فلیپ لکھنے کے معنی ایسے ہیں کے جس موضوع پر وہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے مصنف کو اس موضوع کے ماہر ادیب ہونے کی سند دی جائے۔ان کے نزدیک بعض اوقات فلیپ لکھنے والے سے رائے دینے میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔یعنی ایک ہی طرح کی رائے یا ایک ہی طرح کے جملے مختلف ادیبوں کے بارے میں کہے جاتے ہیں جس پر دوسرے اعتراضات کرتے ہیں، ایسی ہی سردار جعفری کی فلیپ نگاری سے ساقی فاروقی کو اعتراض تھا۔اس کی تفصیل مشفق خواجہ کی زبانی سنیئے۔کہتے ہیں:

> ''ساقی کے محبوب شاعر سردار جعفری اور احمد فراز ہیں۔ان دونوں کے ذکر سے انہیں بڑا لطف آتا ہے۔گفتگو کسی بھی موضوع پر ہو، تان انہیں دونوں پر ٹوٹتی ہے اور کبھی کبھی تو قلم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔مثلاً زہرا نگاہ کے مجموعہ کلام ''شام کا پہلا

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص 97

تارا'' کے فلیپ پر سردار جعفری کی جو رائے درج ہے اسے دیکھ کر ساقی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: گرد پوش پر سردار جعفری کی رومانی، مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعر سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لیے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لیے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نثر ان کی شاعری کی طرح بے اعتبار ہے''۔

ہمارے خیال میں اتنا قصور سردار جعفری کا نہیں جتنا پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کا ہے جو اچھی شاعرات ہونے کے باوجود سردار جعفری سے سند حاصل کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ ساقی نے عمر بھر میں دو تین فلیپ ہی لکھے ہیں، اس لیے وہ ان لوگوں کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے جنہیں ایک سال میں دو دو درجن کتابوں پر فلیپ لکھنے پڑتے ہیں''۔ [1]

اس قدر طویل اقتباس دینے کا مقصد صرف مشفق خواجہ کے مزاحیہ اسلوب کی مثال پیش کرنا تھا اور پوری تفصیلات سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا تا کہ بات واضح ہو سکے۔

بعض کتابوں کے فلیپ اس قدر مناسب ہوتے ہیں کہ موضوع کا حق ادا کرتے ہیں اور پڑھنے والے ایک ہی نظر میں پوری کتاب کی خوبیوں کو جان لیتے ہیں۔ منظر صاحب کی شاعری پر لکھے گئے فلیپ کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سچی بات یہ ہے کہ منظر صاحب کی شاعری کی خصوصیات کا صحیح اندازہ ان کی شاعری سے نہیں، ان کے فلیپ نگاروں اور دیباچہ نویسوں کی آرا سے ہوتا ہے۔ دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے یا پڑھے بغیر ورق گردانی کر جایئے۔ آپ پر ایک نشہ سا طاری ہو جائے گا لیکن اس کا سبب معلوم نہیں ہوگا تب تین عدد فلیپ نگار اور تین عدد دیباچہ نویس آپ کو بتائیں گے کہ منظر صاحب کی شاعری کا جادو سر پر چڑھ کر کیوں بولتا ہے''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 177 [2] سخن ہائے گسترانہ، ص 321

جب کوئی کتاب شہرت کے مقام تک پہنچ جاتی ہے تو اس کتاب کا فلیپ نگار بھی اپنے آپ کو اس شہرت کا حصہ دار سمجھتا ہے جب کہ کوئی بھی کتاب کسی دیباچہ یا فلیپ کی وجہ سے شہرت کے مقام تک نہیں پہنچتی بلکہ مصنف کی تخلیقی صلاحیت اسلوب کی انفرادیت ،موضوع کی جدت کی وجہ سے شہرت حاصل کرتی ہے۔ مشفق خواجہ نے ہمارے ایسے ہی فلیپ نگاروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے:

''پروین شاکر کا ذکر آیا تو ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ پچھلے دنوں پروین شاکر کو جب ان کے نئے مجموعہ پر اکادمی ادبیات کا چالیس ہزار کا انعام ملا تو ساقی فاروقی نے کہا ''اس رقم میں سے دس فی صد کا میں حق دار ہوں کیونکہ انعام یافتہ مجموعے کا فلیپ میں نے لکھا ہے۔ یہ بات نظیر صدیقی تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا ''ساقی فاروقی کا حصہ ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے وہ مجھے ملنی چاہئیکیونکہ پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت میرے مقالے کی وجہ سے ہے''۔ اس واقعے سے ہمارے فلیپ نگاروں اور نقادوں کی اخلاقی نیز مالی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ [1]

اکثر و بیشتر مختلف واقعات کے ذریعہ بھی مزاح نگار سماج کی خامیوں کو پیش کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا ہے مذکورہ اقتباس میں بھی مشفق خواجہ کی یہ کوشش نظر آتی ہے، وہ اکثر و بیشتر ادیبوں کے واقعات کو لے کر اردو ادب کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں، اور پھر ناگوار صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

دیباچہ نگاری اور فلیپ نگاری کی طرح ہمارے اردو ادب میں کتابوں پر دوسروں کی رائے لینے کا بھی رجحان زیادہ ملتا ہے مشفق خواجہ کے مطابق دراصل کتابوں پر رائے لی نہیں جاتی بلکہ دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں حالت اس کے برعکس ہے۔ آج کل شعراء و ادیب اپنی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ

---

[1] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 156

ادب شناس لوگوں کے آراء کے ساتھ شائع کرنا پسند کرتے ہیں اوراس کام کے لیے وہ اتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں جتنی کہ کتابیں لکھنے میں نہ کی ہو۔لہذا شاعر وادیب کے اس رجحان پر طنز کرتے ہوئے اپنے تجربات کے حوالے سے ادب کی صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں:

> ''یہ شاعر، شاعری پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے۔ جتنا اپنی شاعری پر دوسروں کی رائے لکھوانے پر صرف کرتے ہیں۔آج کل ہر دیوان پر آٹھ دس افراد کی آراضرور ہوتی ہیں یہ آرا لکھوانے کے لیے شعرائے کرام دربدر ٹھوکریں کھاتے ہیں سو آدمیوں سے ملتے ہیں تو کب کہیں دس رائے لکھ کر دیتے ہیں۔ایک مرتبہ ایک شاعر صاحب ہمارے پاس بھی چلے آئے۔ہم نے عرض کیا کہ ہم نقاد نہیں ہیں۔اس لیے ہم سے رائے لکھوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔کہنے لگے آپ کالم نگار تو ہیں۔ہم نے کہا تو پھر کالم لکھ دیں گے۔کہنے لگے وہ تو آپ اپنی مرضی کا لکھیں گے۔رائے تو ہم اپنی مرضی کی لکھوانا چاہتے ہیں۔ان کے شدید اصرار پر ہم نے فلیپ کے لیے چند سطریں لکھ دیں، جن میں شاعر مذکورہ کو میر و غالب کے قبیلے کا شاعر بنایا گیا تھا۔کتاب چھپ کر آئی تو ہم نے کالم بھی لکھ دیا اوراس میں عرض کیا کہ ایک عدد رائے دہندہ نے شاعر مذکور کو غالب و میر کے قبیلے کا شاعر قرار دیا ہے جس کا مقصد شاعر کا درجہ بڑھانا نہیں، میر و غالب کا مرتبہ کم کرنا ہے۔یہ کالم پڑھ کر شاعر صاحب دوبارہ ہمارے پاس آئے اور ہمارا شکریہ ادا کیا اور فرمایا:
>
> آپ نے میری کتاب پر فلیپ لکھ کر میر و غالب کی عزت افزائی کی تھی۔
>
> آپ کے کالم سے میری عزت افزائی ہوئی''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء وادیب نہ صرف ایک سے زیادہ آراء لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی تصانیف پر اپنی مرضی کی آراء لکھنوانا بھی پسند کرتے ہیں۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص343

ڈاکٹر گیا چند جین نے ایک جگہ اس بات کی شکایت کی تھی کہ ''ہر صاحب عطا (شاعر) چاہتا ہے کہ کتاب پر مفصل رائے دی جائے۔ مراد ہے مفصل تحسین کی جائے۔ اصرار پر اصرار ہوتا ہے مفصل لکھیئے۔ گیان چند جین کی اس شکایت پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا واسطہ کسی روایتی قسم کے شاعر سے پڑا ہے ورنہ آج کل کے شاعر خود ہی رائے لکھ لیتے ہیں اور آ کر دستخط کرا لیتے ہیں۔ اس سے آگے خود مشفق خواجہ کی زبانی سنیئے۔

> خود ہمارا تجربہ اس سلسلے میں خاصا دلچسپ بلکہ عبرت انگیز ہے۔ خدا جانے کس غلط فہمی میں ایک شاعر صاحب اپنا دیوان لے کر آئے اور اس پر رائے لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے مصروفیت کا عذر پیش کیا تو فرمانے لگے ''اس کا مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے میں کچھ سطریں لکھ کر لے آیا ہوں۔ بس آپ صرف دستخط کر دیئے۔ ہم نے ان سطروں کو دیکھا جن کا سلسلہ کئی مضمون تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک جگہ نظر ٹھہر گئی موصوف نے غالب سے اپنا موازنہ کر رکھا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ غالب مغلوب نظر آتے تھے۔ ہم نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو کہنے لگے ''کوئی بات نہیں۔ آپ دستخط نہیں کر سکتے تو انگوٹھا ہی لگا دیجیے۔''
>
> [1]

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب و شاعر اپنے تعلق سے توصیفی کلمات لکھوانے میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ غرض اس طرح کی دلچسپی رکھنے والے چند ادیبوں کو بھی مشفق خواجہ نے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ جیسے منظر علی خان منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> منظر صاحب کی جب کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس پر کم از کم ایک درجن افراد کی قیمتی آراء درج ہوتی ہیں۔ قیمتی اس لیے کہ منظر صاحب آرا لکھوانے کے لیے اپنی کار کا پٹرول اور رائے لکھنے والے کا سیروں خون جلاتے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 187

ہیں۔اوراس کتاب کے ساتھ جوبروشر چھپتا ہے، چار پانچ درج اہل الرائے اس میں بھی نظر آتے ہیں۔منظر صاحب کی وسیع القلبی کااس سے اندازہ کیجئے کہ جن لوگوں کوقانون کی روسے ووٹ دینے کاحق نہیں انہیں بھی وہ رائے دینے کے لائق سمجھتے ہیں۔اب تک ایک سو سے زائد افرادمنظر صاحب کی کتابوں کے بارے میں لکھ چکے ہیں اوران میں بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں پہلی اورآخری بارمنظر صاحب ہی کی فرمائش پر کچھ لکھنے کاموقع ملا۔ان سب لکھنے والوں نے اچھی اچھی رایوں کااظہارکیا ہے۔اوراس بات سے بے پرواہ ہوکر کہ خودان کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے تبدیل ہوسکتی ہے۔'' [1]

مظہرامام کابھی یہی حال ہے مظہرامام کے بارے میں مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

''کلام پر رائے دینے والے نہ سہی اپنے کلام پر رائے لینے کے سلسلہ میں مظہرامام خاصے فراخ دل ہیں۔گذشتہ ربع صدی میں انتقال کرنے والاشاید ہی کوئی ادیب ہوگا جس کامظہرامام نے گھیراؤنہ کیاہو(گھیراؤایک سیاسی اصطلاح ہے،مظہرامام کے طریقہ واردات کی وضاحت کے لیے اس سے بہترلفظ نہیں مل سکتا)۔حدتو یہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر ذاکرحسین کوبھی نہیں بخشا جواس وقت جمہوریہ ہند کے نائب صدر تھے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں جس مروت سے کام لیا ہے وہ بے مثال ہے۔فرماتے ہیں: میں ایک نشست میں زیادہ شعر نہیں پڑھتا۔ٹھہرٹھہرکردم لے کر چلتاہوں لیکن آپ کی غزلیں جورات شروع کیں تو سب ہی پڑھ ڈالیں۔کئی شعروں کو دیر تک گنگنایا.....نظمیں شروع کرنے سے پہلےغزلیں پھرکم ازکم ایک مرتبہ اورپڑھوں گا''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جابجا کتابوں پر دی گئی آراء کوبھی اپنے طنز ومزاح کاہدف بنایا

۱۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص 317

۲۔سخن درسخن،ص 102

ہے۔ جیسے محمد حسن کی کتاب ''کرشن بھی مر گیا'' پر خواجہ احمد عباس کی یہ رائے درج ہے کہ ''خوبصورت جذباتی، جھوٹی کتاب'' اس رائے کو اپنے مزاح کا ہدف بنا کر مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

''کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں خواجہ احمد عباس کی یہ رائے درج ہے:

''خوبصورت، جذباتی، جھوٹی کتاب، قطع نظر اس سے کہ مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ خواجہ صاحب نے یہ رائے کب اور کہاں ظاہر کی، ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب سب کچھ ہو سکتی ہے، جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ سچ ہے۔ بغرض محال اگر خواجہ احمد عباس کی بات مان بھی لی جائے کہ یہ جھوٹی کتاب ہے تو تب بھی مصنف کو اس کاوش کی داد دینی چاہئے کہ پونے چار سو صفحوں میں مسلسل جھوٹ بولنا بڑی ہمت کی بات ہے''۔ [1]

غرض دیباچہ نگاری، فلیپ نگاری اور کتابوں پر آراء کے سلسلے میں مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں بہت لکھا ہے اور کہیں تشبیہات، استعارات، محاوروں میں تحریف اور ضرب المثال کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تو کہیں وقوع پذیر واقعات اور اپنے تجربات کے ذریعہ مذکور ادیبوں کی خامیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے، کہیں وہ ہلکے پھلکے مزاح کے ذریعہ دبے ہوئے الفاظ میں ادب کی اس ناگوار صورت حال پر افسوس کرتے ہیں تو کہیں برہم ہو کر نہایت ہی سخت لہجہ اختیار کرتے ہیں، لیکن ان اقتباسات سے مطالعہ سے ہمیں ادب کے تئیں ان کے ہمدردانہ رویہ کا علم ہوتا ہے۔

شاعری

مشفق خواجہ موجودہ دور کی شاعری سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے ان کا کہنا ہے کہ شعرا کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن شاعری کہیں نظر نہیں آ رہی ہے اور ادب کا سنجیدہ قاری عصر حاضر کی شاعری کے معیار سے پریشان ہے ان کے مطابق شاعر شاعری کو معیاری بنانے کی نہیں سوچ رہے ہیں بلکہ اس

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 331

پریشانی میں مبتلا ہیں کہ موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ شاعری کی اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کے اعتبار سے اردو زبان آج کل قحط سالی کا شکار ہے۔ مشاعرے پہلے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ مجموعہ ہائے کلام بھی کثرت سے چھپ رہے ہیں۔ کسی قسم کی منصوبہ بندی کے پروگرام پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے شاعروں کی تعداد میں بھی خوف ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر شاعری کہیں نظر نہیں آتی۔ اس مایوس کن صورت حال سے ادب کے سنجیدہ قاری پریشان ہیں۔ لیکن خود شاعروں کا یہ حال ہے کہ وہ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ آج کے دور میں سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب شاعری روبہ زوال ہو، اگر کوئی اپنے آپ کو سب سے بڑا شاعر منوانے کی فکر میں ہو تو اس شاعرانہ نازک خیالی بلکہ بے خیالی کی داد دینی چاہئے''۔ [1]

موجودہ دور کی شاعری کے تعلق سے یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ مقبول شاعری وہی ہے جو نغموں کے طور پر گائی جا رہی ہے اور شعراء بھی اپنی شہرت کا انحصار اسی پر کر رہے ہیں لہذا مشفق خواجہ نے فیض کے حوالے سے شاعری کی اس صورت حال پر غم و غصہ کا اظہار کیا ہے وہ رقم طراز ہیں:

پانچویں دہائی کے ابتدائی تین چار برسوں میں جب فیض کی کوئی نظم یا غزل جیل سے اسمگل ہو کر ادبی حلقوں میں بطور سوغات تقسیم ہوتی تھی تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ ''منھ سے نکلی کوٹھوں چڑھی'' کا صحیح مفہوم اسی زمانے میں سمجھ میں آیا کہ ہر ادب دوست کی زبان پر فیض کی کسی نظم کا کوئی مصرع یا غزل کا کوئی شعر ہوتا۔ آج کل تو شاعر اور شاعری دونوں کی مقبولیت و شہرت کا انحصار گانے والوں پر ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں گانے والے شاعر کو شاعر نہیں بناتے تھے۔ شاعر

---

[1] سخن در سخن، ص 207

جو کچھ بنتا تھا اپنے ہی زورِ سخن سے بنتا تھا۔[1]

انیس ناگی نے ایک جگہ نئی شاعری یعنی 1960ء کے بعد کی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ 60 کے بعد کی نئی شاعری کی تحریک نے شاعری کو ہی نہیں بلکہ نثر کو بھی متاثر کیا ہے اس حوالے سے انیس ناگی نے انور سجاد اور انتظار حسین کی مثال دی تھی کہ ان کی نثر میں 60 کے بعد جو تبدیلیاں آئیں ہیں وہ نئی شاعری کی تحریک کی وجہ سے آئیں ہیں۔ انیس ناگی کے اس بیان پر اختلاف کرتے ہوئے نئی شاعری کو انہوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے لکھتے ہیں:

> ''انور سجاد کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم نے ان کے افسانے نہیں پڑھے، ٹی وی ڈراموں میں ان کی اداکاری ضروری دیکھی ہے اور اس پر نئی شاعری کے بے معنویت کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن انتظار حسین کو نئی شاعری سے متاثر قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ فیض احمد فیض نے حاجی لق لق کے اخباری کالموں کے زیر اثر اپنی شاعری کا رخ متعین کیا۔'' [2]

ایک اور جگہ نئی شاعری کو عذرا عباس کے حوالے سے نئی نہیں بلکہ فرسودہ و کرم خوردہ شاعری کہا ہے کہتے ہیں:

> ''عذرا عباس کا یہ کہنا درست ہے کہ نئی شاعری اب خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ بیس برسوں سے تو وہ لکھ رہی ہیں اور جو نثری غزلیں بزرگ شاعر شہرت بخاری لکھ رہے ہیں انہیں بھی نئی شاعری کا حصہ سمجھ لیا جائے تو نئی شاعری کی عمر نصف صدی کے قریب ٹھہرتی ہے اور اگر مس حجاب اسماعیل کی نثری نظم ''الو'' کو نئی شاعری کا نقطہ آغاز سمجھا جائے تو اس شاعری کی عمر 64 برس قرار پاتی ہے۔ اتنی پرانی اور کہنہ و فرسودہ بلکہ کرم خوردہ شاعری کو نئی شاعری کا نام دینا ایسا ہی ہے جیسے زنگی کا نام کافور رکھ دیا جائے۔ [3]

---

[1] ۔سخن ہائے ناگفتنی، ص:75
[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص86
[3] ۔سخن ہائے ناگفتنی، ص50

مشفق خواجہ نے پاکستان کی شاعری کو بھی اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں کثرت سے روایتی اور بے مزہ قسم کی شاعری ہو رہی ہے ایسی صورت حال میں حسن عابدی کی شاعری کو مشفق خواجہ نے بے مزہ قسم کی شاعری کا کفارہ کہا ہے اور ان کی شاعری کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے پاکستان کی موجودہ شاعری پر طنز کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> ''ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہم جب بھی کسی شاعر کی یا اس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو بیمار پڑ جاتے ہیں اور یوں جھوٹ بولنے کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے لیکن اس وقت ہمیں سچ بولنے کی بھی سزا مل رہی ہے کہ حسن عابدی کی شاعری کی تعریف کے لیے مناسب الفاظ دستیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ بہر حال ہم اس قدر تو ضرور کہیں گے کہ پاکستان میں جو بے مزہ اور روایتی قسم کی شاعری ہو رہی ہے حسن عابدی نے ''نوشت نے'' کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ بہت دنوں بعد ایک ایسا مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جدید اردو شاعری کے چند نمائندہ مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ پاکستان میں ہونے والی شاعری کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی شاعری سے بھی مایوس نظر آتے ہیں یہاں کی شاعری کے تعلق سے ان کا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف شاعروں کے نام ہی الگ ہوتے ہیں شاعری تو سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیات کو ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ لہذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تا کہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے۔

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 77

> شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور اندازِ بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوادی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمٰن فاروقی ہوں۔ انہوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کی شاعری کو پسند تو کرتے ہیں لیکن اس کے موضوعات کی یکسانیت سے انہیں اعتراض ہے۔

ادیب

مشفق خواجہ کے کالموں کا ایک اہم موضوع ادیب ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق ہمارے ادیبوں میں کئی ایک خامیاں موجود ہیں۔ انہیں اس بات سے اعتراض ہے کہ وہ ادب سے غیر ادبی کام لیتے ہیں اور ادب سے زیادہ اپنی ذاتی تشہیر میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں بحیثیت ادیب کسی اخبار میں اپنا نام چھپنے کو ہی ادیب کا اہم مقصد سمجھتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق ہمارے ادیبوں کے پاس مطالعہ کی کمی ہے جس کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر معیاری ہوتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے ادیب ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف بولنے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ غرض ہمارے ادیبوں کی ایسی ہی کئی خامیوں کو انہوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

ادب کی دنیا میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک ادیب کے نظریہ سے دوسرے ادیب کو اکثر اختلاف ہوتا ہے مشفق خواجہ کے مطابق کسی ادیب سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اگر اس کے صاحب نظر ہونے کی گواہی دیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کوئی معمولی ادیب نہیں ہے۔ موجودہ دور میں ادیبوں کے بیچ گروہ بندی آ گئی ہے اور ہمیشہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف رہتا ہے اس سے بڑھ کر ہر ادیب اپنی ذاتی تشہیر میں لگا

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 19

ہوا ہے۔ادیبوں کی اس صورت حال پر بھی مشفق خواجہ کو افسوس ہے وہ اپنے مزاحیہ کردار لاغر مراد آبادی سے موجود ادبی صورت حال پر گفتگو کرتے ہیں مکالماتی انداز میں ان کی گفتگو ملاحظہ ہو:

''ہم: آپ کے حالات تو بہت دلچسپ ہیں ۔اب آپ موجودہ ادبی صورت حال کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے؟

وہ: نہایت تشویش ناک صورت حال ہے۔

ہم: وہ کس طرح؟

وہ: ہر شخص گروہ بندی اور ذاتی تشہیر کے مرض میں مبتلا ہے۔ادیب ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں، کوئی اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔حالاں کہ ان ادیبوں کے نزدیک ادب مکھی مارنے کے عمل ہی کا نام ہے۔انہیں سوچنا چاہیے کہ جب ناک پر مکھی نہیں بیٹھے گی تو اسے مارا کیسے جائے گا؟ بھلا یہ بھی کوئی افسانے کا موضوع ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے نزدیک ادیبوں کی ذاتی تشہیر کا یہ عالم ہے کہ وہ ادب کی طرف پوری لگن کے ساتھ گامزن نہیں ہیں اور ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری تشہیر ہی ادب کی تشہیر ہے اور اپنی تشہیر کے لیے وہ ہمیشہ کسی اخبار کی ادبی رپورٹ میں اپنا نام شامل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔مشفق خواجہ کے مطابق ادیب اپنی ذاتی تشہیر کے لئے، ایک اور طریقہ یہ بھی اپناتے ہیں کہ وہ اپنی تصانیف کے ساتھ خود ہی ایک تبصرہ لکھ کر اخبارات کو بھیج دیتے ہیں۔

اسی طرح ادیبوں کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ کسی بھی موضوع پر کتاب لکھنے کے لیے ادیب کو اس موضوع کے سیاق وسباق کا مطالعہ کرنا ضروری ہے لیکن مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ جس طرح سے ہمارے ادیب کتابیں لکھتے ہیں انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کتاب لکھنے کے لیے مطالعہ کی نہیں صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق ہمارے بیشتر ادیبوں کی مطالعہ سے دلچسپی کم ہوگئی ہے وہ

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:172

اب پڑھنے سے جی چراتے ہیں۔انہوں نے خود کوطنز کا نشانہ بناتے ہوئے ادیبوں کی اس خامی کو بے نقاب کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''تقریباً بیس ہفتوں کی گمشدگی کے بعد ہم اپنے قارئین کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں۔غیر حاضری کا سبب صرف اتنا تھا کہ جس طرح ادیب برادری کے اکثر اراکین پڑھنے سے کتراتے ہیں اسی طرح ہم لکھنے سے جی چراتے ہیں''۔ [1]

ایک اور جگہ ادیبوں کے اس خرابی پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :

''پچھلے ڈیڑھ دو مہینوں میں دو درجن سے زیادہ نئی کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں اور اس لائق ہے کہ ہم اس بارے میں اپنے تاثرات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائیں،لیکن مشکل یہ ہے کہ تاثرات پیش کرنے کے لیے کسی کتاب کا نظر سے گزرنا ہی کافی نہیں،اس کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔یہ کام تو آج کل کتابیں لکھنے والے بھی نہیں کرتے تو ہم کیسے کرسکتے ہیں۔'' [2]

مشفق خواجہ ادیبوں کے ادبی معیار سے بھی مایوس نظر آتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ادیبوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہورہا ہے لیکن معیاری ادب تخلیق نہیں ہو پارہا ہے۔اور وہ اس سلسلے میں یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ جس طرح سرکاری ملازمین کو ان کی ناکارکردگی کی وجہ سے زبردستی ریٹائرڈ کردیا جاتا ہے اسی طرح ہمارے ادب میں بھی اس سلسلہ کو شروع کردینا چاہیے۔بڑے دلچسپ اور مذاحیہ انداز میں وہ غیر معیاری ادب تخلیق کرنے والوں پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''پچھلے دنوں کرکٹ کے نام ور کھلاڑی جاوید میاں داد نے غصے میں آکر کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تو اس پر ایک ادب دوست نے ہم سے

1۔سخن ہائے گسترانہ،ص 268

2۔سخن ہائے گسترانہ،ص 137

پوچھا، اس قسم کا غصہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو کیوں نہیں آتا۔ ہم نے عرض کیا، ہمارے ادیب اور شاعر اپنا سارا غصہ ادب پر ہی نکال لیتے ہیں اور خود اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ کہنے لگے، صورت حال نہایت تشویشناک ہے۔ ادیبوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن معیاری ادبی تخلیقات کا قحط ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ جو ادیب غیر معیاری تحریروں کے انبار لگا رہے ہیں وہ ادب سے غائب ہو کر کوئی آبرومندانہ پیشہ اختیار کریں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری طور پر ریٹائر کر دیا جاتا ہے اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے"۔ [1]

ہمارے ادیبوں کے پاس یہ خیال عام ہے کہ کسی بھی کتاب کا مصنف اگر زندہ ہو تو اپنی کتاب کے مشمولات کا فیصلہ کرنا صرف اسی کا حق ہے۔ لیکن مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ ہمارے ادب میں غیر معیاری کتابوں کے اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہے غرض ادب کے اس بنیادی مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

"فہمیدہ ریاض نے ادب کے اس بنیادی مسئلہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے کہ اگر کتاب کا مصنف بقید حیات ہو تو اپنی کتاب کے مشمولات کا فیصلہ کرنا صرف اس کا حق ہے۔ ہماری عاجزانہ رائے میں ادب کی خرابی بلکہ خانہ خرابی کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ ہر مصنف اپنی کتاب کے مشمولات کا فیصلہ خود کرتا ہے۔ اگر یہ حق بہتر لوگوں کو منتقل کر دیا جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ زرمبادلہ کی بچت ہوگی۔ وہ اس طرح کہ جب بہتر لوگ فیصلہ کریں گے تو نوے فیصد کتابوں کے شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آئے گی جس کے نتیجہ میں خطیر زرمبادلہ صرف کر کے غیر ممالک سے کاغذ منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:98

ویسے بھی قومی ادب کو غیر ملکی کاغذ پر چھاپنا قومی حمیت وغیرت کے منافی ہے''۔[1]

شاعر

مشفق خواجہ نے جہاں اپنے اصناف ادب اور ادیبوں کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا وہیں اردو شاعروں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اردو شاعروں کی کئی ایک خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شاعری جلد سمجھ میں نہ آئے وہ اعلیٰ معیار کی شاعری ہے اور جس شاعری کو عام قاری جلد سمجھتا ہے اس کو ادنیٰ درجہ کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔اس صورت حال پر بھی مشفق خواجہ افسوس کرتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''بڑی شاعری کا دارومدار عموماً قاری کی عقل پر ہوتا ہے اور یوں معاملہ بے نتیجہ رہتا ہے۔اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بڑی شاعری اگر سمجھ میں آجائے تو وہ بڑی نہیں رہتی، چھوٹی پڑ جاتی ہے''۔ [2]

ایک اور جگہ معیاری شاعری کے تعلق سے لکھتے ہوئے مشفق خواجہ فرماتے ہیں کہ موجودہ دور میں بڑی شاعری تو کہیں نظر نہیں آتی وہ تو صرف کتابوں میں بند پڑی ہے لیکن شاعروں کی تو بھرمار ہے اور یہ شعراء اس قدر شہرت حاصل کرنے میں لگے ہیں کہ اپنی شاعری کے معیار کو جاننے کی بھی فرصت نہیں ہے غرض شعراء کی اس ذاتی تشہیر پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

> ''بڑے شاعر کسی فعل میں بند نہیں ہیں۔وہ مشاعروں کی واہ سمیٹنے سے لے کر پرائڈ آف پرفارمنس حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک ہونے تک ہر کام میں آگے آگے رہتے ہیں اور اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ شاعری گرد راہ کی طرح پیچھے رہ جاتی ہے''۔ [3]

---

[1] ۔سخن در سخن، ص:162 [2] ۔سخن در سخن، ص 34

[3] ۔ سخن در سخن، ص 217

مذکورہ اقتباس سے نئی نسل کے شاعروں کی حالت زار کا اندازہ ہوتا ہے

شعراء کے تعلق سے ایک قول مشہور ہے کہ شاعر اپنے خون جگر سے شعر لکھتا ہے۔ اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ اپنے عہد کے شاعروں کی شاعرانہ صلاحیتوں پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے:

''شاعر اپنے خون جگر سے شعر لکھتا ہے۔ اعلیٰ شاعری پسینے سے بھی لکھی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ شاعر میں لکھنے کی اور خون کی جگہ پسینہ بہانے کی صلاحیت ہو۔ شاید یہی وہ پسینہ ہے جسے علامہ اقبال ''عرقِ انفعال'' کہا کرتے تھے''۔[1]

اردو شاعری میں یہ روایت عام ہوگئی ہے کہ ہر کوئی شاعر اپنا کلیات چھپا رہا ہے اور اکثر و بیشتر شعراء اسی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح سے کلام کا کلیات چھپ جائے جب کہ کلیات چھپانے کا مقصد یہ کہ اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ جب کہ ہمارے بزرگ شاعروں کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ جب اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ جاتے تھے جہاں وہ محسوس کرتے تھے کہ اب ان سے کچھ کہا نہیں جائے گا تب اپنا تمام کلام کلیات کی صورت میں شائع کر دیتے تھے۔ لیکن موجودہ دور میں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ لہذا ایسے شاعروں کی اس خصوصیت پر مشفق خواجہ طنز کی گہری کاٹ کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں مثلاً فیض کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

''فیض صاحب نے کلیات شائع کی تھی تو انہیں اس کا حق تھا۔ وہ ستر سال سے اوپر کے ہو چکے تھے اور انہیں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے تھے۔ لیکن وہ شاعر جنہوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اور جو شاعری اور عمر کے اعتبار سے پختگی کی منزل تک نہیں پہنچے معلوم نہیں انہیں کیوں کلیات چھپوانے کا شوق ہو رہا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ آج کل ایک درجن سے زائد شعراء اپنی اپنی کلیات چھپوانے کی فکر میں ہیں۔ کاش یہ شاعر پہلے ''جزئیات'' میں کمال حاصل کرتے، صاحب کلیات ہونے کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے''۔[2]

---

[1] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 209

[2] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 60

مشفق خواجہ کے مطابق ایک زمانہ تھا کہ جب کسی شاعر کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے تو سب سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ان کے خیال میں اگر کسی شاعر کا مجموعہ شایع نہ ہوا تو اسے شاعر کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ پہلے زمانے میں شاعر کے مجموعے سے اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا تھا،اب خامیاں سامنے آجاتی ہیں۔ان کے مطابق سمجھ دار شاعر اسی لیے اپنا مجموعہ نہیں چھپواتے اور جو شاعر صرف شاعر ہوتے ہیں وہ نہ صرف مجموعہ چھپواتے ہیں بلکہ یکے بعد دیگر مجموعوں کی قطار باندھ دیتے ہیں ایسے شاعروں کی مثال پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے سامنے کئی ایسی مثالیں کہ کسی شاعر کے بارے میں اچھی رائے اس وقت خراب ہوگئی جب اس کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔دوسرے مجموعے کی اشاعت پر مزید خراب ہوگئی۔تیسرے مجموعے کے چھپنے کے بعد خرابی ہی خرابی رہ گئی شاعری غائب ہوگئی''۔ [1]

جب کوئی شاعر نئی غزل یا نظم تخلیق کرتا ہے تو سب سے پہلے اس تخلیق کو کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرنا لازمی سمجھتا تھا۔جس سے لوگوں کو اس کے علمی و ادبی کارناموں سے واقفیت ہو جاتی تھی لیکن مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں شعراء کی سوچ بدل گئی ہے اب کسی اخبار میں ادبی رپورٹ کے ذریعہ صرف اس کا نام بھی چھپ جائے تو وہ اپنے آپ کو ہر دن اخبار میں چھپنے والا ادیب سمجھنے لگتا ہے ایک واقعہ کے ذریعہ بڑے دلچسپ اور پر لطف انداز میں انہوں نے عصر حاضر کے شاعروں پر طنز کیا ہے:

> ''پچھلے دنوں ایک مشہور شاعر سے ہماری ملاقات ہوئی۔ہم نے یوں ہی اخلاقاً ان سے پوچھ لیا ''بہت دنوں سے آپ کی کوئی تخلیق نظر سے نہیں گذری''۔ انہوں نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کسی بداخلاقی کا ارتکاب کیا ہو۔پھر

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص 256

قدرغصے سے فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے اخبارات آپ کی نظر سے نہیں گزرتے'' ہم خاموش رہے۔ انہوں نے ہماری خاموشی کو لاعلمی تصور کرتے ہوئے اس کے ازالے کے لیے فرمایا: ''اگر آپ اخبارات دیکھتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس سال سب زیادہ تخلیقی کام میں نے کیا ہے۔ میرے سات انٹرویو چھپے ہیں۔ بائیس خبریں میرے حوالے سے شائع ہوئی ہیں۔ اور بے شمار ادبی رپورٹوں میں میرا ذکر موجود ہے۔

اب ہمارا خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ عرض کیا: ''یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ بتائے کہ آپ کی کوئی نظم یا غزل بھی شائع ہوئی ہے؟'' انہوں نے فرمایا: ''نظم یا غزل کی اشاعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ خود شاعر شائع ہو۔ اب یہی سب سے بڑا تخلیقی کام ہے''۔ [1]

اس عہد کا یہ بھی المیہ ہے کہ شعراء صرف کلیات چھپانے کی فکر میں نہیں رہتے بلکہ اپنے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ شعرا کے اس ذوق وشوق پر مشفق خواجہ کو اعتراض ہے وہ اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا کہ اردو کے شاعروں کو اپنا پہلا مجموعہ کلام جلد از جلد چھپوانے کا شوق ہوتا تھا تا کہ آپ بھی شرمسار ہو سکیں اور پڑھنے والے بھی۔ لیکن اب ان کے شوق کا میدان وسیع ہو گیا ہے۔ اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے اور کلیات چھپ جائے جسے دیکھیے وہ اپنے کلام کو انگریزی میں منتقل کرنے یا کلیات چھپوانے کی فکر میں ہے۔ غالب اور اقبال کے کلام کا ترجمہ ہوتا ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بڑے شاعر ہیں اور ان کی شاعری اس لائق ہے کہ انگریزی خواں دنیا اس سے استفادہ کرے۔ مگر ان شاعروں کو اپنے کلام کا ترجمہ کرانے کی کیا ضرورت ہے جن کا کلام اردو میں

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 218

بھی ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو اور ترجمہ بھی کسی
ایسے شخص نے کیا ہو جسے اصل زبان پر دسترس ہو نہ، اردو پر"۔ [1]

مشفق خواجہ کے مطابق شاعری کی صورتِ حال صرف موضوع یا مواد کے لحاظ سے ہی مایوس کن نہیں ہے بلکہ شعرا فن شاعری یعنی عروض و بلاغت سے بھی محروم ہیں بلکہ فن شاعری کے جو اصول مرتب کئے گئے تھے ان اصولوں میں یہ شعرا اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی کرتے ہوئے شاعری کر رہے ہیں۔ اس عہد کے شاعروں کی ان خصوصیات پر بھی انہوں نے بھرپور طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

"ہمارے شاعروں نے عروض میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ
ناموزوں اور خارج از بحر اشعار بھی لکھے ہیں۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ لوگ
عربی شعر موزوں پڑھ نہیں سکتے۔ ہم اس پر اتنا اضافہ کریں گے کہ اردو شعروں کو
موزوں پڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں"۔ [2]

ایک مرتبہ مجروح سلطان پوری نے کہا تھا کہ اچھا شاعر بننے کے لیے اچھا انسان بننا ضروری ہے۔ مجروح سلطان پوری کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے اس عہد کے شاعروں کا بڑے شگفتہ اور پر لطف انداز میں مذاق اڑایا ہے:

"مجروح صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اچھا شاعر بننے کے لیے اچھا انسان
بننا ضروری ہے۔ چونکہ موصوف حسنِ اتفاق سے اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے
انسان بھی، اس لیے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونا
آسان کام ہے۔ مجروح صاحب کی یہ بات اگر مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ
ہوگا کہ اچھا انسان نہ ہو وہ اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ ہماری رائے میں یہ نہایت
سفاکانہ نقطۂ نظر ہے کیونکہ آج کل جو ننانوے فیصد شاعر اچھی شاعری نہیں

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص59

[2] ۔سخن ہائے گسترانہ، کراچی، ص:59

کررہے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ اچھے انسان نہیں ہیں۔ہم ذاتی طور پر ایسے بہت سے شاعروں کو جانتے ہیں کہ جو نہایت اچھے انسان ہیں لیکن جب وہ شعر کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گھاس کاٹ رہے ہوں۔ اس بنا پر مجروح صاحب کا جملہ اس طرح ہوتا تو بہتر تھا کہ جو اچھا انسان نہ ہو وہ اچھی طرح گھاس نہیں کاٹ سکتا''۔ [1]

ایک جگہ مجروح سلطان پوری نے کہا تھا کہ اردو شاعری میں بڑے شاعر میرؔ، غالبؔ تھے اور اب جوشؔ اور اقبالؔ ہیں باقی تمام شعرا کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ ان بڑے شعرا کے لیے میٹریل جمع کررہے ہیں۔ مجروح صاحب کی رائے پر مشفق خواجہ نے بڑے مضحکہ انداز میں اعتراض کیا ہے اور میر و غالب کی برابری کرنے والے شعرا پر بھی طنز کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''مجروح صاحب نے ایک بات بڑی عجیب کہی ہے کہ بڑے شاعر میر و غالب تھے یا پھر جوش اور اقبال ہیں۔باقی تمام شاعروں کی اہمیت اتنی ہے کہ وہ بڑے شاعروں کے لیے میٹریل جمع کرتے ہیں۔اپنے ہم عصروں میں فیض، مجاز، سردار جعفری اور مخدوم وغیرہ کے نام لے کر انہوں نے کہا کہ یہ سب شاعر قد نہیں نکال سکے۔ان کوتاہ قد شاعروں میں مجروح صاحب نے اپنے آپ کو بھی شامل کرلیا ہے اور فرماتے ہیں ''ہوسکتا ہے کہ ہمارا میٹریل لے کر آئندہ کوئی بڑا شاعر پیدا ہو۔قطع نظر اس سے کہ جس میٹریل کی وجہ سے آپ خود بڑے شاعر نہیں بن سکے۔اسے لے کر کوئی دوسرا کیسے بڑا شاعر بن سکتا ہے۔ہمیں تو اس پر حیرت ہے کہ مجروح صاحب جیسا مقبول اور ہر دل عزیز شاعر اپنے آپ کو بڑے شاعروں میں شمار نہیں کرتا جب کہ آج کل تو یہ حالت ہے کہ نومولود شعرا جن کی شاعری ''اسقاطِ سخن'' قسم کی کوئی چیز ہے۔وہ بھی اپنے آپ کو میر کے برابر سمجھتے

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص313

ہیں"۔ [1]

ایک مرتبہ انیس ناگی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "انسان جب بچہ یا نابالغ ہوتا ہے تو اس پر وفور جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، اور شاعری اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ انیس ناگی کی اس رائے پر بھی مشفق خواجہ نے سخت اعتراض کیا ہے اور ان کے اس بیان کا جواب بڑے تیکھے انداز میں دیتے ہوئے ہمارے عہد کے شاعروں پر چوٹ بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس انٹرویو کا آغاز انیس ناگی کے اس بیان سے ہوتا ہے "میں نے لکھنے کی ابتداء شاعری سے کی ہے۔ انسان جب بچہ یا نابالغ ہوتا ہے تو اس پر وفور جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ شاعری اس جذبے کی پیداوار ہے"۔ کیا حکیمانہ بات ہے جسے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھنے والے اس بیان سے کوئی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں اور یہ سوال کر سکتے ہیں کہ شاعری اگر صرف بچوں اور نابالغوں کا کھیل ہے تو بچے بڑے اور بالغ ہو جانے کے بعد شعر کیوں کہتے ہیں؟ انیس ناگی کو کہاں فرصت کہ اس سوال کا جواب دیں ہمیں کچھ عرض کرتے ہیں بعض بچے بڑے اور بالغ ہونے کے بعد بھی بچپن ہی کی فضاء میں رہنا پسند کرتے ہیں، اس لئے شعر کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسی لیے شاعروں کو معصوم ترین مخلوق کہا جاتا ہے۔ اردو کے تو ناوے فی صد شعراء اپنی شاعری کے اعتبار سے خاصے معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ شاعری ہے یا شاعری کی معذرت"۔ [2]

ایک مرتبہ زاہدہ حنا نے اپنے ایک انٹرویو میں شعرا کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاعروں کو "شادی" نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس رشتہ کو نبھانے کا سلیقہ ان میں نہیں رہتا۔ مشفق خواجہ ان کے اس بیان

---

[1] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 312

[2] ۔ سخن ہائے ناگفتنی، ص: 125

میں لفظ ''شادی'' کو شاعری کے مفہوم میں لیتے ہوئے آج کے شاعروں پر طنز کے تیر چلائے ہیں ان کے مطابق کہ ان کی اس بے معنی شاعری سے شاعری کی آبرو خطرے میں ہے بڑے مزاحیہ لہجے میں وہ فرماتے ہیں:

> ''پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اس بیان میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''شاعری'' کی جگہ ''شادی'' کا لفظ چھپ گیا ہے۔ یعنی محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہمارے شاعروں کو شاعری نہیں کرنی چاہیے۔ بات معقول ہے کہ ہمارے شاعر آج کل جس طرح کی شاعری کر رہے ہیں، اس سے نہ صرف خود ان کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ شاعری کی آبرو بھی خطرے میں پڑ چکی ہے..... لیکن جب بیان کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ محترمہ شاعروں کو شاعری سے نہیں شادی سے اجتناب کا مشورہ دے رہی ہیں''۔ [1]

یوسف بخاری نے اپنے کلام کے مقدمہ میں جدید شعراء کی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہوئے کہا تھا کہ جدید شعرا کے مجموعے کلام کے نام بڑے عجیب ہوتے ہیں پہلے تین لفظی ہوا کرتے اور اب پانچ پانچ الفاظ تک نوبت آ گئی ہے۔ اور ان مجموعوں کے ناموں کے بارے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان کی معنوی نوعیت بظاہر ایسی ہے کہ سرورق پر صرف نام پڑھ کر گماں ہوتا ہے کہ شاید افسانوں کا مجموعہ یا کوئی ناول وغیرہ ہے۔ مثلاً پیاس کا صحرا، رازوں سے بھرا بستہ، میرے دل میرے مسافر، خالی ہاتھوں میں ارض وسما۔ یوسف بخاری کے اس بیان سے مشفق خواجہ کو بھی اتفاق ہے وہ ان جدید شعراء کے مجموعہ کلام کے ان ناموں پر بڑے پر مذاق انداز میں طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''بخاری صاحب نے جس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے وہ واقعی بہت اہم ہے۔ جدید شاعروں کو شاعری کرتے وقت نہ سہی اپنے مجموعوں کے نام رکھتے وقت تو شاعرانہ ذوق کا ثبوت دینا چاہئے اور ایسے ناموں سے اجتناب کرنا

---

[1] سخن ہائے گفتنی، ص:116

چاہئے جو ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' کے زمرے میں آتے ہوں۔ مثلاً پیاس کا صحرا، جغرافیے کی کتاب معلوم ہوتی ہے جس میں ''پیاس'' نامی صحرا کے بارے میں معلومات ہوں۔ ''رازوں سے بھرا بستہ'' جاسوسی ناول نظر آتا ہے۔ ''مرے دل مرے مسافر'' امراض قلب کے بارے میں کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ خالی ہاتھوں میں ارض وسما شعبدے بازی سے متعلق کتاب کا نام ہوسکتا ہے۔ [1]

کثیر التصانیف مصنفین

مشفق خواجہ نے ایک طرف اپنے کالموں میں کثیر التصانیف ادیبوں پر بھی بڑے تیکھے تیر چلائے ہیں اور ان کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے مثلاً ایک طرف وہ ان کی خدمات کو مزاحیہ انداز میں سراہتے ہیں تو دوسری طرف ان کی خامیوں پر بھی بڑے سخت لہجے میں طنز بھی کرتے ہیں۔ ہمارے کچھ ادیب ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیشہ اپنی تصانیف کی تعداد بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ خواہ وہ کتابیں کارآمد ہوں یا نہ ہو۔ ادیبوں کے اس فعل پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''کثیر التصانیف مصنفین کا حال بھی کثیر الاولاد جیسا ہوتا ہے کہ وہ تعداد میں اضافے ہی سے خوش ہوتے رہتے ہیں، کسی دوسری چیز سے مطلب نہیں رکھتے''۔ [2]

ایک اور جگہ کثیر التصانیف ادیبوں پر یوسف ناظم کے حوالے سے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

> یوسف ناظم کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ کثیر العیال لوگ اپنے لیے اور کثیر التصانیف مصنف دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ [3]

مشفق خواجہ کے نزدیک ادیب کے لیے کثیر التصانیف ہونا عیب نہیں ہیلیکن ہمارے ادب میں

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:326

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص 176

[3] سخن ہائے گسترانہ، ص:42

اکثر وبیشتر ادیب ادب کی دنیا میں اپنے آپ کو منوانے کے لیے کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی شناخت بنانے کے لیے۔ کسی بھی میدان میں اپنی شناخت بنانے کے لیے ایک آدھ مظاہرہ ہی کافی ہوتا ہے بہ شرط یہ کہ اس میں متاثر کرنے والی کیفیت ہو۔ مشفق خواجہ کا خیال میں ہمارے ادیب اپنی تصانیف کی تعداد صرف اسی مقصد کے لیے بڑھا رہے ہیں کہ انہیں ادیب مان لیا جائے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> 'کثیر التصانیف مصنفین کے بارے میں عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ وہ زیادہ کتابیں لکھتے ہی اس لیے ہیں کہ انہیں مصنف مان لیا جائے، بالکل اسی طرح جس طرح نازیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جھوٹ بار بار بولا جائے تو اسے سچ مان لیا جاتا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے مطابق کثیر العیال آدمی کی طرح کثیر التصانیف مصنف بھی ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔ مظفر علی خان منظر کی تصانیف کے حوالے سے وہ کثیر التصانیف ادیبوں پر طنز کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> منظر علی خان منظر ادب اور زندگی دونوں میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان کی پہلی کتاب ''کرب آگہی'' شائع ہوئی تھی اور آج یہ صورتِ حال ہے کہ ان کی چار کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور اتنی ہی کتابت وطباعت اور جلد سازی کے مرحلے میں ہیں اور جو زیرِ تصنیف وتالیف ہیں ان کی تعداد خدا جانتا ہے یا خود منظر صاحب۔ آدمی کثیر العیال ہو یا کثیر التصانیف، دونوں صورتوں میں ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے'' [2]

مشفق خواجہ نے بعض جگہوں پر ہمارے باصلاحیت ادیب و دانشوروں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے کثیر التصانیف ہونے کو سراہا بھی ہے اور انہیں اردو ادب کی شان بھی قرار دیا ہے ایک

---

[1] ۔ سخن ہائے ناگفتنی، ص: 154

[2] ۔ سخن ہائے گسترانہ، ص 319

اقتباس دیکھئے جس میں انہوں نے وزیر آغا کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کا اس طرح مزاحیہ خاکہ کھینچا ہے۔فرماتے ہیں:

> مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ہم آغا صاحب کی تصانیف کی تعداد پر حیرت کا اظہار کرلیں دوہزار سے زیادہ تصانیف پر حیرت ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔افسوس کا نہیں۔افسوس کا مقام تو تب ہوتا جب دوہزار کی تعداد میں دوچار کی کمی رہ جاتی۔ غالب کے شاگرد صغیر بلگرامی نے اپنی تصانیف کی تعداد ساڑھے نوسو بتائی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہر رباعی کو ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے اور یوں سینکڑوں رباعیاں سینکڑوں تصانیف کی صورت اختیار کرگئی ہیں۔آغا صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ممکن ہے انہوں نے اپنی ہر کتاب کے ہر باب کو یا ہر مختصر مضمون یا افسانے کو نیز احباب کے نام لکھے گئے ہر خط کو ایک مستقل تصنیف سمجھا ہو اور اس طرح دوہزار سے زیادہ تصانیف وجود میں آگئی ہوں۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان میں ایک ایسا مصنف بھی موجود ہے جس کا ذکر تاریخ ادب میں نہ سہی، گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں تو آہی سکتا ہے"۔ [1]

ادبی شخصیات

مشفق خواجہ نے اردو ادب کی خصوصیات کے علاوہ اردو ادب کی بے شمار ادبی شخصیات کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے کبھی یہ ان شخصیات کے علمی و ادبی کارنامے کو سراہاتے ہیں تو کبھی ان کی علمی خامیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور کبھی کبھار ان کی پہلو دار شخصیت کا مزاحیہ خاکہ بھی اڑاتے ہیں۔ ذیل میں چند ایسی ہی ادبی شخصیات کو پیش کیا جارہا ہے جن پر مشفق خواجہ نے کبھی طنز کے تیر چلاتے ہیں تو کبھی مزاح کے پہلو میں ان کی شخصیت اور کارناموں کو سراہا ہے، وہ یہ ہیں۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 330

عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز خالد اردو ادب کی ایک پہلو دار شخصیت ہے۔علم وفضل اور قادرالکلامی میں اپنی مثال آپ ہیں۔غرض مشفق خواجہ نے ان کی عظمت کا اعتراف واپنے مزاحیہ اسلوب کے ساتھ پیش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

> عبدالعزیز خالد ایک غیر معمولی ادبی شخصیت ہیں۔علم وفضل کے اعتبار سے وہ ایسے قدر آور ہیں کہ ان کی طرف دیکھنے والوں کی ٹوپی گر جاتی ہے اور ان کا علم و فضل اتنا وزنی ہے کہ اس کی زد میں آکر ٹوپی کے ساتھ اس کا پہننے والا بھی گر جاتا ہے۔ قادرالکلام وہ ایسے ہیں کہ ذرا سی بات کو پھیلا کر کتاب بنا سکتے ہیں اور کتاب کے تمام مطالب کو ایک مصرعے میں سمیٹ سکتے ہیں۔ گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا اور کوزے کے پانی کو سمندر میں تبدیل کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دائیں ہاتھ کا کھیل یہ ہے کہ وہ خالد کے خیالات عالیہ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس میں مشفق خواجہ نے محاوروں میں الفاظ کے الٹ پھیر سے بڑی خوبصورتی سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

الطاف گوہر

ہر ادیب کو بڑے انہماک اور دلجوئی سے لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ بعض لوگ دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ کام نہیں کر پاتے اسی طرح الطاف گوہر بھی ایک اچھے ادیب ہیں لیکن ان کی ادبی شخصیت سرکاری ملازمت کی وجہ سے دب کر رہ گئی ہے جس کا مشفق خواجہ کو افسوس ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے کسی ایک میدان میں دلجوئی سے کام کرنے کی خامی کو بے نقاب کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 9

''الطاف گوہر کے صاحبِ علم وفضل اور ذہین ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن
اس علم وفضل اور ذہانت کو انہوں نے سرکاری ملازمت اور غیر سرکاری خواہشات
کی بھینٹ چڑھا دیا۔ان کا اصل میدان ادب تھا لیکن اسی طرف انہوں نے توجہ
کم کی۔نتیجہ یہ نکلا ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم''۔ [1]

اس اقتباس میں محاوروں اور ضرب المثل کا بڑی خوبی سے استعمال نظر آتا ہے اور یہی ان کے مزاحیہ اسلوب کی خصوصیات بھی ہیں۔

شمیم احمد

شمیم احمد تنقید کی دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق وہ اپنی تنقید میں کبھی جانبداری سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تنقید ان کے پاس اتفاق رائے نہیں بلکہ اختلافِ رائے کا نام ہے۔اور جب کسی موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے بارے میں لکھتے ہوئے کسی قسم کے لحاظ کو ملحوظ نہیں رکھتے۔غرض مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ لوگ ان کی تنقید نگاری سے بہت ڈرتے ہیں چنانچہ شمیم احمد کی تنقید نگاری کو نادر شاہ کی تلوار سے تشبیہ دیتے ہوئے مزاح کے پردے میں طنز کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

بہ حیثیت نقاد شمیم احمد اس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں۔وہ کسی مصنف یا
کتاب پر لکھتے ہوئے مصنف سے اپنے ذاتی مراسم کو بالائے طاق رکھ دیتے
ہیں۔حالانکہ ایسے موقعوں پر تنقید کو بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔
دوسرے لفظوں میں شمیم احمد کے نزدیک تنقید اتفاق رائے کا نہیں اختلافِ رائے
کا نام ہے۔یہی وجہ ہے کہ گزشتہ 35 برسوں سے موصوف دنیائے ادب میں
اکیلے ہی حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے ہیں..... عام خیال یہ ہے کہ ان کے
ہاتھ میں نقاد کا قلم نہیں اندھے کی لاٹھی ہے کہ جسے بھی لگ جائے۔عام طور پر
لوگ ان سے ذرا دور ہی رہتے ہیں کہ پتا نہیں لاٹھی کا رخ کب کس طرف

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 31

ہو جائے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی نے شمیم احمد کو تقریب رونمائی میں مدعو نہیں کیا اور اپنی کتاب کا دیباچہ تو کیا، فلیپ بھی نہیں لکھوایا۔ بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کتاب سرے سے ان کی نظر ہی سے نہ گزرے۔ ہمارے خیال میں شمیم احمد کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ وہ ٹیڑھے اور روکھے ضرور ہیں لیکن غیر منصف مزاج نہیں۔انہوں نے اپنی تنقیدوں میں بے شمار اچھی کتابوں کو سراہا ہے اور اچھے مصنفوں کو ان کی کاوشوں پر داد دی ہے۔ہاں جہاں کہیں کوئی گڑبڑ نظر آتی ہے وہاں وہ تیغ بے نیام ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نادر شاہ کی تلوار بن جاتے ہیں اور قتل عام کو بھی جائز سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ قتل عام میں گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔اس میں شمیم احمد کا کوئی قصور نہیں ہے۔نادر شاہ کی تلوار چیز ہی ایسی ہے جو گناہ گار اور بے گناہ کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ دراصل معتدد تنقید کے قائل ہیں اور معیاری اور غیر معیاری دونوں طرح کے ادیبوں کو ایک ہی معیار پر رکھنے کو غلط تصور کرتے ہیں اس طرح ان کے ان خیالات سے جہاں ہمیں ان کی معتدل نظریہ کا اندازہ ہوتا ہے وہی ان کی مزاج میں ادبی چاشنی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی موجودہ تاریخ میں ایک بہت بڑا نام ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق اردو ادب وزبان پر ڈاکٹر سلیم اختر کے بے شمار احسانات ہیں۔انہوں نے تنقید، تاریخ و تحقیق میں بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تصانیف کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت کی ایک اہم خوبی منکسیر المزاجی ہے۔مشفق خواجہ نے ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کو ان کی تصنیف ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے حوالے سے ان کے ایک بعد دیگر کتابیں لکھنے کی عادت پر مزاح کے پردے میں طنز کیا ہے۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 141

بڑے دلچسپ انداز میں وہ فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اردو کی ایک مقبول ترین کتاب کے مصنف ہیں۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، کے سولہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اردو میں اگر حسن اتفاق سے کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ جائے تو اس کا مصنف زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔مگر ڈاکٹر صاب سراپا انکسار ہیں۔وہ زمین پر پاؤں ایسی شائستگی سے رکھتے ہیں کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن کے لیے زمین خود بخود ہموار ہوتی جاتی ہے بلکہ اس سال تو زمین ایسی ہموار ہوئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ادب کے ساتھ زبان کی بھی ایک مختصر ترین تاریخ لکھ ڈالی ہے''۔[1]

صادق الخیری

اردو ادب میں صادق الخیری کی شخصیت انفرادیت کی حامل ہیں۔ایک عرصہ تک انہوں نے ادبی دنیا میں اپنی علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ادب کے قارئین پر گہرا تاثر چھوڑا ہے۔مشفق خواجہ نے اپنے منفرد اسلوبِ بیان میں ان کی بسار نویسی پر طنز کیا ہے:

''جناب صادق الخیر سدا بہار ادیب ہیں۔45 برسوں سے وہ ادبی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ان کے پڑھنے والے پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو گئے۔مگر چشم بد دور، وہ جوانوں کی سی مستعدی سے اپنے کام میں مصروف ہیں''۔[2]

عبادت بریلوی

عبادت بریلوی کا شمار اردو ادب کے نامور نقادوں میں ہوتا ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ 76 برس کی عمر میں بھی وہ اتنی توانائی کے ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں جتنے نوجوانی کی عمر میں رہا کرتے تھے۔ان کے مطابق نوجوانی کے مقابلے ضعیفی میں ان کے یہاں پختگی نظر آتی ہے۔غرض عبادت

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 33

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص 311

بریلوی کی شخصیت کے اس پہلو کو نشانہ طنز بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبادت بریلوی اس سال پورے 76 برس کے ہو جائیں گے۔اس عمر میں ادبی اعتبار سے وہ جتنے توانائی اور باعمل ہیں۔اتنے وہ جوانی میں نہ تھے۔ ان کی جوانی کی تحریریں تو ایسی ہیں کہ ان میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں بلکہ ان کے پڑھنے والے بھی کہولت و کسالت کا شکار ہو جاتے ہیں''۔[1]

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد لب ولہجہ کے کالم نگار بھی ہیں۔ ان کی مزاحیہ کالم نگاری، مزاح نگاری کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔مشفق خواجہ نے ان کی ادبی خدمات کو سراہاتے ہوئے لکھا ہے :

''احمد ندیم قاسمی نے بیک وقت شاعری اور افسانہ نگاری میں جو رجحان ساز کردار ادا کیا ہے اس کی مثالیں ہمارے ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو ادیب ادب کے ایک سے زیادہ شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔وہ عموماً کسی ایک شعبے میں بھی صحیح طور پر اپنے کمال فن کا مظاہرہ نہیں کر پاتے لیکن قاسمی صاحب کے کمال فن کا مظاہرہ صرف شاعری اور افسانہ نگاری میں نہیں ہوا، انہوں نے جس شعبہ ادب میں بھی قدم رکھا وہاں گل وگلزار کا سماں پیدا کر دیا۔کالم نگاری کے حوالے سے طنز ومزاح میں بھی ان کا کام اتنا وقیع ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا ادبی کفران نعمت ہے۔ اب قاسمی صاحب ایک مکتوب نگاری کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں تو اس میدان میں بھی ان کی انفرادیت دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے''۔ [2]

---

[1] سخن ہائے گفتنی، ص 64

[2] سخن ہائے ناگفتنی، ص 65

جمیل زبیری

ہمارے یہاں ادب کا معیاری عالمی ادب کے مقابلے پست ہے چنانچہ انہوں نے جمیل زبیری کے حوالے اسی بات کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جمیل زبیری بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن ترجمہ نگاری میں بھی انہوں نے اپنے فن کا اعلیٰ مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی ترجمہ نگاری کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تراجم طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ غرض جمیل زبیری کی ترجمہ نگاری کو ان کے افسانہ نگاری کے مقابلے وہ بہتر مانتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں کی اسی صورت حال پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور غیر بنیادی طور پر بھی بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں، یعنی ایسے کام کرتے ہیں جو ادب کی تخلیق سے زیادہ مفید ہیں جیسے انہوں نے برٹرینڈ رسل کی شہرہ آفاق کتاب Corquest of Happiness کا ترجمہ ''دائمی مسرت کا حصول'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ کام ہے۔ ترجمہ ایسا سلیس اور رواں دواں ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کتاب اصلاً اردو میں لکھی گئی ہو اور بعد میں اسے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہو۔ اردو میں ایسی مفید کتابوں کو منتقل کرنا طبع زاد افسانے لکھنے اور شعر کہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس سے ہمارا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ جمیل زبیری کو طبع زاد افسانے لکھنے کی بجائے غیر ملکی زبانوں کے اچھے افسانوں کا ترجمہ کرنا چاہئے۔ انہیں دونوں کام کرنے چاہئیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہوتا رہے کہ آج کے اردو افسانے کو عالمی افسانے کی سطح تک پہنچنے کے لیے کتنی صدیاں درکار ہوں گی''۔[1]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

گوپی چند نارنگ کو ہندو پاک کے علاوہ دنیا کے تقریباً ممالک میں شہرت حاصل ہے وہ جس ملک

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 99

بھی جاتے ہیں وہاں اپنی علم وفضل سے ایک ایسا تاثر چھوڑتے ہیں کے ہر کوئی ان کی علمی وادبی شخصیت کا قائل ہوجاتا ہے۔مشفق خواجہ بھی ان کی عظمت کے قائل ہیں لیکن مشفق خواجہ کے مطابق وہاں کے لوگ ان سے ملنے کے مشتاق رہتے ہیں لوگوں کی چاہت اور نارنگ صاحب کی عادت کو بھی انہوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

> ''ڈاکٹر نارنگ جب پاکستان تشریف لاتے ہیں تو یہاں کی ادبی دنیا میں زلزلہ سا آجاتا ہے۔عام زلزلے سے زیر زمین سطح پر ارتقاش پیدا ہوتا ہے۔ڈاکٹر نارنگ قصہ زمین کے قائل نہیں۔ان سے ملنے کے لیے لوگ بے تاب ہوتے ہیں اور وہ خود بھی سراپا اشتیاق بن جاتے ہیں۔ہر ایک سے اس طرح ملتے ہیں جیسے صرف اسی سے ملنے کے لیے انہوں نے زحمتِ سفر اٹھائی ہو''۔[1]

حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن تنقید نگاری میں بھی انہوں نے قدم رکھا ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ جب بھی وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس موضوع کی قدر و قیمت متعین کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔ان کی اسی خصوصیت پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ عام نقادوں کی طرح اپنے ساتھ موضوع کو بھی ڈبو نہیں دیتے، بلکہ بڑے خلوص اور فراخدلی کے ساتھ موضوع کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ وہ سستے مال کو بھی مہنگے داموں خریدنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔جناب شاعر نے جن اہل قلم پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں،ان میں سے بعض ایسے ہیں، جن پر جناب شاعر سے پہلے کسی نے نہیں لکھا اور شاید ان کے بعد بھی کوئی لکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔'' [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 229

[2] سخن ہائے گسترانہ،ص 142

یوسف ناظم

یوسف ناظم اردو مزاح نگاری میں ایک بڑا نام ہے۔ مشفق خواجہ نے ان کی طنز و مزاح نگاری کی مقبولیت پر اظہار کرتے ہوئے انہیں طنز و مزاح کا تیرتھ رام فیروز پوری کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ جتنی تیزی سے کتابیں لکھ رہے ہیں، اتنی تیزی سے ان کی مقبولیت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں، جب ان کی تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ انہیں طنز و مزاح کا تیرتھ رام فیروز پوری تسلیم کر لیا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعزاز پر یوسف ناظم خوش ہوں گے، تیرتھ رام فیروز پوری کے ناخوش ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوگا، کیونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔'' [1]

یوسف ناظم نے جہاں عصر حاضر کے تمام مسائل کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ وہیں کئی شخصیات کو اپنے خاکوں کا موضوع بھی بنایا ہے۔ خاکہ نگاری کا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے اپنے خاکوں میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے احباب سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ اس قسم کی سختی سے غیر جانبداری پر مشفق خواجہ نے طنز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عام طور پر مصنفین قارئین سے تعلقات خراب کرنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں، لیکن یوسف ناظم عجیب آدمی ہیں کہ کتابیں لکھ کر دوستوں سے تعلقات خراب کر لیتے ہیں''۔ [2]

اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک اردو ادب کی تاریخ میں بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس طنز و مزاح نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ بحیثیت ادیب انہوں نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 42

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص 43

کی ہے اور بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ان کی اسی زور نویسی کو انھوں نے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ:

''اشک صاحب نے جتنا لکھا ہے اتنا تو ہمارا عام ادیب اپنی پوری زندگی میں پڑھتا بھی نہیں۔'' [1]

اختر انصاری اکبرآبادی

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جن ادبی شخصیات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ان میں ایک نام اختر انصاری اکبرآبادی بھی ہیں۔ان کا شمار پاکستان کی ذی علم ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی تمام زندگی اردو زبان وادب کی خدمت میں گذار دی۔مشفق خواجہ کے مطابق ادب کو انہوں نے کبھی اپنے مطلب کے لیے استعمال نہیں کیا۔یوں تو ان کئی شخصیت کی خوبیوں کی حامل تھی لیکن ان کے نزدیک قناعت پسندی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔انھوں نے اختر انصاری کی قناعت پسندی کے ایک واقعہ کے حوالے سے اردو ادیبوں کی خستہ حالی پر طنز کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''استاد میں بے شمار خوبیاں تھیں۔سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ قناعت پسند تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی بڑا روگ پالنے کے قائل نہ تھے۔ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک علم دوست اور بڑے سرکاری عہدے دار نے چاہا کہ استاد کے لیے کوئی مستقبل ذریعہ آمدنی پیدا کر دیا جائے۔انہوں نے استاد کے نام تجارتی پلاٹ الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔استاد نے ان سے کہا:

میں اس پلاٹ کو کیا کروں گا۔آپ بس اتنا کیجئے کہ میرے رسالے کے دس بارہ خریدار بنوا دیجئے،تا کہ اس مہینے کے اخراجات پورے ہو جائیں۔'' [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 78

[2] سخن ہائے گسترانہ،ص 258

اختر انصاری کے قدر دانوں کا پاکستان میں ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔ اختر انصاری کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ صرف ادب ہی ان کا ذریعہ معاش تھا لیکن بعض لوگ ان کے مخالفین ان کے اس فعل سے نالاں تھے لیکن مشفق خواجہ اسے کوئی خرابی نہیں مانتے کیوں ان کا ماننا تھا:

> ''یہ عجیب بات ہے کہ جس ملک میں رشوت خوری، چور بازی، اسمگلنگ اور منشات فروشی کے ذریعہ معاش بنانے کا عام رواج ہو، وہاں ادب کو ذریعہ معاش بنانے پر اعتراض کیا جائے''۔ [1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سماج کی ناگوار صورتحال سے نالاں ہیں اور ان ادیبوں سے ناراض ہیں جو سماج میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنے کی بجائے ادب کو ذریعہ معاش بنانے والوں سے حسد کرتے ہیں۔

شہرت بخاری

شہرت بخاری کا شمار پاکستان کے مقبول شعراء میں ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد غزل کے ارتقا میں جن غزل گو شعراء نے اہم خدمات انجام دیئے ہیں ان میں ایک نام شہرت بخاری کا بھی ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق وہ اپنے دوست ناصر کاظمی کی طرح اپنی انفرادیت قائم نہ رکھ سکے۔ اس میں شہرت بخاری کا نہیں غزل کا قصور تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مزاحیہ لہجے میں لکھتے ہیں:

> ''شہرت بخاری قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے غزل گو شاعروں میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے صنفِ غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو مزید گرنے سے بچایا اور کلاسیکی انداز میں چند اچھی غزلیں لکھیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اپنے گہرے دوست ناصر کاظمی کی طرح غزل میں کوئی منفرد انداز پیدا نہ کر سکے۔ اس میں شہرت بخاری کا کوئی قصور نہیں غزل ہی ایک کڈھب

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 258

صنفِ سخن ہے کہ اس میں کوئی الگ راستہ نکالنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔
ایک ہی راستے پر چلتے رہنا غزل کو شاعروں کی مجبوری ہے۔لہذا یہ دیکھنا چاہئے
کہ شاعر اس مجبوری کی حدود میں رہتے ہوئے کس حد تک "مختار کی تہمت" اٹھاتا
ہے۔ [1]

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی کا شمار پاکستان کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے صحافتی پیشے کو مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ مشفق خواجہ کے مطابق قیام پاکستان کے بعد جن چند صحافیوں نے ملک کے مفاد میں اپنے ذاتی مفادات کو بھی نظر انداز کر دیا ان میں ایک نام الطاف حسن قریشی کا بھی ہے۔چوں کہ سماج اس قدر برائیوں کا شکار ہو چکا ہے کہ انسان اپنے مفاد کے لیے کسی بھی غلط راستے کو اختیار کرنے کو عیب نہیں مانتا اور جب کہ مشفق خواجہ کے نزدیک اچھا انسان وہی ہے جو حق کے رتبے پر چلنے کے لے اپنے ذاتی مفادات کو نظر انداز کر دے۔الطاف حسین قریشی بھی چوں کہ ایسے ہی صحافی ہیں اس لئے ان کی اس خصوصیت کے حوالے سے صورتحال پر طنز کیا ہے:

"قریشی صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی حق گوئی و بے باکی ہ۔انہوں نے ہر دور میں یہاں تک کہ ہمارے تاریخ کے سیاہ ترین جابرانہ دور میں بھی کلمۂ حق کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو عاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے پکی پکائی روٹی کے پلانٹ پر مفاہمت کر لیتا،مگر قریشی صاحب کی قسمت میں پکی پکائی روٹی نہیں.....قیام پاکستان کے بعد جن دو تین صحافیوں نے ملک کے مفاد میں اپنے ذاتی مفادات کو نظر انداز کیا،ان میں قریشی صاحب بھی شامل ہیں۔ہماری تاریخ ِ صحافت کے ایک زرین باب کا عنوان "الطاف حسن قریشی" ہے۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 208 [2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 279

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں مشفق خواجہ کی شخصیت کا ایک پہلو ہمارے سامنے بے نقاب ہوتا ہے۔ دراصل مشفق خواجہ نے عمر بھر اپنے مفاد کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ حق گوئی اور بے باکی کے ذریعہ سماج کی اصلاح کی کوشش کی۔ طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کی ایک خصوصیت بھی یہی ہے کہ یہاں جب مزاح نگار کسی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے تو وہاں اس کی شخصیت کی خوبیوں سے اپنی ہمدردی اور خامیوں سے اپنی برہمی کا اظہار کرتا ہے۔ وہیں سے اس کی شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ غرض یہ خصوصیت ہمیں ان کے کالموں میں بھی نظر آتی ہے۔

مرزا دیب

مرزا دیب پاکستانی ادیبوں میں مقبول و معروف نام ہے۔ انھوں نے بہت لکھا ہے ان کی اسی خصوصیت کو نشانہ طنز بناتے ہوئے انھیں صحیح معنوں میں رجحان ساز ادیب قرار دیا ہے:

> ''مرزا دیب ان سدا بہار ادیبوں میں سے ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے ہمارے ادب کو باثروت بنا رہے ہیں۔ ان کے قلم کی روانی اور تخلیقات کی تازگی پر اچھے اچھوں کو رشک آتا ہے۔ لکھنے کی رفتار ایسی ہے جیسے دونوں ہاتھوں سے لکھ رہے ہوں اور معیار ایسا جیسے ایک ایک لفظ کو محسوس کر کے لکھ رہے ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں رجحان ساز ادیب ہیں۔ انہوں نے بیک وقت کئی اصناف ادب کو جس طرح آبرومند بنایا ہے اس کی مثالیں کم ملیں گی اور عمر کے اعتبار سے ہی نہیں، خدمات کے اعتبار سے بھی بزرگ یعنی بڑے ہیں۔''[1]

سلطان جمیل

سلطان جمیل کا شمار پاکستان کے چند اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ادبی سرگرمی مبتلا رہتے ہیں ان کے اسی ذوق و شوق کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 269

''سلطان جمیل کی ادبی سرگرمیاں صرف افسانے لکھنے تک محدود نہیں ہیں، وہ عملی آدمی بھی ہیں۔ان کا گھر کیا ہے اچھا خاصہ حلقہ ارباب ذوق ہے۔مہینے میں ایک دوبار ادیبوں کی محفل گرم ہوتی ہے۔یہ ادیب ادبی مسائل پر غور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں سلطان جمیل کے ذاتی مسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔وہ یوں کہ سلطان جمیل کی تنخواہ کا بڑا حصہ انہیں ادبی محفلوں کے انعقاد پر خرچ ہوتا ہے۔ ان محفلوں میں صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہوتا لذتِ کام و دہن کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔اسی لیے بعض ادیبوں نے اس لذت کی خاطر سلطان جمیل کو ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کر رکھا ہے۔'' [1]

سلطان جمیل کا تعلق پاکستان کے ایک معروف شہرت یافتہ خاندان سے ہے مشفق خواجہ کے خیال میں وہ اپنے افراد خاندان کی مقبولیت کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے نہ اپنی افسانہ نگاری کی وجہ سے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان پر مزاح کے پردے میں چوٹ کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''سلطان جمیل کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ٹی وی پروڈیوسر کے بڑے بھائی ہیں۔دوسری اور بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر حضرت صبا اکبر آبادی کے بیٹے ہیں۔تیسری شناخت یہ ہے کہ مشہور موسیقار سہیل رعنا کے بھانجے ہیں۔اس شناخت پریڈ کے بعد ضرورت نہیں رہتی کہ سلطان جمیل کی کوئی اور شناخت بھی ہو۔تاہم افسانہ نگاری کو وہ اپنے شناختی کارڈ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں اگرچہ حکومت نے جعلی شناختی کارڈ رکھنے پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن ادبی دنیا میں اس قسم کی پابندیوں کی پرواہ نہیں کی جاتی۔'' [2]

---

[1] [2] خامہ بگوش کے قلم سے، 322

عطاالحق قاسمی:

عطاءالحق قاسمی اردوادب میں ایک شاعر،انشائیہ نگار،طنز ومزاح نگاراور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ان کے سفرنامے ادبی دنیامیں بے حدمقبول ہیں اور قاری اسے پڑھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ان کے سفرناموں پراظہارخیال کرتے ہوئے انھیں سفرکرنے والاادیب کہاہے۔

> ''اردو کے کسی ادیب نے ان سے زیادہ سفرنہیں کیے۔سفران کے لیے وسیلۂ ظفر ہی نہیں،حصول علم کاذریعہ بھی ہے۔بعض لوگ پیسے کوہاتھ کامیل سمجھتے ہیں، عطانے یہی سلوک علم سے کیاہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کی طرح ان کے سفرنامے بھی علم سے بوجھل نہیں ہوتے۔جیسی شگفتہ ان کی شخصیت ہے ویسے ہی باغ وبہاران کے سفرنامے ہیں۔پڑھنے والاسفرناموں کوپڑھتانہیں عطاکے ساتھ سفرکرتاہے۔بس اتنافرق ہے کہ عطادوسروں کی دعوت پرسفرکرتے ہیں، قاری اپناخرچ خوداٹھاتاہے یعنی سفرنامہ خریدکرپڑھتاہے۔''[1]

عطاالحق قاسمی ایک کامیاب کالم نگاربھی ہیں۔ان کے کالموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی بے باکی اورسختی سے ادب کی صورت حال پراپنے سے خیالات کااظہارکرتے ہیں۔ان کے اس سخت روئے کو مشفق خواجہ ان کی نہیں بلکہ اردووالوں کی خرابی تصورکرتے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''عطاءالحق قاسمی کورشک کی نظر سے دیکھنے کاایک سبب یہ ہے کہ وہ جس میدان میں بھی نکل جاتے ہیں،وہاں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑدیتے ہیں کہ گاڑنے کے لیے شاعری کے علاوہ ان کے پاس یہی کچھ ہے۔کالم نگاری کی طرف آئےتو اچھےاچھوں کے چراغ گل اورپگڑیاں غائب کردیں۔بلاشبہ آج وہ اردو کے بہترین کالم نگار ہیں۔ابن انشا کے بعد یہ اعزاز انہیں کوحاصل ہے کہ ان کے کالم اخبار میں چھپتے ہیں تو اخباری دنیامیں ان کی دھوم مچ جاتی ہےاوریہی

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی،ص 59

کالم جب کتابی صورت میں مرتب ہوکر سامنے آتے ہیں تو ادبی دنیا میں زلزلہ آجاتا ہے۔ ہماری ادبی دنیا کی خانہ خرابی اسی قسم کے زلزلوں کی مرہون منت ہے۔'' [1]

انیس ناگی

انیس ناگی پاکستان کے اہم ترین ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انیس ناگی کے ادبی مقام و مرتبہ کے بارے میں مختلف لوگ مختلف آراء رکھتے ہیں اور اس کثرت سے رکھتے ہیں کہ مشفق خواجہ مزاحیہ انداز میں اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انیس ناگی پاکستان کے اہم ترین ادیبوں میں سے ہیں۔ دو سے زیادہ رائیں ہوں تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کوئی ادیب اس وقت تک اہمیت اختیار نہیں کرسکتا جب تک وہ کثرت آراء کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بن جائے۔ کثرت تعبیر سے خواب تو پریشان ہوسکتے ہیں، کثرت آرا سے انیس ناگی پریشان نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ادبی مقام ان کے بارے میں رائے دینے والوں کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔'' [2]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ انیس ناگی بے باک اور صاف گو انسان ہیں ان کی اسی بے باکی اور صاف گوئی کو انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے:

''انیس ناگی کی ایک خوبی جو اردو کے کسی ادیب میں نہیں پائی جاتی ہے یہ کہ وہ انتہائی بے باک اور صاف گو انسان ہیں۔ بے شمار دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں۔ ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔'' [3]

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 58 [2] سخن در سخن، ص 132
[3] سخن ہائے ناگفتنی، ص 134

ڈاکٹر خلیق انجم

خلیق انجم کا شمار ہندو پاک کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے کئی اہم تحقیقی کام انجام دیئے ہیں۔جن میں سے ایک ''جگن ناتھ آزاد حیات اور ادبی خدمات'' بھی ہے۔ یہ تحقیقی کام انھوں نے آزاد کی زندگی میں ہی کیا ہے۔زندہ شخصیتوں پر کام کرنے کو مشفق خواجہ صحیح نہیں مانتے ہیں چنانچہ نہایت پُر مزاح انداز میں وہ طنز کرتے ہیں:

> ''اردو ادب میں کئی آزاد گزرے ہیں۔ایک تو سرشار کے فسانۂ آزاد والے آزاد ہیں، دوسرے محمد حسین آزاد، تیسرے ''نوابی دربار'' کے مصنف سید محمد آزاد اور چوتھے مولانا ابوالکلام آزاد۔اگر ڈاکٹر خلیق انجم ان آزادوں میں سے کسی ایک کو پابند تحقیق کرتے تو بات سمجھ میں آجاتی کہ مردوں سے بے تکلف ہونا اہل تحقیق کا شوق بھی ہے اور پیشہ بھی لیکن ایک زندہ شخص کو موضوع تحقیق بنانا بہت مشکل کام ہے۔ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مشکل کام کو نہایت آسانی سے انجام دیا ہے۔'' [1]

خلیق انجم جگن ناتھ آزاد پر تحقیق کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کو جمع کیا تھا۔جن سے جگن ناتھ آزاد کا تعلق رہا ہے یہاں تک کہ اخباری تراشے اور ان کے نام آئے دعوت ناموں کے عکس کو بھی انھوں نے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔خلیق انجم کی اسی تحقیقی دیانت داری پر مشفق خواجہ طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر عکس کی بجائے نقل شائع کی جاتی تو اس کا امکان تھا کہ تاریخ یا سنہ میں کتابت کی غلطی راہ پا جاتی جس کی وجہ سے پچاس سال بعد محققوں میں بحث چھڑ جاتی کہ اس تقریب کی صحیح تاریخ یا صحیح سال کیا تھا۔خلیق انجم صاحب نے عکس شائع کر کے اس ناخوش گوار بحث کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا''۔ [2]

---

[1] سخن در سخن، ص 86-87

[2] سخن در سخن، ص 88

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید پاکستان کی ادبی تاریخ میں ایک بڑا نام ہے۔ان کا شمار پاکستان کے کثیرالتصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کی زودنویسی کا ذکر مزاح کے پردے میں یوں کیا ہے:

> ''جب سے ہم نے کالم نگاری شروع کی ہے، ڈاکٹر انور سدید نے کتابیں لکھنے کی رفتار تیز تر کردی ہے۔شاید وہ زودنویسی میں ہمارا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ہم کیا اور ہماری بساط کیا کہ ہم ان کے مقابلے پر آئیں۔ہم جتنی دیر میں ایک کالم لکھتے ہیں، وہ اتنے وقت میں تین چار سو صفحات کی کتاب لکھ ہی نہیں لیتے، زیور طبع سے آراستہ بھی کر لیتے ہیں۔حالاں کہ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ انہیں کسی قسم کے زیور کی حتی کہ زیور طبع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔'' [1]

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جن ادبی شخصیات کی خدمات کی ستائش کرتے ہیں وہاں ان کی خامیوں پر بھرپور وار کرتے ہیں۔مثلاً: نظیر صدیقی کے شعری مجموعہ ''حسرت اظہار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شعر گوئی پر بڑے مضحکہ خیز انداز میں طنز کیا ہے:

> ''آپ تو ایک مصرعہ بھی موزوں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔آپ کی ساری غزلیں خارج از بحر ہیں۔شاعری آپ کے بس کی بات نہیں کیونکہ جو شخص پان لگانا نہ جانتا ہو وہ شعر نہیں کہہ سکتا۔
>
> یہ سن کر نظیر صاحب اپنے شاعرانہ مستقبل سے تو مایوس ہو گئے لیکن ہمت نہ ہاری اور چپکے چپکے غزل نویسی کا کام جاری رکھا اور بالآخر ایک مجموعہ بھی چھپوا دیا۔ جس کا نام ''حسرت اظہار'' ہے جو ہر اعتبار سے اسم بامسمی ہے کیونکہ اس میں ''شاعری'' شعر بننے کی حسرت لئے ہوئے نظر آتی ہے نظیر صاحب کی جگہ اگر ہم

---

[1] سخن در سخن، ص109

ہوتے تو پان فروش کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے شاعری سے باز آجاتے اور
پان لگانے کے ضمن میں شاگردی اختیار کر لیتے تا کہ زندگی تو آسودگی سے
گذرتی۔[1]

مشفق خواجہ کے مطابق نظیر صدیقی کی شاعری معنویت سے عاری ہیں۔ان کی شاعری میں صرف الفاظ ہوتے ہیں معنی نہیں ہوتے چنانچہ وہ ان کی اس خامی کا یوں مذاق اڑاتے ہیں:

''جب نظیر صاحب غزل سرا ہوتے ہیں تو صرف الفاظ سنائی دیتے ہیں۔معنی
دکھائی نہیں دیتے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف جب اپنا کلام سنا رہے تھے
تو ہم بھی آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔[2]

اختر الایمان

بعض شعرا اپنے آپ کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں ان سے بہتر شاعری کوئی نہیں کرتا۔اسی طرح اختر الایمان نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں سب سے بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کیا تھا مشفق خواجہ پر بڑے لطیف اور شگفتہ انداز میں ان کے اس بیان پر طنز کیا ہے۔

''اس وقت رسالہ ''آج کل'' دہلی کا اختر الایمان نمبر ہمارے سامنے ہے۔
اس میں کئی اچھے مضامین ہیں جو آل احمد سرور، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن
فاروقی، باقر مہدی اور بلراج کومل جیسے صاحبانِ فکر ونظر نے لکھے ہیں۔دو
انٹرویو بھی ہیں جن میں دلچسپ سوال وجواب ملتے ہیں۔ایک سوال کے جواب
میں اختر الایمان نے کہا ہے: ''میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مجھ سے بہتر شاعری
کوئی نہیں کرتا''۔

یہ دعویٰ سن کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی خوشی اس کی جو بات مذکورہ بالا
نقادوں میں کسی کو کہنے کی جرأت نہ ہوئی، وہ اختر صاحب نے خود کہہ دی۔اس

---

[1] سخن در سخن، ص 77

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص 324

سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ نقاد سچ بولنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود پوری سچائی
سے کام نہیں لیتا۔اس کے برعکس تخلیقی فن کار سچ بولنے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن جب
سچ بولتا ہے تو خود سچائی کو بھی پسینہ آجاتا ہے"۔ [1]

بعض شعرا عام طور سے بڑے شاعر سے حسد رکھتے ہیں اور اکثر وبیشتر اس کی شاعری میں نقائص تلاش کرتے ہیں۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ اختر الایمان نے بھی اکثر فیض احمد فیض کی شاعری میں خامیاں ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے۔مشفق خواجہ نے ان کی اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنز کیا ہے:

"اختر الایمان کا سب سے بڑا مسئلہ فیض احمد فیض ہیں۔ان کے ہر انٹرویو
میں فیض کے بارے میں گل افشانی گفتار کا اندوز دیدنی ہوتا ہے اور یہ گفتار، گالی
گفتار کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض ایک آسیب کی
طرح یاروں کے اعصاب پر سوار ہیں۔ فیض کی شہرت اور مقبولیت سے یار
لوگ اس درجہ خائف ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔لہذا وہی
کچھ کرتے ہیں جو سمجھ میں آتا ہے۔یعنی فیض کے ہاں وہ تمام خصوصیات تلاش
کر لیتے ہیں جن سے کسی بھی شاعر کا غیر شاعر ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے"۔ [2]

قمر جمیل

بعض شعراء نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں اور کئی نئی نسل کے شعراء اپنے سے بزرگ ادیبوں کی صحبتوں سے فیاض ہوکر اپنا مستقبل سنوار لیتے ہیں مشفق خواجہ کے مطابق جناب قمر جمیل کا شمار بھی انہیں بزرگ ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نئی نسل کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ لیا ہے۔ جناب قمر جمیل کی اس ادبی خدمت پر ہلکے پھلکے اور لطیف پیرائے میں طنز کیا ہے۔

"گذشتہ چالیس برسوں میں قمر جمیل نے کم از کم چالیس ہی نوجوانوں کی

---

[1] سخن در سخن، ص208

[2] سخن در سخن، ص213

حوصلہ افزائی کی اور یہ کہہ کہہ کر انہیں آگے بڑھایا کہ تم غالب ہو، تم میر ہو، اور ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ غالب اور میر تمہارے سامنے بے حیثیت نظر آئیں گے۔ یہ نوجوان، جن میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی، قمر جمیل کی سرپرستی میں اپنی ادبی فتوحات کا پرچم لہراتے ہوئے۔ میر و غالب کی شاعری کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے اور اتنا آگے بڑھ گئے کہ ادبی دنیا کی حدود ہی سے باہر نکل گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب نوجوان وہ تھے جنہوں نے بے روزگاری سے تنگ آکر ادب کے دامن میں پناہ لی تھی اور جب روزگار مل گیا تو ادب سے ان کی دلچسپی بھی ختم ہوگئی۔ ہمیں مستقبل کے ان بڑے ادیبوں کے ضائع ہونے کا اتنا افسوس نہیں جتنا قمر جمیل کی محنت کے ضائع ہونے کا ہے۔ اگر قمر جمیل اتنا وقت اور اتنی محنت خود اپنی شاعری اور تنقید پر صرف کرتے تو آج وہ اپنے موجودہ ادبی مقام سے کہیں زیادہ بلند مقام پر نظر آتے'' [1]

قمر جمیل شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نقاد بھی ہیں۔ انہوں نے غیر معیاری شاعروں کے کلام پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ مشفق خواجہ نے ان کے اسی فعل پر انہیں ہدف طنز بنایا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''انہوں نے جن نئے شاعروں پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے نہیں، قمر جمیل کے مضامین کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب کسی شاعر کی شناخت اس کی شاعری نہ ہو، کسی نقاد کا مضمون ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نقاد ہی زندہ رہے گا، باقی سب کچھ فانی ہے، گویا دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نقاد گورکن کے فرائض انجام دیتا ہے'' [2]

بشیر بدر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ان سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں ہے۔ مشفق خواجہ بشیر بدر کی اس خود پرستی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] سخن در سخن، ص 106

[2] سخن در سخن، کراچی، ص 107

''بشیر بدر اپنے آپ کو موجودہ زمانے ہی کا نہیں آنے والے زمانوں کا بھی بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگ انہیں خود پرستی کا مریض قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بشیر بدر خدپرستی کے مرض میں مبتلا نہیں خودشناسی کے درجے پر فائز ہیں۔ بلاشبہ موجودہ زمانے میں (بقول خود) ان سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں ہے۔ (واضح رہے بقید حیات ہونا بقید ہوش وحواس ہونے سے بالکل مختلف چیز ہے اور یہاں اس سے بحث نہیں ہے)۔'' [1]

ایک جگہ انہوں نے ساقی فاروقی کی انا پرستی پر بھی شگفتہ انداز میں طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہم کیا اور ہماری بساط کیا: ساقی تو اپنے قریب کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے دائیں بائیں بھی اپنے آپ ہی کو بٹھائے رکھتے ہیں''۔ [2]

ساقی فاروقی

ساقی فاروقی اپنی شاعری پر ہوئے اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری شاعری کا فلسفہ سمجھنے کے لیے اپنے ادبی معیار کو بلند کرنا چاہئے۔ ساقی فاروقی کے اس بیان پر مشفق خواجہ تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شعر گوئی پر اس طرح طنز کیا ہے کہتے ہیں:

''ہماری ناقص رائے میں موجودہ اردو شاعری اور اس کے قارئین کا ادبی معیار یکساں رہنا چاہیے اور شاعری کا معیار تو قطعاً بلند ہونا چاہئے کیونکہ اکثر زمینی چیزیں بلندی پر پہنچ کر چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں اور بعض تو معدوم ہو جاتی ہیں''۔ [3]

۱۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص 15

۲۔ سخن در سخن، ص 57 ۳۔ سخن در سخن، ص 59

احمد بشیر:

احمد بشیر نے بحیثیت خاکہ نگار اپنی ایک پہچان بنائی ہے لیکن مشفق خواجہ ان کی خاکہ نگاری سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ دراصل ان کے نزدیک خاکہ نگاری کا مقصد کسی شخص کی خوبیوں اور خامیوں کو غیر جانبداری سے عکاسی کرنا ہوتا ہے لیکن احمد بشیر نے جن شخصیات پر خاکے لکھے وہ ان کے بارے میں انہیں سے معلومات حاصل کر کے لکھے ہیں۔اس خامی کی طرف مشفق خواجہ نے مزاحیہ انداز میں اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''احمد بشیر کے بعض خاکے پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں لکھی ہیں یا دوسروں کے مضامین پڑھ کر ان کے بعض مطالب کو اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔مثلاً احسان دانش اور ظہیر کاشمیری کی ابتدائی زندگی کی بہت سی باتیں ان سے پوچھ کر لکھی گئی ہیں۔یہ طریقہ کار سوانحی خاکے کے لیے تو مناسب ہے مگر شخصی خاکے کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ان دونوں خاکوں سے اگر شنید کو خارج کر دیا جائے تو دید کا عنصر برائے نام رہ جاتا ہے''[1]

ظفر اقبال

ظفر اقبال پاکستان کے نمائندہ شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں ایک مرتبہ انہوں نے نئی شعریات سے متعلق کہا تھا کہ ہمارے شاعر زبان پر غالب آکر شاعری کہے گرامر کی پابندیوں میں نہ رہے۔ظفر اقبال کے انپیش کردہ نکات پر مشفق خواجہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

''ان باتوں کو سن کر ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر گرامر کی پابندیوں کو توڑنے سے شاعری بامعنی ہو سکتی ہے تو انیس ناگی موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔شعر اگر فعل، اسم اور مصدر کے بغیر مکمل ہو سکتے تو پھر بہترین شاعری

---

[1] سخن در سخن، ص 42

بغیر لکھے وجود میں آجاتی ۔لفظ کے استعمال میں من مانی روا رکھنے کی اجازت کے
نتیجے میں جو شاعری لکھی جائے گی ۔اسے من مانی ہی کہا جائے گا نہ کہ شاعری''۔[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ گرامر میں تبدیلی کو پسند نہیں کرتے ۔اور شاعروں کی اس خصوصیت پر انہوں نے کئی جگہوں پر چوٹ کی ہے۔

ندا فاضلی

ندا فاضلی اپنے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے سنہ پیدائش کے حوالے کے لیے دلی میونسپل کارپوریشن کے پرانے ریکارڈ کا حوالہ دیا تھا اس پر مشفق خواجہ طنزیہ ومزاحیہ انداز میں فرماتے ہیں:

''فاضلی صاحب کو تحقیق سے خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے انہوں نے اپنے
سال پیدائش کے لیے دہلی میونسپل کارپوریشن کے پرانے ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے
حالانکہ لوگ ان کے بیان پر کسی حوالے کے بغیر ہی یقین کر لیتے ۔ فاضلی
صاحب سے درخواست ہے کہ آئندہ انہیں کبھی اپنی شاعری کے آغاز کا سن
بتانے کی ضرورت پیش آئے تو وہ کسی میونسپل کارپوریشن کے نئے یا پرانے ریکارڈ
کا حوالہ نہ دیں ورنہ لوگ اس میونسپل کارپوریشن پر الزام لگائیں گے کہ اس کا
صفائی ستھرائی کا انتظام ناقص ہے''۔[2]

وامق جونپوری

بعض ادیب شاعری اور نثر نگاری دونوں طرف یکساں طور پر متوجہ رہتے ہیں۔اور نثر کسی کی شاعری ان کی نثر سے زیادہ بہتر ہوتی ہے تو کسی کی نثر ان کی شاعری سے بہتر ۔مشفق خواجہ نے بھی ایسے ہی شاعر وامق جونپوری کی نثر کو ان کی شاعری سے بہتر قرار دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعروں کی نثر اور نثر نگاروں کی

---

[1] سخن در سخن، ص 31
[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 181

شاعری ان کی مزید رسوائی کا باعث ہوتی ہے مگر وامق صاحب نے تو کمال کر دیا ہے، ان کی نثر ان کی شاعری سے بدرجہا بہتر ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ان کی شاعری میں بھی اچھی نثر بننے کے امکانات تھے مگر ردیف، قافیے اور وزن کی پابندیوں نے اس خوبی کو ابھرنے نہ دیا''۔ [1]

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر محمد حسن اردو کے نامور نقاد ہیں لیکن ان کے اچانک نثری نظم لکھنے پر مشفق خواجہ اس طرح طنز کے تیر چلائے، کہتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد حسن کو الگ سے نثری نظمیں لکھنے کی ضرورت نہیں، ان کے تنقیدی مضامین میں بھی نثری نظموں کا حسن پایا جاتا ہے بشرطیکہ جو کچھ پایا جاتا ہے اس کو حسن کہا جا سکے''۔ [2]

پروین شاکر

مشفق خواجہ کے مطابق ایک مرتبہ ایک ادبی پروگرام میں پروین شاکر نے ادب تخلیق کرنے والی خواتین کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے شکایت کی تھی کہ ''جب کوئی خاتون اپنا ادبی سفر شروع کرتی ہے تو اس کے بارے میں غلط افواہ اڑائی جاتی ہے کہ اسے کوئی اور لکھ کر دیتا ہے۔مثال کے طور پر اپنی مثال پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ پہلے پہل ان کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے نانا جان انہیں لکھ کر دیتے ہیں پھر بعد میں یہ کہا جانے لگا کہ احمد ندیم قاسمی انہیں لکھ کر دیتے ہیں۔پھر انہوں نے اپنا ایک شعر سنایا کہ:

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

مشفق خواجہ کے مطابق وہ یہ شعر سنا کر کہنے لگیں کہ وہ میری سمجھ میں نہیں آتا ایک مرد اس قسم کے

---

[1] سخن در سخن، ص 80

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب مظفر علی سید، ص 153

شعر کیسے لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ پروین شاکر کی اس شکایت سیمشفق خواجہ کو اعتراض ہے۔ وہ پروین شاکر کی شکایت کا بحوالہ جواب دیتے ہوئے مزاحیہ انداز میں ان پر طنز کرتے ہیں۔:

''پروین شاکر بلاشبہ اچھی شاعرہ ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موجودہ دور میں اردو شاعری کو باثروت بنانے میں ان کا حصہ دوسروں کہیں زیادہ ہے لیکن ہمیں ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ مذکورہ شعر صرف کوئی خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔ یہ شعر محترمہ کے نانا جان نے یقیناً نہیں لکھا تھا لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں بہت سے ایسے نانا جان گزرے ہیں جنہوں نے اس قسم کی شاعری کی ہے۔ اس وقت انشاءاللہ خان انشاء اور سعادت یار خان رنگین یاد آرہے ہیں جن کے دیوانوں میں اس قسم کے سینکڑوں اشعار ملتے ہیں جو ان کی نواسیوں سے منسوب ہوتے تو اچھا تھا۔ نمونے کے طور پر دونوں کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

(انشاء)

گرمی کے مارے ناک میں آئی ہے میر جان
باجی اڑھادے لاکے کوئی ہلکی اوڑھنی

(رنگین)

ڈیڑھ سو سال پہلے اس قسم کی شاعری کو ریختی کہا جاتا تھا، آج کل اسے خوشبو، خود کلامی اور صد برگ جیسے خوب صورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے''۔ [1]

تضمین

تضمین کا مطلب دوسرے شعراء کی زمین میں شعر کہنا، اساتذہ کی زمین میں شعر کہنے کی روایت

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:81

ہمارے اردو ادب میں بہت ملتی ہے۔ موجودہ دور میں نئی نسل کے شعراء عموماً اقبال غالب، میر، وغیرہ جیسے بڑے شاعروں کی زمینوں میں شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اساتذہ کی زمین میں شعر کہتے ہوئے کبھی کبھار ان شعرا سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ لہذا مشفق خواجہ نے ایسے ہی شعرا کی اس خامی کو بھی اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ سراج منیر نے اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے شعروں کی تضمین کرتے ہوئے ایک نظم ''قرطبہ کے گنبدوں میں ایک بازگشت'' کے عنوان سے نظم لکھی تھی۔ اس پر مشفق خواجہ نے ان کی اس تضمین کو اپنے استاد لاغر مرادآبادی کی زبانی طنز کا ہدف بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سراج منیر کے یوں تو کئی شعر دامن کش دل ہوئے، لیکن ایک شعر غصب کا ہے:

ایک خواب گماں کی ساعتوں کے روبرو
عمر بھر ساکت رہا ہوں میں مثال آئینہ

جس وقت ہم مسجد قرطبہ والی نظم پڑھ رہے تھے تو حضرت لاغر مرادآبادی بھی تشریف لے آئے۔ ہمارے ساتھ وہ بھی نظم سے محظوظ ہوتے رہے۔ ان کی رائے پوچھی تو فرمایا:

''اقبال اور غالب جیسے شاعروں کے شعروں کی تضمین کرنا ایسا ہی ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگایا جائے''۔[1]

اسی طرح لیث قریشی نے غالب کی زمین میں شعر کہے ہیں چنانچہ ان کی تضمین کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''غالب کی زمینوں کو جس طرح پامال کیا گیا ہے، اگر اس کی ایک دو مثالیں بھی پیش کر دی جائیں تو دونوں شاعروں کا موازنہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

غالب کا مشہور شعر ہے:

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 245

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر پر ہمارے ممدوح نے یوں بجلی گرائی ہے:

جلا کر خاک کردے برق، آندھی لے اڑے جس کو
وہ ننگ گلستان میری ہی شاخ آشیاں کیوں ہو

انصاف کی بات یہ ہے کہ لیث قریشی کا شعر غالب کے شعر سے آگے نکل گیا ہے۔ غالب نے صرف بجلی اور آشیاں کے حوالے سے بات کی ہے۔ لیث قریشی نے آشیاں کو پہلے برق کے ذریعہ جلایا اور پھر آندھی کے ذریعہ اسکی خاک بھی اڑادی۔ شاعری میں اس طرح خاک اڑانا غالب کے بس کی بات نہیں تھی'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق نئی نسل کے شاعروں کی تضمین پڑھنے سے اساتذہ کے کلام کی خصوصیات اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتی ہیں۔ اپنے اس خیال کو مسلم شمیم کی غزل گوئی کے حوالے سے اس طرح پیش کیا ہے کہتے ہیں:

''مسلم شمیم نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی بیشتر غزلیں حسرت، یگانہ، جگر اور دوسرے اساتذہ کی غزلوں کی زمین میں لکھی گئی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اساتذہ کی زمینوں کو بھی پامال کرسکتا ہے۔ بہرحال مسلم شمیم کو اس کی داد ملنی چاہیے کہ ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے اساتذہ کی غزلوں کی خوبیاں بہت اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتی ہیں''۔ [2]

مشفق خواجہ نے ایسے ادیبوں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جو ایک سے زائد اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ جو اہل قلم ایک سے زیادہ اصناف کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں وہ عموماً نقصان میں رہتے ہیں اور انہیں کے سبب ادب کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ غرض ادیبوں کے اس

---

[1] سخن در سخن، ص 37-38

[2] سخن در سخن، ص: 144

رجحان پر محسن بھوپالی کے حوالے سے وہ رقمطراز ہیں:

''جواہل قلم ایک سے زائد اصناف ادب کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں، ان میں سے اکثر عموماً خسارے میں رہتے ہیں کہ ان کی ادبی توانائی مختلف جہتوں میں تقسیم ہوکر ادب کے لیے بھی خسارے کا سبب بنتی ہے لیکن محسن بھوپالی کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ جس صنفِ ادب کو بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں، وہ سونا بن جاتی ہے۔آج کل مہنگائی کی وجہ سے اصلی سونا نایاب ہے،اس لئے محسن بھوپالی کے تیار کردہ سونے کو غنیمت سمجھنا چاہئے''۔ [1]

مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ جواہل قلم ایک سے زائد اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں وہ ادیب نہ صرف اپنے آپ کو خسارے میں رکھتے ہیں بلکہ قاری کے لیے بھی مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ادیبوں پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جوادیب ایک سے زیادہ اصناف ادب میں رواں ہوتے ہیں وہ قارئین کے لیے بہت سے مسئلے پیدا کردیتے ہیں۔شعر کہنے والے نقادوں کی تنقید پر طرحی غزل کا گمان گذرتا ہے اوران کی شاعری تنقید کی طرح خشک نظر آتی ہے۔ ہمارے ایک محقق دوست مزاح نگاری کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ان کی تحقیقی کتاب پڑھتے ہوئے ہنسی آتی ہے اورمزاحیہ مضامین دیکھ کر آنکھ نم ناک ہوجاتی ہیں''۔ [2]

ادیبوں کی تقریر

مشفق خواجہ نے ادیبوں کی تقریروں کو بھی اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔اکثر وبیشتر کسی بھی تقریب میں مقررین وقت کا خیال نہیں کرتے اوراس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے کہ ان کی تقریر کا اثر

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی،ص 70

[2] سخن ہائے ناگفتنی،ص 32

حاضرین پر کیا ہو رہا ہے بس اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے ہی ایک طویل تمہید باندھتے ہیں جس کی وجہ سے تقریر کا مقررہ وقت تقریباً اسی تمہید میں چلا جاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے اردو ڈائجسٹ کی جوبلی کی تقریب میں بھی آئے ادیبوں کی تقریر کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے اور مقررین کو اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اس تقریب میں صرف سنجیدگی ہی نہیں تھی۔ شگفتگی اور شگفتہ مزاجی کے بھی کچھ پہلو تھے۔ مقررین پر یہ قید لگا دی گئی تھی کہ وہ سات آٹھ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیں۔ وجہ یہ تھی کہ حاضری اور مقررین کی تعداد میں انیس بیس ہی کا فرق تھا۔ اگر ہر مقرر اپنے حوصلے کے مطابق تقریر کرتا تو سامعین کا حوصلہ جواب دے جاتا..... ایک صاحب نے تو مقررہ وقت سے کہیں زیادہ وقت یہ بتانے میں صرف کر دیا کہ ان کے لیے اپنی تقریر کو مختصر کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک صاحب جو ہمارے قریب ہی بیٹھے تھے، کہنے لگے: ''قریشی صاحب کا بھی جواب نہیں۔ جن لوگوں کو اپنے رسالے میں نہیں چھاپتے انہیں تقریریں کرنے کے لیے اپنے جلسوں میں بلا لیتے ہیں''۔ ایک دوسرے صاحب نے گرہ لگائی: ''یہ اشتہاری مقررین ہوں گے جس طرح قریشی صاحب اپنے رسالے میں اجرت لے کر اشتہار چھاپتے ہیں، اسی طرح اجرت لے کر تقریریں کرنے کا موقع بھی دیتے ہوں گے''۔ [1]

ادیبوں کے خطوط

ہمارے ادب میں ادیبوں کے نجی خطوط کو بہت اہمیت دی گئی ہے کیونکہ کسی ادیب کی نجی اور ذاتی مراسلت سے جو تحریریں وجود میں آتی ہیں وہ بعض اوقات ادب عالیہ کا نمونہ قرار پاتی ہیں جیسے غالب کے خطوط، سرسید کے خطوط، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، حالی، جوش، علامہ اقبال وغیرہ کے خطوط۔ خط کے تعلق سے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 298

ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ خط یا مکتوب بنیادی طور پر ادب نہیں لیکن بعض خطوط اپنی خصوصیات کی بنا پر ادب کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے کچھ ادیبوں نے مکتوب نگاری کو صنف کے طور پر برتا بھی ہے جیسے ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، قاضی عبدالغفار کی ناول ''لیلیٰ'' کے خطوط وغیرہ۔ مکتوب نگاری میں ادیبوں اور شاعروں کے مکتوبات خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف وہ ادبی محاسن کا مرقع ہوتے ہیں تو دوسری طرف ادیب کی ذاتی زندگی اور شخصیت کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں اور ایک ادیب کے عہد کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق اکثر ادیب جو خطوط کے مجموعے شائع کروا رہے ہیں ان میں زیادہ تر ادب کی بجائے غیر ضروری بحثیں شامل ہوتی ہیں، آج کل تو یہ روایت بھی عام ہوئی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کے خطوط کے ذریعہ ہوتے ہیں انہیں بھی مجموعوں میں شامل کیا جا رہا ہے ۔ ایسے ہی ادیبوں پر مشفق خواجہ کو اعتراض ہے انہوں نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے حوالے سے ادیبوں کی اس خامی پر افسوس کا اظہار کیا ہے:

> ''دو ہفتے ہوئے کہ ہم نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے تازہ ترین جھگڑے کو ختم کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب ہم اس مسئلہ پر لکھنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ اس معرکہ آرائی سے متعلق طرفین کے مراسلات کہیں گم ہو گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی شاعری گم ہو جاتی تو ہمیں اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا ان مراسلوں کے گم ہونے کا ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری تو آدمی کسی بھی وقت کر سکتا ہے، مراسلہ نگاری خاص خاص موقعوں پر اور ضرورت کے تحت ہی کی جاتی ہے''۔ [1]

خطوط چوں کہ اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس سے مکتوب نگار کی شخصیت کے بہت سے گوشوں کا علم ہوتا ہے۔ لیکن عصر حاضر کے خطوط اتنے مختصر ہو گئے ہیں کہ ان سے ادیب کی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 53

شخصیت کو سمجھنا مشکل ہوگیا ہے، ایسے خطوط کو بھی مجموعے کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، اسی صورت حال پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ رقم طراز ہیں:

''مشاہیر کے جو خطوط اس (اگر نامہ بر ملے) مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے بیشتر کو اگر خطوط کی بجائے رسائد کہا جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ ان میں ڈائریوں، کتابوں اور عید کارڈوں کی وصولی کی اطلاع دی گئی ہے اور تہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ رسائد کے علاوہ کتاب میں کچھ ٹیلی گرام بھی شامل ہیں۔ یعنی کچھ خط اتنے مختصر ہیں کہ ان پر ٹیلی گرام کا شبہ ہوتا ہے مثلاً شان الحق حقی کا ایک مکمل خط نقل کیا جاتا ہے:

محبی۔ تسلیم

پیش لفظ کتابت کے بعد ایک نظر دکھا دیں تو ممنون ہوں گا۔

مخلص۔ شان الحق حقی

معلوم نہیں منظر صاحب نے شان صاحب کو ممنون کیا یا نہیں، ہم مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ہمیں ایک ادبی شاہ کار سے استفادے کا موقع دیا گیا''۔[1]

اسی طرح ایک جگہ مشفق خواجہ نے منظر علی خان کے اس خطوط کے مجموعہ پر تبصرہ کیا ہے جس میں چار سو کے قریب خط ہیں۔ ان میں تقریباً آدھے منظر علی خاں کے اور باقی دوسروں کے لکھے خط شامل ہیں۔ اور ان کی تعداد اکیاسی کے قریب ہے، چوں کہ یہ اکیاسی خطوط غیر اہم ہیں اس لیے اس پر مزاحیہ انداز میں مشفق خواجہ نے طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

''وہ لوگ ہیں جنہیں منظر صاحب نے خط کتابت کے لائق سمجھا۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اکیاسی مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ استاد لاغر

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 107

مرادآبادی فرماتے ہیں کہ ایسا بے نتیجہ زورِ قلم کہیں دیکھنے میں نہیں آیا''۔[1]

رشید احمد صدیقی کے خطوط کا پانچواں مجموعہ 'خطوط رشید احمد صدیقی' جس کو لطیف الزماں خان نے 1988ء میں مرتب کیا تھا جس میں رشید احمد صدیقی کے ایسے کئی غیر اہم خطوط کو بھی شامل کیے گئے ہیں ان خطوط کو بھی مشفق خواجہ نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً:

''اس مجموعے میں جس قسم کے خطوط ہیں ان کے نمونے کے طور پر ذیل میں چار خط پیش کیے جاتے ہیں

ا۔ خلیل صاحب۔ کل پانچ بجے شام تک میرا آدمی مارا مارا پھرا اور آپ نہ ملے۔

۲۔ خلیل صاحب مکرم۔ تسلیم۔ اختر الایمان کا پتہ معلوم ہو تو مطلع فرمایئے۔

آپ کا رشید احمد صدیقی۔

۳۔ ایک ذرا دیر کے لیے مجھ سے مل جایئے۔ رشید احمد صدیقی

۴۔ خلیل صاحب۔ اس میں شرکت کیجئے گا۔ رشید احمد صدیقی۔

یہ چار سطریں نہیں چار مکمل ''خط'' ہیں۔ مجموعے میں خاصی بڑی تعداد اسی قسم کے ایک سطری ''خطوط'' کی ہے اور جو کچھ زیادہ سطروں پر مشتمل ہیں ان میں بھی اسی قسم کی باتیں ہیں 149 خطوط میں ایک بھی تو ایسا نہیں ہے جسے رشید صاحب کے خوبصورت اسلوب کا نمونہ کہا جا سکے یا جس میں کوئی کام کی بات ہو۔ ان تحریروں کو اگر رشید صاحب کے خطوط کے کسی بڑے مجموعے کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا جاتا تو ٹھیک تھا لیکن الگ سے کتابی صورت میں شائع کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ جناب مرتب کے کارناموں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا''۔ [2]

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 105

[2] سخن ہائے ناگفتنی، ص 172

ادب کی دنیامیں جب شاعروں اورادیبوں کے خطوط کوقدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگااوران خطوط کوادب پارے میں شامل کیاجانے لگاتو یہ روایت چل پڑی کہ ہمارے محققین بڑے بڑے ادیبوں کے خطوط تلاش کرکے شائع کرنے لگےلیکن کچھ عرصہ بعد مکتوب نگاری کی اس روایت میں تبدیلی ہوتی گئی کہ ادیب خود اپنے نام آئے غیر اہم خطوط کوجمع کرکے شائع کرنے لگے۔جن کی نہ تو ادبی اہمیت ہوتی ہےاور نہ ہی جن سے قاری کوکوئی فائدہ ہوتا ہے۔مشفق خواجہ نے اپنی تحریروں میں جابجاایسے ہی غیر اہم خطوط کے مجموعوں پرطنز کیا ہے۔مثلاًنظیر صدیقی کے خطوط کے مجموعے کے حوالے سے اس طرز کے خطوط پران کا گہرا طنز ملاحظہ ہو:

> ''دوسال پہلے نظیر صدیقی نے بھی ایک مجموعہ چھاپا تھا۔ایسے مجموعوں میں عموماً وہی خط شامل کیے جاتے ہیں جن کی کوئی علمی وادبی اہمیت ہو۔لیکن ''گنجینۂ گوہر کھلا''میں زیادہ تر ان رسیدوں کوجمع کردیا گیاہے، جومختلف افرادنے خیری صاحب کی تصانیف کی وصولی پرانہیں بھیجی تھیں۔بیشتر''رسیدوں'' کامضمون کچھ اس قسم کاہے:
>
> ''آپ کی کتاب ملی۔نہایت عمدہ چھپی ہے۔اس تحفے کے لیے بےحد ممنون ہوں۔کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ کئی بار پڑھ چکاہوں۔اگرعمر نے وفا کی تو کئی باراورپڑھوں گا''۔
>
> اس قسم کی باتیں باربار پڑھ کراحساس ہوتا ہے کہ مکتوب نگاروں کی عمر توضرور وفاکرے گی۔کتاب کے قاری کی عمر شاید ہی وفاکرے''۔ [1]

ادیبوں کے انٹرویوز

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں اصناف ادب اورادیبوں وشاعروں کے علاوہ ان کے انٹرویوکو بھی اپنےطنزومزاح کانشانہ بنایاہے۔ ہمارے اخباروں اورادبی رسائل میں آئے دن کئی ادیبوں کے انٹرویوز چھپتے ہیں مشفق خواجہ کاخیال ہے کہ کسی زمانے میں اخباروں میں سیاست دانوں یافلمی ستاروں کے انٹرویوز

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:208

چھپا کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے ادیبوں کے انٹرویوز ان اخباروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔جن پر وہ مزاحیہ لہجے میں اس طرح طنز کرتے ہیں:

> ''سیاست اور فلم دونوں پر جب برا وقت آیا ہے ادبی ستاروں کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔اب ادیبوں کے انٹرویو اخباروں کی زینت ہوتے ہیں۔جن میں سوال از آسمان جواب از ریسمان والی کیفیت ہوتی ہے''۔ [1]

کسی اخبار میں ادیبوں کی شخصی ملاقات کی تفصیل شائع کرنے کا رجحان اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ بقول مشفق خواجہ یہ ادیب اپنے تخلیقی کارناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے انٹرویوز کی وجہ سے ادبی دنیا میں زندہ رہیں گے۔

دراصل ادیب کی شخصی ملاقات کی روداد اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنی اس کی تخلیقات۔کیوں کہ انٹرویوز میں جس طرح کے سوالات ایک ادیب سے کیے جاتے ہیں اس سے اس ادیب کی نجی زندگی کے معاملات اور زندگی گذارنے کا طریقہ دوسروں سے متعلق اس کے نظریات اور اس کی پسند ناپسند غرض اس کی شخصیت سے وابستہ تمام باتیں سامنے آجاتی ہیں جس سے ادیب کو اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے چنانچہ مشفق خواجہ نے جن ادیبوں کے انٹرویوز کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے ان سے ان ادیبوں کی انانیت، ایک دوسرے پر الزامات دینے کی عادت، ایک دوسرے کو اپنے سے کم تر بتانے کی صفت، دوستوں کے متعلق بے ٹوک بیانات دینے سوال کچھ اور جواب کچھ دینے کی صفت وغیرہ کو بھی بے نقاب کیا ہے۔یوں تو مشفق خواجہ کے کالموں میں بے شمار ادیبوں کے انٹرویوز پر کیے گئے تبصرے ملتے ہیں لیکن یہاں ان تبصروں میں سے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔جیسے فیض احمد فیض، پروین شاکر، اختر الایمان، اشفاق احمد، منیر نیازی، بشیر بدر، کشور ناہید، ساقی فاروقی، جون ایلیا، افتخار عارف، لیث قریشی، انور سدید، سلیم اختر، انیس ناگی، زاہدہ حنا، مجتبیٰ حسین، طاہر مسعود اور سحر انصاری صدیقی وغیرہ۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 89

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے چند بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔فیض احمد فیض جس طرح اپنی شاعری کی وجہ سے مقبول تھے ویسے ہی اپنے انٹرویوز کی وجہ سے بھی مقبول تھے۔چنانچہ مشفق خواجہ ان کے انٹرویوز کی یکسانیت سے گھبراتے ہیں،لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا کہ ہم فیض صاحب کو ان کی شاعری کے حوالے سے جانتے تھے لیکن اب ایک عرصہ ہوا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان شاعری رابطے کا ذریعہ نہیں رہی۔اس سے فیض صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا کہ ماضی بعید میں شاعری کے ذریعہ کمائی ہوئی شہرت اب تک کام ہی نہیں آ رہی بلکہ قومیائے ہوئے بنکوں کی شرح سود کے حساب سے اس میں اضافہ بھی ہو رہا ہے لیکن ہمیں یہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے کہ فیض صاحب سے رابطہ رکھنے کے لیے ان کے لمبے لمبے انٹرویوز پڑھتے ہیں جن میں ایک ہی جیسے سوال اور ایک ہی جیسے جواب ہوتے ہیں۔اتنی یکسانیت تو کبھی فیض صاحب کی شاعری میں بھی نہیں تھی۔ جو ان کے انٹرویز میں نظر آتی ہے۔''[1]

مشفق خواجہ کے مطابق فیض احمد فیض ادب لطیف کے ایک انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''شاعری میں ایک لذت کا پہلو بھی تو ہے،اس میں عیاشی کا پہلو بھی تو ہے،وہ بھی قائم رہنا چاہئے''۔ فیض احمد فیض کے اس جواب پر مشفق خواجہ کو افسوس ہوا۔انھوں نے اپنے مزاحیہ کردار لاغر مرادآبادی کے حوالے سے اس جملے پر اعتراض ظاہر کیا۔وہ لکھتے ہیں:

ہم نے اس جملہ کو بارہا پڑھا ہے ہمیں یقین نہیں آتا کہ فیض صاحب ایسی بات بھی کہہ سکتے ہیں کہاں تو وہ زندگی بھر شاعری انقلاب پیدا کرنے اور معاشرے کو تبدیل کرنے کی باتیں کرتے رہے ہیں اور کہاں اب انہوں نے اس میں لذت اور عیاشی کے پہلو ڈھونڈ لیے ہیں۔چلئے لذت کی حد تک تو یہ

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص 125

کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بہت سے شاعروں کی شاعری گناہِ بے لذت ہوتی ہے وہاں دو چار شاعر ایسے بھی نکل آتے ہیں جن کے شعر سن کر تلخیِ کام و دہن دور ہو جاتی ہے۔لیکن شاعری سے عیاشی کا کوئی تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ہم نے اپنی مشکل جناب لاغر مرادآبادی کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا۔فیض صاحب نے درست فرمایا ہے۔شاعری سے عیاشی کا بہت گہرا تعلق ہے۔ہم نے جب اس کی تفصیل چاہی تو لاغر صاحب نے کہا: ''فیض صاحب کے پانچ شعری مجموعے ہیں جس کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے کم ہے۔لیکن ان پانچوں مجموعوں کو یکجا کر کے ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے جو کلیات شایع کی گئی ہے اس کی قیمت پونے دوسو روپے ہے۔اب ظاہر ہے جسے فیض صاحب کے کلام سے لذت حاصل کرنی ہوگی وہ الگ الگ مجموعے خریدے گا اور جسے عیاشی کرنی ہوگی۔کلیات خریدے گا۔'' [1]

اسی طرح ایک جگہ فیض احمد فیض نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ ''جاوید اقبال کی والدہ ہماری چچی کے رشتے کی کزن ہیں''۔مشفق خواجہ نے فیض کے اس جواب پر شگفتہ انداز تبصرہ کرتے ہوئے طنز کیا ہے:

> ''حیرت ہے کہ اتنی قریبی رشتہ داری کے باوجود فیض صاحب نے علامہ اقبال کی شاعری کا اتنا اثر بھی قبول نہیں کیا جتنا احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں ملتا ہے۔حالاں کہ قاسمی صاحب نے کبھی علامہ اقبال سے رشتہ داری کا دعویٰ نہیں کیا۔'' [2]

اختر الایمان اپنے ایک انٹرویو میں اقبال کے تعلق سے کہا تھا کہ ''ان کا انداز بیان اپنا ہے، بھاری بھرکم، مذہب سے جڑا ہے تو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں، شاعری ڈھونڈیں گے تو واجبی نکلے گی''۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص 58

[2] سخن ہائے گسترانہ،ص 126

اختر الایمان کے اس بیان پر مشفق خواجہ پر لطف انداز میں طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ''ان کا انداز بیان اپنا ہے، بھاری بھرکم، مذہب سے جڑا ہے تو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں، شاعری ڈھونڈیں گے تو واجبی نکلے گی''۔ چوں کہ ہمارا کالم نثری نظم لکھنے والے بھی پڑھتے ہیں اس لئے یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ ''واجبی واجبی'' کے معنی ہیں ''تھوڑا'' یا ''بہت کم'' گویا اختر الایمان کے نزدیک اقبال کے ہاں شاعری برائے نام ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ سخن ور کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سخن فہم بھی ہو۔ ''سخن فہم نہ ہونے کی وجہ سے بعض سخن ور خود کو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔

اگر اقبال کے ہاں شاعری ''واجبی واجبی'' ملتی ہے تو پھر کسی دوسرے شاعر کے ہاں انہیں کم یاب کو تلاش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر گفتگو کی گنجائش اس کالم میں نہیں نکل سکتی۔ ویسے بھی ہمیں بڑے شاعروں کی طرح شاعری کی پہچان واجبی واجبی سی ہے۔''[1]

مذکورہ اقتباس میں لفظوں کے الٹ پھیر سے اور ان کی تکرار سے ان کے اسلوب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اور ان کے اسلوب کی بھی یہی خوبی ہے کہ وہ الفاظ کی تکرار اور اس کے صوتی آہنگ اور الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔

ایک جگہ اختر الایمان نے فیض کی مخالفت کرتے ہوئے ان کی مقبولیت کے بارے میں کہا تھا کہ ''پنجاب کے لوگوں کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے آدمی کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے خوش حال صوبہ ہے زندگی کے تمام شعبوں اور پاکستانی سیاست پر پنجاب کی اجارہ داری رہی ہے اور فیض کے حوالے سے وہی اجارہ داری پنجابی پاکستان کے تمام اردو داں

---

[1] سخن در سخن، ص 210

عوام پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پنجابیوں کی یہ پرانی عادت ہے۔

چنانچہ مشفق خواجہ جو اختر الایمان کے اس بیان پر سخت اعتراض ہے کیوں کہ اس سے علاقائی تعصب نظر آتا ہے اور مشفق خواجہ ایسے ادیبوں کو ناپسند کرتے ہیں جو اس طرح کا تعصب رکھتے ہیں ان کے اس بیان پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے چند سوالات قائم کرتے ہیں:

> ''ہم نے تو یہ سنا تھا کہ شاعری انسان میں وسیع النظری اور کشادہ دلی پیدا کرتی ہے اور شاعر علاقائی تعصّبات سے بلند ہو کر سوچتا ہے مگر اب معلوم ہوا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اختر صاحب کے احترام میں پاکستان کی حد تک ان کی رائے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر وہ روس والوں کے بارے میں کیا کہیں گے جنھوں نے فیض کو لینن پرائز دیا تھا۔ شاید انہوں نے بھی اپنے آدمی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہوگا۔ اختر صاحب سے گذارش ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے ملک کی خبر لیں جہاں فیض پرستی ایک وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہندوستان کے بے شمار ادبی ثقافتی اداروں اور یونی ورسٹیوں نے فیض کی زندگی ہی میں ان کی عزت افزائی نہیں کی بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کو اس طرح یاد رکھا جیسے وہ ان کے قومی ہیرو ہوں۔ فیض کے بارے میں جتنی کتابیں اور رسالوں کے خاص نمبر ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں اتنے پاکستان میں شائع نہیں ہوئے اور تو اور پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں فیض پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا جب کہ ہندوستان میں کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ آخر سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں فیض کے حوالے سے کون اپنی اجارہ داری قائم کر رہا ہے؟''۔[1]

اختر الایمان ترقی پسند شاعروں سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے اپنے ایک انٹرویو میں ترقی پسند

---

[1] سخن در سخن ص:215

شاعروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اکثر ترقی پسند احباب کی شاعری Verification یعنی کلام موزوں سے آگے نہیں جاتی''۔ پھر اپنے جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے چند ترقی پسند شعرا جیسے مجاز، فیض، مخدوم اور فراق وغیرہ کو کسی حد تک شاعر مان لیا تھا لیکن باقی ترقی پسند شاعروں کی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ ان کی شاعری ''تخلیقی شاعری سے باہر کی چیز نظر آتی ہے۔ غرض اختر الایمان کے اس بیان پر مشفق خواجہ کو افسوس ہے وہ اس لیے کہ ان کے نزدیک ذاتی تعصّبات اور ذاتی اعتراضات کو ادبی دنیا میں جگہ نہیں دی جانی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اختر الایمان کے اس بیان کا بڑے تیکھے لہجے میں جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے دو نمائندہ ترقی پسند شاعروں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام لے کر ایسی باتیں کہی ہیں جن کی توقع کسی بھی بامروت شخص سے نہیں کی جاسکتی..... کیفی اعظمی کے بارے میں فرمایا ہے:
>
> ''ایک اور شاعر ہیں کیفی اعظمی، بڑا نام ہے ..... ترقی پسندوں کے مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری بھی دوستی ہے لیکن شاعری کے معاملہ انہیں Genuine شاعر نہیں سمجھتا۔ ان کے ہاں Vericification کے سوا کچھ نہیں ہوتا''۔

ترقی پسندوں سے ہمیں بھی بہت سی شکایات ہیں۔ مثلاً ایک شکایت یہ ہے کہ جب شعر و شاعری کے بغیر ہی آدمی ترقی پسند بن سکتا ہے تو پھر شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا۔ لیکن اختر صاحب کی ناراضی کچھ ذاتی قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ کیفی اعظمی کو وہ ایک طرف اپنا دوست بھی کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف ان کے شاعر ہونے سے انکار بھی کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں دوستوں کے عیبوں کو خوبیوں میں شمار کیا جاتا تھا، افسوس کہ اب خوبیاں بھی عیب بن جاتی ہیں..... ترقی پسندوں نے اختر صاحب کو نظر انداز کیا تھا انہوں نے سارے ترقی

پسندوں کو خارج از آہنگ قرار دے کر معاملہ کو برابر کر دیا۔عوض معاوضہ گلہ ندارد''۔ [1]

اختر الایمان سے ایک انٹرویو میں ساقی فاروقی کے تعلق سے کچھ سوالات کیے گئے تھے مثلاً ''ساقی فاروقی جدید حسیت کے شاعر ہیں، علامتی طرز اظہار بھی رکھتے ہیں آپ ان میں کیا امکانات دیکھتے ہیں؟ جواب میں اختر الایمان نے کہا تھا کہ ''ابھی تو خیر وہ لکھ رہے ہیں ابھی انہوں نے اپنی شناخت نہیں بنائی۔ راشد کی انگلی پکڑ کر چلنے کی کوشش ان کے امکانات کو کم کرتی ہے۔انہیں چاہیے کہ اپنے اندر کے پاور فل شاعر کو باہر آنے دیں''۔ مشفق خواجہ اختر الایمان کے اس بیان پر بڑے مضحکہ خیز انداز میں طنز کرتے ہیں دراصل انہیں اس طرح کے سوالات پوچھے جانے پر سخت اعتراض چنانچہ اپنے اعتراض کو مزاحیہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک اس گفتگو کو سوائے ان کے کوئی مقصد نہیں کہ ساقی فاروقی کی کردار کشی کی جائے۔اول تو یہ پوچھنا درست نہیں کہ اختر صاحب کو ساقی میں کیا امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کسی اور کو کوئی چیز نظر نہیں آتی وہاں بے چارے اختر صاحب کو کیا دکھائی دے گا۔اس سوال کا جواب دیا گیا۔وہ بھی بڑی حد تک نا مناسب ہے۔یہ کہنا غلط ہے کہ ساقی نے ابھی تک اپنی شناخت نہیں بنائی۔اب تک ساقی نے سوائے شناخت کے اور بنایا ہی کیا ہے۔شاعری تو ضمنی چیز ہے جو شناخت بنانے کے دوران خود بخود بنتی چلی گئی۔
>
> اختر صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ راشد کی انگلی پکڑ کر ساقی چل رہے ہیں۔ہمارے نزدیک یہ اعتراض کی نہیں تعریف کی بات ہے۔ساقی دوسرے شاعروں کی طرح چھلانگیں نہیں لگاتے بلکہ درجہ بہ درجہ بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔آج وہ راشد کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں کل پہنچا پکڑیں گے اور پرسوں

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، 47-246

راشد کے کاندھوں پر سوار ہو جائیں گے۔جس طرح آج یہ کہا جاتا ہے کہ احمد
فراز کے رنگ میں فیض شعر کہتے تھے۔اسی طرح کل یہ کہا جائے گا ن م راشد
ساقی فاروقی کے مقلد تھے"۔ [1]

پروین شاکر کا شمار اردو ادب کی مقبول و مشہور شاعرات میں ہوتا ہے۔ایک انٹرویو میں امجد الاسلام امجد نے ان کی بے پناہ شہرت کے تعلق سے سوال کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ" آپ کا جو فنی ارتقاء ہے اس میں یہ دباؤ یا پریشر جو شہرت کا ہوتا ہے، اس نے آپ کو کہاں تک مدد دی ہے"۔ یہ سوال بھی مشفق خواجہ کے لیے مذاق کا موضوع بنا چنانچہ امجد کے سوال اور پروین شاکر کے جواب دونوں بڑے مضحکہ خیز انداز میں طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

"ہمیں امجد الاسلام امجد کا سوال پسند آیا۔شہرت کے دباؤ کے تحت شاعری
کرنا بالکل نئی بات ہے۔یہ تو سنا تھا کہ بعض لوگ حالات کے دباؤ کے تحت غلط
کام کرتے ہیں یہ اب معلوم ہوا کہ شہرت کے دباؤ کے تحت بھی بہت کچھ کیا
جا سکتا ہے..... ۔آپ شاعرہ کا جواب ملاحظہ فرمایئے:"میرے خیال میں شہرت
ذرا پہلے میرے گھر چل کر آ گئی تھی اس کو دیر سے آنا چاہئے تھا.....جلدی شہرت
ملنے میں نفع و نقصان دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔لیکن میرا خیال ہے کہ فائدے
کا پلہ بھاری رہتا ہے"۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کہ شہرت کو دیر سے آنا چاہئے تھا۔اگر شہرت دیر سے آتی تو شاعری بھی دیر سے شروع ہوتی۔مجموعہ بھی دیر سے چھپتے۔گویا معاملہ بیسویں صدی کے اختتام یا اکیسویں صدی کے شروع تک پہنچ جاتا۔ظاہر ہے اس وقت تک ہم جیسے عمر رسیدہ اور مرد و گرم زمانہ چشیدہ شائقین ادب کی دائمی مفارقت کو ایک عرصہ گزر چکا ہوتا۔لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبل از وقت شہرت

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 249

سے ادب کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم جیسے شائقین ادب کو ضرور یہ فائدہ پہنچا ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہرت کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور شہرت اور شاعری کے دوڑ میں شہرت کس طرح آگے نکل جاتی ہے"۔ [1]

ایک جگہ پروین شاکر نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ "بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے شاعر بڑے غیر ذمہ دار ہیں۔ گھر میں بھی اور باہر بھی اسی وجہ سے ان کی امیج خراب ہو رہی ہے"۔ چنانچہ پروین شاکر کے اس غیر ذمہ دارانہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے طنزیہ انداز میں چوٹ کی ہے، لکھتے ہیں:

"ہم شاعر نہیں ہیں، لہذا اس الزام کی تائید یا تردید کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ تاہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ محترمہ اگر ان ہی برادری کے بارے میں اتنی سخت الزام تراشی سے اجتناب کریں تو بہتر تھا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی۔ ہم بعض شاعروں کو جانتے ہیں جو اس حد تک ذمہ دار ہیں کہ گھر میں یا گھر سے باہر اپنی کسی حرکت سے شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری سے بھی ان کے شاعر ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی"۔ [2]

انیس ناگی نے اپنے ایک انٹرویو میں اشفاق احمد کو "کامیاب ادیب" کہا تھا۔ اس کے بارے میں اشفاق احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "انیس ناگی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔ غرض مشفق خواجہ ان دونوں ادیبوں کے ان بیانات کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"شفاق احمد کو اگر انیس ناگی کی شاعری سمجھ میں نہ آئے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ ایک سخن گوئی اور دوسرے کی سخن فہمی "عالم بالا" سے تعلق رکھتی ہے"۔ [3]

---

[1] [2] خامہ بگوش کے قلم سے ص:220

[3] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 104

منیر نیازی پاکستان کے ایک اہم شاعر ہیں۔ آئے دن ان کے انٹرویو پاکستانی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ غرض انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنی مقبولیت کے تعلق سے حوالہ دیا تھا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے تعلق سے کراچی میں ایک تقریب میں کہا تھا کہ ''پتہ نہیں، منیر نیازی کو پاکستان میں کیا حیثیت ہے، لیکن ہم 26 سال سے منیر نیازی کی دیوتا کی طرح پوجا کرتے ہیں، ہندوستان میں ان کے بے شمار متاثرین ہیں''۔ چنانچہ منیر نیازی کے انٹرویو کے اس دلچسپ پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بیان پر مضحکہ خیز لہجے میں چوٹ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں تو اب تک یہی معلوم تھا کہ زلزلے، قحط اور سیلاب وغیرہ کے ضمن میں ''متاثرین'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ شاعروں کے بھی ''متاثرین'' ہوتے ہیں۔ پوجا والی بات سے بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ تو ہم جانتے تھے کہ بھارت میں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ منیر نیازی کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے''۔[1]

اسی طرح ایک اور انٹرویو میں منیری نیازی نے مشاعروں کی اہمیت بتاتے ہوئے کیا تھا کہ اسسے شاعری کو فائدہ پہنچ سکتا ہے''۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعروں کو سوسائٹی کے رہبر بھی کیا اور قاری کی پریشانی کا باعث بھی کہا ہے۔ ان کے اس دوطرفہ بیان کو مشفق خواجہ نے اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''منیر نیازی سے سوال کیا گیا: ''کیا مشاعروں سے شاعری کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ منیر نیازی نے جواب دیا ''ہاں پہنچتا ہے۔..... ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں شعرا پیدا ہوئے ہیں جو سوسائٹی میں ادب کا شوق پیدا کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف نقص یہ ہے کہ وہ جو مضامین نظم بند کر رہے ہیں ان میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ایک ہی بات کو رگڑے جا رہے ہیں۔ حرف کی تکرار سے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 91

انہوں نے ذہنوں کو بوجھل کردیا ہے۔ پریشان کردیا ہے قاری کو''منیر نیازی

ایک طرف تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری قوم میں شاعر پیدا ہوئے ہیں

دوسری طرف انہیں شکایت ہے کہ شعرائے کرام قاری کو پریشان کررہے ہیں۔

منیر نیازی کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس رفتار سے شعرائے کرام پیدا ہورہے ہیں،

اس کے مقابلے پر قارئین کی شرح پیدائش بہت کم ہے،اور اس کا امکان ہے کہ

آگے چل کر یہ جنس بالکل معدوم ہوجائے۔ایسی صورت میں قاری کی پریشانی

کا تذکرہ غیر ضروری ہے،شعرائے کرام کی پیدائش پر شکر ادا کرتے رہنا ہی کافی

ہے۔نیز اس عذاب الٰہی سے ڈرتے رہنا چاہیے جو شاعروں کی صورت میں

قوموں پر مسلط کیا جاتا ہے''۔ [1]

بعض ادیب اپنے انٹرویوز میں بغیر سوچے سمجھے بیانات دیتے ہیں۔ان کی کہی ہوئی بات کا دوسروں پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی پروا کیے بغیر ہی بیانات دیتے ہیں بعض اوقات بزرگ شعرا و ادیبوں کا بھی احترام ملحوظ نہیں رکھتے اور اپنے آپ کو ان بزرگ ادیبوں کی صف میں کھڑا کردیتے ہیں۔بشیر بدر نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں ایسی ہی بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا جس پر مشفق خواجہ کو ان کے اس جواب پر افسوس ہوا۔بشیر بدر کے اس جواب پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے اسے ادیبوں پر چوٹ کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''کوئی کچھ بھی کہیے، ہم سمجھتے ہیں کہ بشیر بدر اچھے شاعر ہی نہیں ایک صاف گو

آدمی بھی ہیں، حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار میں ان کا ایک انٹرویو،

ہندوستان کے کسی اخبار سے نقل ہوا ہے۔اس میں انہوں نے حق گوئی و بے باکی

کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جس کی کسی دوسرے سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ان سے

پوچھا گیا،سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے بارے میں آپ

کی کیا رائے ہے؟فرمایا:میرا معاملہ میر اور غالب سے ہے۔وہی میرے حریف

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 101

ہیں اور میں انہیں اپنا حریف سمجھتا ہوں''۔ہمارا خیال ہے کہ بشیر بدر نے انکساری سے کام لیا ہے ورنہ میر و غالب کی کیا حیثیت ہے جو ان کے منہ آئیں۔حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر جس مقام پر ہیں، وہاں کسی دوسرے شاعر کا پہنچنا تو کیا، وہاں سے واپس آنا بھی ناممکن ہے''۔[1]

مشفق خواجہ نے بعض انٹرویوز کے جوابات پر اپنے کردار استاد لاغر مرادآبادی کیحوالے سے دلچسپ انداز میں چوٹ کی ہے جس میں مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے اور طنز کی گہری کاٹ بھی اور مزاحیہ مثالیں پیش کی ہیں۔مثلاً حسن رضوی نے وارث علوی، وزیر آغا، انتظار حسین اور فاروقی کے بارے میں لکھے ہوئے مضامین کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی تھی۔اس کا جواب دیتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا تھا

''دراصل وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تحریر میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے جملے، لطیفے اور پھلجڑیاں ضروری ہیں اگر یہ جملہ اور فقرے نکال دیئے جائیں تو مضمون بہت چھوٹے رہ جاتے ہیں۔''

اس پر مزاحیہ انداز میں طنز کرتے ہوئے استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

''استاد: فاروقی کا اندازہ درست نہیں ہے۔اگر وارث علوی کے مضامین سے لطیفے، جملے اور پھل جھڑیاں نکال دی جائیں تو باقی صرف عنوان رہ جاتا ہے۔''[1]

[1] سخن ہائے گسترانہ، مرتب ڈاکٹر انور سدید، فضلی لمٹیڈ کراچی، ص334)

اس طرح ایک اور اقتباس دیکھیے جس میں حسن رضوی نے شمس الرحمٰن فاروقی سے یہ پوچھا تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے تو فاروقی صاحب نے جو جواب دیا تھا اس پر مشفق خواجہ طنزیہ لہجے میں استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے یوں تبصرہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص18

''فاروقی: بہت چھوٹی عمر میں ہم نے اپنے گھر میں ہی ہاتھ سے لکھ کر ایک
پرچہ ''گلستان'' کے نام سے نکالا کرتے تھے۔کوئی واضح صنف متعین نہیں تھی۔
جو جی میں آتا تھا، لکھتے جاتے تھے''۔

''استاد: اب تک اسی روش پر عمل ہو رہا ہے، جو جی میں آتا ہے.....''؟[1]

اسی طرح انتظار حسین نے ایک انٹرویو میں شمس الرحمٰن فاروقی سے سوال کیا تھا کہ ''فراق پر بھی اتنا کام نہیں ہوا، جتنا میر یا غالب پر ہوا ہے، حالانکہ فراق کے ہاں بھی ایک روانی موجود ہے جو میر کی میراث گردانی جاتی ہے؟'' اس سوال پر فاروقی صاحب نے جواب دیا تھا کہ آپ نے فراقؔ کے ساتھ میرؔ کا نام لیا ہے۔ان دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔میر جہاں سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔فراق وہاں سے تین سو میل پیچھے ہیں''۔فاروقی صاحب کے اس جواب پر مشفق خواجہ کو سخت اعتراض ہے ان کے مطابق کسی کی بڑائی بیان کرنے کے لیے زمانی فاصلہ ناپنے کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ وہ استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے بڑے تیز لہجے میں طنز کرتے ہیں:

''استاد: گھوڑ دوڑ میں تو فاصلہ ناپا جاتا ہے لیکن شاعروں کے درمیان زمانی
فاصلے کو معیار بنانا بالکل نئی بات ہے۔اگر یہ اسلوب تنقید مروج ہو گیا تو اس قسم
کی تنقید لکھی جائے گی۔شمس الرحمٰن فاروقی وارث علوی سے ایک سو میل آگے
ہیں، گوپی چند نارنگ سے ساٹھ میل پیچھے ہیں۔باقر مہدی، وارث علوی سے چھ
فٹ اونچے ہیں، کیونکہ وہ علوی کے کندھوں پر سوار ہیں''۔ [2]

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر آیا ہے کہ ہمارے بعض ادیب اپنے انٹریوز میں بغیر سوچے سمجھے بیانات دیتے ہیں چنانچہ ساقی فاروقی نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں اپنے معاصرین شعراء کے لیے ''جاہل'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔مشفق خواجہ کے مطابق ایسی غیر اخلاقی باتیں ایک اچھے ادیب کو زیب نہیں دیتی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 333

[2] سخن ہائے گسترانہ،، ص 335

انہوں نے ساقی فاروقی کے اس غیر اخلاقانہ رویہ پر اپنے مزاحیہ کردار لاغر مرادآبادی کے حوالے سے مزاح کے پیرائے میں طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

''استاد لاغر مرادآبادی کا قول ہے کہ ہر شخص جاہل کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا کیونکہ بیسویں صدی میں جاہل ہونے کے لیے بھی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اعزاز حاصل کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا''۔ [1]

پاکستان کے ایک مشہور شاعر لیث قریشی نے اپنے ایک انٹرویو کے بیان میں کہا تھا کہ ''میں غزل کہہ کر اپنے اندر طمانیت محسوس کرتا ہوں''۔ لیکن مشفق خواجہ اس بات سے متفق نہیں ہیں انہوں نے ان کے اشعار کے حوالے سے ان کے اس بیان پر طنزیہ لہجے میں چوٹ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

'' جناب شاعر غزل گوئی پر اس حد تک نادم ہیں کہ اپنے شعروں کو اپنی خطاؤں میں شمار کرتے ہیں۔

لیث شاید مری فطرت کا تقاضا ہے یہی
شعر ہوجاتے ہیں سرزد جو خطا کی صورت

یہاں تک تو معاملہ غنیمت ہے کہ ہر نیک دل انسان اپنی خطاؤں پر نادم ہوتا ہے لیکن ایک مقطع تو انہوں نے ''حسن تغزل'' سے بھی بے تعلقی کا اعلان کر دیا ہے:

لیث تیری فکر میں حسنِ تغزل ہے کہاں
یہ غزل تو شیخ سعدی کی حکایت ہوگئی [2]

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویوز میں دیئے گئے بیانات کو ان کے جملوں اور انہیں کے اشعار کے حوالے سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ان کے غیر ذمہ

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 62
[2] سخن در سخن، کراچی ص 37

دارانہ بیانات پر طنز کرتے ہیں اور اس طرح ان کی خامیوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔

پاکستان کی ادبی دنیا میں ڈاکٹر انوار سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر دو بڑی شخصیتیں ہیں ایک دفعہ ان دونوں حضرات سے ایک انٹرویو میں یہ سوال کیا گیا کہ: آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اس سوال پر انوار سدید کہتے ہیں کہ پڑھتے وقت ذہن میں کچھ نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں اور لکھتے وقت ان سوالات کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں، اور ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا تھا کہ: لکھنا میرے لیے ایک طرح کا نشہ ہے"۔ چنانچہ مشفق خواجہ ان دونوں کے جوابات بڑے لطیف اور دلچسپ انداز میں دیتے ہوئے ان کے ان بیانات پر طنز کرتے ہیں:

> ''ہمارا تجربہ ڈاکٹر انوار سدید سے بالکل مختلف ہے۔ ہم خالی الذہن ہو کر پڑھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی گرہ پیدا ہی نہیں ہوتی جسے کھولنے کے لیے لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ لکھتے ہم اس لئے ہیں کہ ہمارے خالی الذہن ہونے کا دستاویزی ثبوت موجود رہے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمارے مقابلے پر خاصے خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں گرہیں ہیں اور ہر گرہ کی گرہ میں بے شمار ادبی مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے حریف کی طرح ادیبانہ تکلف سے کام نہیں لیا جو اصل حقیقت تھی صاف صاف بیان کر دی۔ فرمایا: ''لکھنا میرے لئے ایک طرح کا نشہ ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ نشہ حد اعتدال سے بڑھ گیا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نشے سے انہیں کوئی نقصان پہنچا ہے۔ حالانکہ نشہ اور نقصانات لازم و ملزوم ہیں۔ ادب کا نشہ بھی کیا نشہ ہے کہ اس میں چور ہو کر لکھنے والا تو عالم سرور میں رہتا ہے اور سارے نقصان پڑھنے والوں کے حصے میں آتے

ہیں''۔ [1]

انٹرویو دینے والے شخص کو اپنے خیالات کے اظہار پر پوری آزادی ہوتی ہے لیکن بعض لوگ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں اور دوسروں کے تعلق سے ایسے ایسے بیانات دیتے ہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوتے ایسا ہی ایک انٹرویو انیس ناگی کا شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے سوائے احمد ندیم قاسمی کے اردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں پر الزامات عائد کیے تھے۔ مشفق خواجہ کو ان الزامات سے اتفاق نہیں۔ انہوں نے ان کے بے جا الزامات کی تردید کرتے ہوئے ان پر طنز کے گہرے تیر چلائے ہیں:

> ''انیس ناگی نے اپنے انٹرویو میں صرف احمد ندیم قاسمی کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل قاسمی صاحب کا ستارہ عروج پر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی، بادلِ ناخواستہ سہی، کبھی کبھی کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ زیرِ نظر انٹرویو میں ان کے ناوکِ ناز نے زمانے میں کوئی صید نہیں چھوڑا یہاں تک کہ مولانا حالی اور فیض کو اوسط درجے کے شاعر قرار دیا ہے۔ قتیل شفائی کو فلمی شاعر کہہ کر ان کے ادبی مقام کی نفی کی ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ چالیس برس سے ایک ہی نقطے پر جمے ہوئے ہیں۔ افتخار جالب اور انور سجاد کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ دونوں زر کی تلاش میں ادب کو چھوڑ گئے ہیں۔
>
> مجید احمد کے مجموعے کلام 'شب رفتہ'' کو بہت کمزور مجموعہ بتایا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی پر الزام لگایا ہے کہ وہ لغت پر انحصار کرتے ہیں۔ انیس ناگی یہی الزام انتظار حسین پر بھی لگا چکے ہیں۔ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، اگر کوئی لکھنے والا ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے معنی پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہیں تو اسے بھی لغت پر انحصار کرنا چاہئے۔ جس لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں۔ لغت میں

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 130

دیکھ لینے چاہئیں۔ویسے ہم مشتاق احمد یوسفی اور انتظار حسین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ جب کوئی کتاب لکھیں تو اس کے ساتھ فرہنگ بھی لگا دیا کریں تا کہ انیس ناگی کی شکایت رفع ہو جائے۔شاید مشکل الفاظ ہی کی وجہ سے انیس ناگی کو میر کے ہاں بھرتی کے اشعار زیادہ نظر آتے ہیں۔فرہنگ میر، کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔شاید موصوف کی نظر سے نہیں گذری ورنہ بھرتی کے شعروں کی تعداد میں معقول حد تک کمی ہو سکتی تھی''۔ [1]

مذکورہ اقتباس قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن بات کی پوری طرح وضاحت ضروری تھی تا کہ مشفق خواجہ کی بات پوری طرح ہمارے سامنے آئے اور ان کا مقصد واضح ہو جائے۔

بعض انٹرویو بہت دلچسپ ہوتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔زاہدہ حنا کا بھی ایسا ہی ایک دلچسپ انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے ایک جگہ شعرا کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے شعراء حضرات غلطی سے شادی کر لیتے ہیں کیونکہ ان کو اس رشتہ کو نبھانے کا سلیقہ نہیں آتا انہیں عوام سے اس رشتہ کو نبھانے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔زاہدہ حنا کے اس بیان پر مشفق خواجہ نے نہایت دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اس بیان کا مذاق اڑایا ہے، لکھتے ہیں:

''محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شعرا حضرات اگر غلطی سے شادی کر لیں تو انہیں اس رشتہ کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہئے۔محترمہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ شادی کوئی شاعری نہیں ہے جو کسی غلطی کے نتیجے میں وجود میں آئے۔آدمی خوب سوچ سمجھ کر اور خاصی رقم صرف کر کے شادی کرتا ہے اور پھر شادی مزاحمتی ادب جیسی کوئی چیز بھی نہیں ہے جو عوام کے مفاد میں اور عوام کے مشورے سے کی جائے۔شعرا تو ہر معاملے میں عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، شادی کے مسئلہ میں وہ عوام کی رہنمائی کیوں کر قبول کر سکتے ہیں۔

---

[1] سخن در سخن، کراچی ص 125

محترمہ سے گذارش ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی حدود میں رہیں اور شاعروں کے ازدواجی معاملات کو انہیں پر چھوڑ دیں۔

ہم شاعر نہیں ہیں لیکن شاعروں کے ہمدرد ضرور ہیں۔اس لئے ہم محترمہ کے مشورے کو نا قابل قبول ہی نہیں، ادب کے لئے نقصان دہ بھی سمجھتے ہیں۔اگر شعرا حضرات شادی نہ کرتے تو ہمارے بہت سے بڑے شاعر پیدا ہی نہ ہوتے کیونکہ وہ خود شاعروں کی اولاد میں سے ہیں۔مثلاً ماضی میں میر انیس کے خاندان میں سات پشتوں تک شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔اگر میر انیس کے جد امجد زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل کرتے تو اردو شاعری میر انیس جیسے بڑے شاعر سے محروم رہ جاتی۔اسی طرح موجودہ زمانے میں جون ایلیا کے خاندان میں بھی چار پشتوں سے شاعری ہو رہی ہے۔خدا کا شکر ہے کہ محترمہ زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل نہیں ہوا اور نہ آج جون ایلیا جیسا طرح دار شاعر ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا''۔ [1]

یہ مثال بھی قدرے طویل ہے دراصل مشفق دلائل کے ذریعے اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اس لیے ان کی بات کو سمجھنے کے پورا اقتباس دینا ضروری تھا۔

پاکستان کے ایک مشہور نقاد مجتبیٰ حسین اپنے ایک انٹرویو میں تنقید اور نقاد دونوں پر اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ تنقید نگار کا کام بہت خطرناک ہوتا ہے نقاد پڑھنے والے اور لکھنے والے دونوں کا بدخواہ ہو جاتا ہے چنانچہ مشفق خواجہ مجتبیٰ حسین کی اس رائے پر اپنے کردار لاغر مراد آبادی کے ذریعہ اس طرح طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''نقاد کا کام اگر صرف پیغام رسانی ہے تو پھر یہ خدمت بہتر طریقے سے بھی انجام دی جاتی ہے۔یعنی نقاد ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی ڈاک خانے میں

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 116

ملازمت کرے اور گھر گھر گھوم کر چٹھیاں تقسیم کرے۔ گھومنے پھرنے کی وجہ سے
ڈاک تقسیم کرنے والے کی صحت بھی اچھی رہتی، جب کہ نقاد ادب کے غم میں
گھل گھل کر اپنی صحت خراب کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ لکھتا ہے اسے پڑھ کر
دوسروں کی صحت بھی خراب ہوتی ہے"۔ [1]

ادبی معرکے

ادبی معرکے سے مراد ایک ہی فن کے دو ماہرین میں نوک جھونک اور معاصرانہ چشمک ہے فن کاروں کی یہ نوک جھونک کبھی اشاروں، کنایوں تک محدود رہتی ہے تو کبھی یہ ہجو ملیح کی منزلیں طے کر لیتی ہے جس کی وجہ سے باہمی لعن طعن، ذاتی عیب جوئی، فقرے بازی گالی گلوچ کی نوبت بھی آجاتی ہے، غرض ادبی معرکے کی بنیاد اسی معاصرانہ کشمکش پر قائم ہوتی ہے اور یہ کشمکش ان تمام چیزوں کا احاطہ کر لیتی ہے جو ذاتی غم و غصہ اور عصری عصبیت کے باعث وجود میں آتی ہے۔

ادبی معرکے خفیف اور معمولی چشمکوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ مگر بعض معرکوں میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان سے پوری ادبی فضا متاثر ہو جاتی ہے۔ پھر ان معرکوں کا معاملہ خفیف و شدید مخالفت تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ کہیں ایک فریق خاموش نظر آتا ہے اور دوسرا برسر پیکار۔ کہیں ایک گروہ علی الاعلان چیلنج کرتا ہے اور دوسرا خاموش سازشیں۔ غرض ادبی معرکے ہمارے ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جن کا ذکر کیے بغیر ہمارے اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ہر دور میں شعرا و ادیبوں کے بیچ معصرانہ چشمک رہی ہے چنانچہ مشفق خواجہ نے بھی اپنے دور کے چند ادیبوں اور شاعروں کی معصرانہ چشمک، نوک جھوک اور ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور ادیبوں کے بیچ چھوٹی موٹی رنجشوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ادبی معرکہ آرائیوں ہی کی وجہ سے ہمارے ادب میں ہجو نگاری کو فروغ ہوا ہے۔ اردو ادب میں معرکہ آرائیوں کی روایت پر اظہار کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 168

''دنیائے ادب میں معرکہ آرائیوں کی روایت بہت پرانی ہے۔''نقوش'' کا ادبی معرکہ نمبر دیکھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ادب کی تاریخ ''معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔اس بناپر ہمارے ہاں ہجونگاری کوفروغ ہوا۔اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے ہجو سے اپنے قلم کوآلودہ یا آسودہ نہ کیا ہو۔اردو شاعری کا کڑے سے کڑا انتخاب بھی کیا جائے تو اس میں دوچار ہجویات ضرور شامل ہوں گی''۔ [1]

مشفق خواجہ کے نزدیک ادبی معرکے اردو زبان وادب کے حق میں فائدہ مند ہو نہ ہو لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض خوابیدہ الفاظ نئے اور پرانے مفاہیم کے ساتھ دوبارہ استعمال میں آجاتے ہیں ان کے مطابق جو ادیب خواب غفلت میں ہوتے ہیں وہ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے ادب سیگہری سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

مشفق خواجہ نے اپنی تحریروں میں جابجاان ادیبوں کی چھوٹی موٹی رنجشوں پر اظہارخیال کیا ہے جس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کے انہیں ان معرکہ آرائیاں سے بہت دلچسپی ہے ان کا خیال ہے کہ وہ جب بھی کسی ادبی معرکے پر تبصر کرتے ہیں تو فریقین میں سے کسی کی طرف داری نہیں کرتے اور نہ ان کی صلح کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے بڑی سادگی سے اپنے کالموں میں ان معرکوں پر کی گئی بحثوں کی مزاحیہ انداز میں صراحت کی ہے لکھتے ہیں:

''ہم فریقین میں سے کسی کی طرف داری نہیں کرتے تا کہ ہارنے والا ہمیں اپنی شکست کا سبب نہ سمجھے اور جیتنے والا جیت کو ہماری دعاؤں کا نتیجہ نہ گردانے۔ ہم صلح کرانے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ اس طرح فریقین کی صلاحیتوں کے اظہار کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ہم جھگڑے کو بڑھانا بھی پسند نہیں کرتے یہ ہماری خواہش کے بغیر بھی بڑھ سکتا ہے اور اکثر بڑھ جاتا ہے۔ہم تو صرف اتنا کرتے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 194

ہیں کہ اہم ادبی جھگڑوں کی تفصیلات اپنے کالموں میں محفوظ کر دیتے ہیں تا کہ آئندہ کبھی دوبارہ یہ جھگڑا شروع ہو تو اس کا ریکارڈ فریقین کے سامنے رہے اور بات جہاں ختم ہوئی تھی وہیں سے اسے آگے بڑھانے میں مدد ملے"۔ [1]

کسی زمانے میں ان ادبی معرکوں کی بڑی قدر تھی یعنی کسی معرکے کے تحت کوئی ادبی تخلیق شائع ہوتی تو ادبی دنیا میں ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگتا تھا اور ہر کوئی اپنی رائے دینے لگتا تھا۔ اور ان جھگڑوں سے بہت جلد نتائج برآمد ہوتے تھے لیکن آج کے عہد میں کچھ ادیبوں کے ایسے معرکے ہیں جو سالوں سال بعد بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے چنانچہ انہوں نے حماعت علی شاعر اور محسن بھوپالی کے حوالے سے ایسے ادیبوں پر طنز کیا ہے:

"پرانے زمانے کے شاعر وقت کی قدر کرنا جانتے تھے، اس لئے باہمی جھگڑوں کو طے کرنے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ ایک ہم ہیں کہ تیس تیس سال سے جھگڑ رہے ہیں اور کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ ہمارا اشارہ حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی کی طرف ہے جنہوں نے ایک دوسرے کے خلاف تیس سال پہلے جو محاذ آرائی شروع کی تھی وہ ہنوز تحریر جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جمع تو کچھ نہیں ہوا، دونوں ایک دوسرے کے خلاف مضمون نگاری ہی میں خرچ ہو چکے ہیں"۔ [2]

محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کی معرکے آرائی اکثر مضمون نگاری میں ہوئی تھی لیکن ان دونوں کے کلام میں اپنے اس معرکے کے اشارے ضرور ملتے ہیں جس کو مشفق خواجہ اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنا کر ان دونوں کی معرکہ آرائیوں کا یوں مذاق اڑاتے ہیں:

"محسن اور شاعر میں ایک زمانے میں دوستانہ تعلقات تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت شاعر فرماتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 194

[2] سخن در سخن، ص 223

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھاکر تو کہتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

محسن بھوپالی کاارشاد ہے:

بہتر ہے کہ اس بزم سے اٹھ آیئے محسن
سرقے کو جہاں رتبہ الہام دیا جائے

شعر دونوں ہی اچھے ہیں۔اس سے خیال آتا ہے کہ اگر یہ معرکہ آرائی نثر کی بجائے نظم میں ہوتی تو دونوں کے عیب و ہنر زیادہ بہتر طریقے سے سامنے آجاتے۔ ہماری رائے میں چالیس چالیس صفحات کے مضامین لکھنے سے بہتر ہے کہ دونوں دس دس پندرہ پندرہ شعروں پر مشتمل ایک دوسرے کی ہجویات لکھیں۔ہجونگاری ہمارے کلاسیکی ادب کا وقیع حصہ ہے۔اس صنف سخن کو ازسرنو زندہ کر کے یہ دونوں شاعر خود بھی زندہ جاوید ہو جائیں گے۔یہ مرتبہ انہیں اپنے غیر ہجویاتی کلام کی وجہ سے شاید ہی مل سکے۔دونوں ساٹھ ساٹھ برس سے زیادہ کے ہو چکے ہیں۔یہ عمر بقول شخصے خامیوں میں پختہ ہو جانے کی عمر ہے جب یہ دونوں ہجویات لکھیں گے تو ایک دوسرے کی خامیوں کو مزید پختہ کر دیں گے۔[1]

اسی طرح ایک مرتبہ حمایت علی شاعر نے محسن بھوپالی پر ایک الزام لگایا تھا کہ ان کے ایک شعر میں سرشار صدیقی کے شعر کی مماثلت پائی جاتی ہے۔اس الزام کا جواب دیتے ہوئے محسن بھوپالی نے کہا تھا کہ مماثلت کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی خیال کو تخلیق کار نے کس جدتِ خیال اور کس اسلوب و انداز میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں فریقین کے ان بیانات سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے ان بیانات پر دونوں کے اشعار کے حوالے سے بھرپور چوٹ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''حمایت علی شاعر نے محسن بھوپالی پر الزام لگایا تھا کہ ان کے اور سرشار صدیقی کے ایک شعر میں حیرت ناک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔سرشار کا

---

[1] سخن در سخن، ص225

شعر ہے:

میں نے اس حال میں ایک عمر بسر کی سرشارؔ
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

محسن کا شعر ہے:

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک ہی دن سہی بسر تو کر

معلوم نہیں، جناب شاعر کو ان شعروں کی مماثلت پر حیرت کیوں ہوئی جس سرشار صاحب نے ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزاری کیا اسی طرح محسن بھوپالی صاحب نہیں گزار سکتے؟ ناگفتہ بہ حالت سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ دونوں شاعر ہیں اور کئی کئی شعری مجموعوں کے مصنف ہیں اور پھر سب سے بڑی مماثلت یہ ہے کہ دونوں اخباری کالم نویس ہیں اور کالم بھی ایسے لکھتے ہیں جو بہت سے شاعروں کی شاعری سے زیادہ مقبول ہیں''۔

آگے لکھتے ہیں:

''مذکورہ دونوں شعروں میں محسن بھوپالی کا شعر سرشار صدیقی کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ سرشار کے ہاں لہجہ بڑا دھیما، بلکہ معذرت آمیز ہے جیسے انہوں نے عمر بسر نہیں کی، کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس کے برعکس محسن کے شعر کا لہجہ پرشکوہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مخاطب کو ڈرا دھمکا رہے ہوں اور پھر زیست کانٹے اور گھاس کاٹنے میں جو صوتی مماثلت ہے اس سے بھی شعر کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے''۔ [1]

منٹو اور اشک کے بیچ بھی کچھ رنجشیں تھیں۔ ایک عہد کے دو بڑے فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ غرض منٹو اور اشک کے بیچ اس معرکے کی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 54-55

تفصیلات بتاتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی ان خامیوں پر منٹو کے الفاظ کے ہی حوالے سے گہری چوٹ کرتے ہیں، مثلاً:

> ''منٹو اور اشک کے تعلقات عجیب وغریب تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ محبت بھی کرتے تھے اور نفرت بھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بظاہر دوستانہ لیکن بہ باطن منافقانہ رویہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کو خوش دیکھ کر رنجیدہ ہوجاتے تھے۔ اشک نے اپنے ڈراموں کے مجموعے ''چرواہے'' کا انتساب منٹو کے نام ان الفاظ سے کیا تھا ''منٹو کے نام جو کبھی مجھے اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت برا''۔ اشک کے بارے میں منٹو کی رائے بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ اشک سے کہا تھا'' میں تمہیں پسند کرتا ہوں حالاں کہ مجھے تم سے نفرت ہے''۔ منٹو نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت کے زمانے میں اشک کی تذلیل کی۔ اس کے جواب میں اشک نے سازش کر کے منٹو کو ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے اور دہلی سے بمبئی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ منٹو نے بمبئی آ کر اشک کو بھی اصرار کر کے وہیں بلایا۔ بمبئی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے لیے پریشانی کا باعث بنتے رہے۔ یہ صورتِ احوال کچھ ایسی ہے جیسے دونوں (منٹو کے الفاظ میں) ایک دوسرے کے لیے استروں کی مالا بن گئے تھے جس کا پہننا بھی مشکل تھا اور اتارنا بھی''۔ [1]

اسی طرح مشفق، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر فراقی کے درمیان ہوئی چشمک کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ان ادیبوں کا ایک کانفرنس میں ایک دوسرے کی مخالفت کرنا اور دوسری ملاقات میں ایک دوسرے کے قریب آنے کے واقعات پر بڑے مزاحیہ اور پر لطف انداز میں طنز کیا ہے مثلاً وہ

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 77

لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر انوار سدید اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے تعلقات کی خرابی کا سبب بھی انشائیہ ہے۔ایک مرتبہ اہل قلم کانفرنس میں ڈاکٹر انوار سدید نے انشائیے پر مقالہ پڑھا۔ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس پر کئی اعتراضات کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انشائیہ کوئی اہم صنفِ ادب نہیں ہے جس پر قومی سطح کی کانفرنس میں مقالہ پڑھا جائے۔ڈاکٹر انوار سدید کو یہ بات بری لگی۔وہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی زبان سے ان کی غزلیں تک سن سکتے ہیں،لیکن انشائیے کی مخالفت نہیں سن سکتے۔لہذا انہوں نے فراقی کا نام دبستانِ فنون کے اراکین کی فہرست میں لکھ لیا۔اگر چہ تحسین صاحب کا دبستانِ فنون سے کوئی تعلق نہیں لیکن ڈاکٹر انوار سدید کا طریقِ کار یہ ہے کہ جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اسے دبستانِ فنون کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ کراچی اور کھٹمنڈو میں کئی روز ہم کلام وہم طعام رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کی پرانی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔یعنی ایکدوسرے کے بارے میں اچھی رائے قائم کرلی''۔[1]

[1]۔(خامہ بگوش کے قلم سے،مرتب مظفر علی سید،ص 271)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ شمس الرحمٰن فاروقی اور فراقؔ کے درمیان ہوا تھا۔ایک مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی نے فراق گورکھپوری پر مضمون لکھتے ہوئے یہ کہا تھا کہ احمد مشتاق بحیثیت شاعر فراق سے بہتر ہیں فاروقی کی یہ بات شمیم احمد کو بہت ناگوار گذری اور انہوں نے جوابی کارروائی میں صرف فراق کی عظمت کو ہی ثابت نہیں کیا بلکہ شمس الرحمٰن فاروقی کے تعلق سے یہ بھی کہا تھا کہ ان کا شعری ذوق نا قابل اعتبار ہے اس کے ساتھ فاروقی کے پسندیدہ چند شعر درج کر کے ان کے شعری ذوق کے نامعتبر ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔

---

[1]۔ خامہ بگوش کے قلم سے،ص 77

چنانچہ مشفق خواجہ اس معرکے میں شمیم احمد کے پیش کردہ دعویٰ پر شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں چوٹ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے فراق گورکھپوری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں ثابت کیا تھا کہ پاک ٹی وی ہاؤس لاہور والے احمد مشتاق بحیثیت شاعر فراق سے بہتر ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ لاہور کے پاک ٹی وی ہاؤس میں بیٹھنے والے فراق تو کیا میر وغالب سے بھی آگے نکل جاتے ہیں، لیکن شمیم احمد ہماری طرح فراخ دل نہیں ہیں، جو فراق کے ساتھ یہ زیادتی برداشت کر لیتے۔ جوابی کارروائی کے طور پر انہوں نے فراق کی عظمت ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا شعری ذوق نا قابل اعتبار ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

''شمیم احمد نے اپنے ممدوح کے ذوق شعری کے نامعتبر ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں اس قسم کے شعروں کو ادب عالیہ میں شمار کیا ہے۔

چھت پر بگھل کے جم گئی خوابوں کی چاندنی
کمرے کا درد ہانپتے سایوں کو کھا گیا
سمٹی ہوئی چوکھٹ پر ایک دھوپ کی بلی سی
لیموں کی کیاری میں چاندنی کے کئی کنگن
چاروں طرف بریکیں لگیں ہارن بج اٹھے
رستے کی بیچو بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی
چہارسمت غموں کا مہیب صحرا تھا
میں نارزن کی طرح جس کے بیچ رہتا تھا

جدید شاعروں کے یہ شعر ہم نے کئی مرتبہ پڑھے۔ سچی بات یہ ہے کہ فاروقی کی طرح ہمیں بھی یہ بہت پسند آئے۔ خصوصاً آخری دو شعروں کا تو جواب نہیں۔ فراق تو کیا، میر و غالب بھی ایسی حقیقت پسندانہ شاعری کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ غالب کا تو یہ حال تھا کہ وہ خود ہی راستے کے بیچوں بیچ بیٹھ جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ''بیٹھے ہیں رہگور میں ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں۔ اس کے برعکس جدید شاعر نے راستہ کے بیچوں بیچ ایک چیز کو لا بٹھایا کہ ٹریفک ہی جام ہوگیا۔ میر تقی میر کا حال تو غالب سے بھی ابتر تھا۔ فرماتے ہیں:

اس کے گئے سے ایسی گئی دل سے ہم نشیں!
معلوم بھی ہوا نہ کہ عافیت کو کیا ہوا

اس کے برعکس جدید شاعر اس قسم کی بے طاقتی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ ٹارزن کی طرح غموں کا مقابلہ کرتا ہے۔

مذکورہ بالا شعروں کو پسند کرنے کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی کے شعری ذوق کو نامعتبر ٹھہرانا بڑی زیادتی ہوگی۔ ہم شمیم احمد کو مشورہ دیں گے کہ وہ فاروقی کو راہِ راست پر لانے کے بجائے خود اپنے ذوقِ شعری پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہوگا۔ جدید عہد میں رہنا ہے تو شعری ذوق بھی جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ہو جانا چاہئے''۔ [1]

مندرجہ بالا مثال خاصی طویل ہوگئی ہے لیکن دونوں کے درمیان ہوئی چشمک کا ذکر وضاحت اور صراحت کے ساتھ معلوم کرنے کے لیے یہ تفصیلات دینا ضروری تھا ورنہ بات پوری طرح ہمارے سامنے واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ صرف مذکورہ بالا شاعر، ادیب اور ناقدین ان معرکہ آرائیوں میں مشغول ہے بلکہ سنجیدہ ادبی مصروفیات میں مشغول رہنے والے ادیب بھی اس طرح کی معرکہ آرائیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص 5-204

ایسے ہی پاکستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر سلیم اختر ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی ادبی معرکہ آرائی میں مشغول رہتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق وہ اتنی ساری ادبی مصروفیات ہونے کے بعد بھی اپنے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ادبی حریفوں سے مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر کی معرکہ آرائی سے دلچسپی پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لاغر مرادآبادی کے حوالے سے طنز کرتے ہیں مثلاً:

> ''سنجیدہ ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب اپنے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اور ادبی حریفوں کے منہ کا مزہ خراب کرنے کے لیے ادبی معرکہ آرائیوں میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ متنوع علمی و ادبی کاموں میں منہمک رہنے کے باوجود وہ اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں کہ معرکہ آرائیوں کا حق بھی خوش اسلوبی سے ادا ہو جاتا ہے۔ استاد لاغر مرادآبادی یہی مضمون ایک دوسرے انداز سے باندھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر سزاوار ستائش ہیں کہ معرکہ آرائیوں میں مصروف رہنے کے باوجود علمی و ادبی کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔''[1]

مندرجہ بالا مثالوں اور حوالہ کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشفق خواجہ ادب کے بہی خواہ اور ہمارے ادیبوں کے فعل سے نالاں ہیں کہ وہ ادب کو ترقی پر لانے کی بجائے ادبی معرکوں میں زیادہ مصروف ہیں۔ اپنے اعتراضات کو بڑے دلچسپ اور پر لطف انداز میں پیش کرتے ہوئے عصر حاضر کے ان شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کی چشمکوں سے ادب کو ہو رہے نقصانات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خامیوں کو بے نقاب کر کے ان کی اصلاح کی کوشش میں اپنے غم کا اظہار انھوں نے کس دشمنی سے تو نہیں ہمدردی سے کیا ہے۔

ایک مرتبہ منیر نیازی اپنے ایک انٹرویو میں جون ایلیا کے تعلق سے کہا تھا کہ وہ ریختے کے نہیں بلکہ

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 32-33

ریختی کے شاعر ہیں اسی طرح جون ایلیا اپنے ایک انٹرویو میں کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''منیر نیازی غیر سنجیدہ انسان ہی نہیں بلکہ غیر سنجیدہ شاعر بھی ہیں'' ان دونوں کے ادبی معرکے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''ہم دونوں شاعروں کا احترام کرتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو درست سمجھیں اور دوسرے کو غلط قرار دیں احترام کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو حق بجانب سمجھا جائے اور اُن کے فرمودات کو حرف بہ حرف درست تسلیم کیا جائے جون ایلیا اگر ریختی کے شاعر ہیں تو اس میں کیا برائی ہے ہمارے بعض بڑے شاعروں نے ریختی میں طبع آزمائی کر کے اسے ریختہ سے بھی بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔ سعادت یار خاں رنگین اور انشا اللہ خاں انشا کا ریختی کا کلام اُن کے کلام ریختہ سے بدرجہا بہتر ہے۔
>
> منیر نیازی اگر غیر سنجیدہ انسان اور غیر سنجیدہ شاعر ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی شاعری سنجیدہ نہیں ہوتی۔ عروضی خامیاں ان کی شاعری کو سنجیدہ بنا دیتی ہیں یعنی معنوی خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور پڑھنے والا عروضی خامیوں ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے [1]

مذکورہ بالا مثالوں سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے ناقدین، ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ہونے والے معرکوں کو وہ درست نہیں سمجھتے کیوں کہ ان کے نزدیک قدیم زمانے میں بڑے شاعروں کے درمیان ہوئے معرکوں سے ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ جب کہ عصر حاضر کے ادب کو ان معرکوں سے بجائے فائدے کے نقصان ہو رہا ہے اس لیے ان ادبی معرکوں انہوں نے اپنے طنز کا نہ صرف نشانہ بنایا بلکہ ان کی خامیوں کو بے نقاب کر کے اس صورت حال پر غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔

---

[1] سخن در سخن۔ ص 68 :

تنقید اور تنقید نگار

تنقید سے مراد فن پارے کے مصائب ومحاسن کی نشاندہی کر کے اس کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ جو شخص اس فریضہ کو انجام دیتا ہے اسے نقاد یا تنقید نگار کہا جاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جا بجا تنقید اور نقادوں کی خامیوں کو اپنے طنز ومزاح نشانہ بنایا ہے۔ ایک جگہ تنقید لکھنے کے اصولوں پر اظہار کرتے ہوئے تنقید نگار کو تعصّبات سے باز رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید لکھنے کے لیے خالی الذہن ہونا پہلی شرط ہے۔ جو نقاد خالی الذہن ہو کر تنقید نہیں لکھتے۔ وہ عموماً تعصّبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر ترجیح دیتے ہیں، جس سے شاعروں کے باہمی تعلقات ہی نہیں، ان کا مستقبل بھی خراب ہوتا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے مطابق تنقید نگاری کے لیے نقاد کا صاحب علم ہونا بھی بنیادی شرط ہے۔ ایک نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم وفنون کا ماہر ہو۔ ان کے نزدیک نقاد کے لیے اپنے مطالعے میں تازگی اور تسلسل کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن آج کے بیشتر ناقدین میں ذوقِ مطالعہ کی کمی پائی جاتی ہے اور ان کا مطالعہ صرف سرسری نوعیت کا ہو کے رہ گیا ہے اس پر انہیں بے حد افسوس ہے اور اس صورتِ حال پر وہ شمس الرحمٰن فاروقی اور عتیق احمد کے حوالے سے طنز کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پاکستانی نقاد عتیق احمد نے ''جدید ادب: صرف ایک سوال'' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا اور اس میں نظیر کی شاعری کو لے کر عتیق احمد نے یہ رائے دی تھی کہ ''نظیر اکبر آبادی تشکیل معاشرہ اور حیات آفرینی کے فطری بہاؤ کے رخ پر اپنی ساری آرزومندی کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں''۔ اس پر فاروقی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عبارت بھی حسب معمول گنجلک ہے'' اور آگے کہتے ہیں کہ ''ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے نظیر کا کلام نہ پڑھا ہو'' چنانچہ مشفق خواجہ اس واقعہ کے حوالے سے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:219

ہمارے ناقدین کے زیادہ پڑھنے کی عادت کومزاح کاہدف بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فاروقی یہ دور کی کوڑی بھی لائے ہیں کہ عتیق احمد نے جو بات کہی ہے، ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے نظیر کا کلام نہ پڑھا ہو۔ حیرت ہے کہ فاروقی نقاد ہونے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ کسی شاعر کے بارے میں کوئی بات کہنے کے لیے اس کا کلام پڑھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی غیر ضروری شرط عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نقادوں کی ساری زندگی پڑھنے میں گزر جائے گی، لکھنے کی نوبت ہی نہ آئے گی'' [1]

اسی طرح آگے ایک اور جگہ کم پڑھنے والے ناقدین پر بھی ایک ادبی تقریب کے حوالے سے چوٹ کی ہے لکھتے ہیں:

''پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو، کراچی نے ممتاز مفتی کے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ جس میں ان کی شان دار ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے آدم جی انعام اور رائرز گلڈ کے پہلے سیکریٹری جمیل الدین عالی نے انکشاف کیا تھا کہ انعام تو ''علی پور کا ایلی'' کو ملنا تھا لیکن مل گیا ''تلاش بہاراں'' کو۔ چوں کہ خواتین کا احترام ہماری تہذیب میں شامل ہے اس لیے ججوں نے جمیلہ ہاشمی کو انعام کا مستحق قرار دیا۔ عالی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ججوں میں سے شاید کسی نے بھی ''علی پور کا ایلی'' اور تلاش بہاریں'' کو نہیں پڑھا تھا..... عالی صاحب کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ جج صاحبان شاید ہی کوئی کتاب پڑھتے ہوں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ جج عموماً نقادوں کو بنایا جاتا ہے اور نقاد حضرات کو صرف لکھنے کی عادت ہوتی ہے پڑھنے سے طبیبوں نے منع کر رکھا ہے''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ص:155

[2] خامہ بگوش کے قلم سے''۔191۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تنقید اور تخلیق کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک تنقید نگار کے لیے تخلیق کار ہونا ضروری ہے کیونکہ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ وہی شخص تنقید نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے جو خود بھی تخلیق کار ہو اور تخلیق کے کرب اور پر اسرار عمل کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مشفق خواجہ اس نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے نزدیک نقاد ہونے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں اور جو لوگ نقاد کو بالکل پسند نہیں کرتے انہیں وہ غلط مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھے اور برے میں تمیز کے لیے تنقید نگاری ضروری عمل ہے جو کہ ناقدین کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے ادیبوں پر چوٹ کی ہے لکھتے ہیں:

> ''ایک زمانہ تھا نہ نقادوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، لیکن جب سے ہمارے ادیبوں نے سر اور آنکھوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے تب سے نقادوں کی اہمیت کم ہوگی ہے۔ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ نقاد کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، وہ تخلیق کار نہیں ادبی طفیلیہ (Parasite) ہے جس کا وجود تخلیقی ادیبوں کی نگارشات کا مرہونِ منت ہے، وہ بزعم خود ادبی تخلیقات کو پرکھ کر اچھے برے کا فیصلہ کرتا ہے، جب کہ کسی ادبی تخلیقی کو کوئی ایسا شخص پرکھنے کا حق اور صلاحیت نہیں رکھتا جو خود تخلیق کار نہ ہو۔ مطلب یہ کہ جسے غزل کہنے کا یا افسانہ لکھنے کا تجربہ نہ ہو، اسے کیا معلوم غزل کیا ہوتی ہے اور افسانہ کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا غزل کا نقاد وہی ہے جو غزل لکھتا ہے افسانے کو پرکھنے کی صلاحیت اسی میں ہوگی جو افسانہ لکھتا ہے۔

ہم نے جب اس معاملے میں ایک نقاد دوست سے راہ نمائی طلب کی تو انہوں نے اس انتہا پسندانہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا: اگر موجودہ دور کے غزل گو شاعروں اور افسانہ نگاروں میں تنقیدی بصیرت ہوتی اور وہ اچھے برے میں تمیز کرنا جانتے تو آج کے ننانوے فی صد غزل گو اور افسانہ نگار ادب کو

خیر باد کہہ کے کوئی اَبرومندانہ پیشہ اختیار کرتے ۔ہر غزل گو اپنی غزل کو اور ہر
افسانہ نگار اپنے افسانے کو اعلیٰ درجے کی تخلیق سمجھتا ہے۔نتیجہ ہے کہ اعلیٰ وادنیٰ کا
فرق ہی مٹ گیا ہے''۔ [1]

انہوں نے ایسے ناقدوں کی مثالیں بھی پیش کی جو تخلیق کار ہیں اور ان کی تنقید کے مقابلے ان کی تخلیقات کو کم تر بتایا ہے چنانچہ جو لوگ نقاد کو تخلیق کار ہونے پر زور دیتے ہیں ان پر اعتراض کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں اپنے ایک دوست کے حوالے سے کہتے ہیں:

''ہم نے اپنے نقاد دوست سے ایک دوسرے معاملے میں رہنمائی چاہی
اور یہ سوال کیا!'' یہ کہاں تک درست ہے نقاد چونکہ تخلیق کار نہیں ہوتے اس لیے
وہ کسی ادبی تخلیق کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہیں کر سکتے ؟''

انہوں نے فرمایا'' آپ سے کس نے کہہ دیا کہ نقاد تخلیق کار نہیں ہوتے نیاز
فتح پوری مجنون گورکھ پوری، احتشام حسین اور کلیم الدین احمد شاعر بھی تھے۔ان کا
کلام رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔

ہم نے عرض کیا: ''ان نقادوں کی شاعری ہماری نظر سے گزر چکی ہے ۔اس
کے بعد ہی سے ہم ضعفِ بصارت کا شکار ہوئے ہیں ۔نیاز، مجنون اور احتشام
حسین کی شاعری کسی لائق ہوتی تو وہ اپنے مجموعے ضرور چھپواتے۔ انہیں
احساس تھا کہ وہ اچھے شاعر نہیں ہیں البتہ کلیم الدین کا معاملہ اس کے برعکس
ہے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ اچھے شاعر ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے مجموعے
چھپوا دیے ۔نتیجہ یہ نکلا کہ جس بات کا انہیں احساس نہیں تھا دوسروں کو ہو گیا'' [2]

مشفق خواجہ نے ناقدین کی قسمیں بھی بتائی ہیں ان کے مطابق نقاد کئی طرح کے ہوتے ہیں۔مثلاً ایک تو وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے ''ڈبویا مجھ کو ہونے نے'' لیکن یہ اکیلے نہیں ڈوبتے اپنے ساتھ

۱۔خامہ بگوش کے قلم سے ''مرتب'' مظفر علی سید ص:108

۲۔خامہ بگوش کے قلم سے ''مرتب'' مظفر علی سید ص:109

ادب کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ یہ نقاد دوسروں کے صبر کا امتحان لیتے ہیں، خود کسی مشکل (از قسم مطالعہ وغیرہ) میں نہیں پڑتے۔ یہ ''بیکار مباش کچھ کیا کر'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے بقول شخصے، دوسروں کی تحریروں سے تیسروں کے اقتباسات لے کر تنقیدی مقالے تیار کرتے ہیں''۔ اس قسم کی تنقید کو مشفق خواجہ نے اصطلاحاً نقدِ مستعار کہا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے معنی ہیں، ایسی تنقید جو دوسروں سے ادھار لی گئی ہو۔ ''نقد'' کے ساتھ ''ادھار'' کو جو تعلق ہے، اس سے انہوں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ اس قسم کی تنقید کا ادب میں وہی مقام ہوتا ہے جو حسابیات میں بہی کھاتے کا۔ ان کے مطابق بہی کھاتے والے نقاد ترقی کر کے شماریات کے ماہرین بن جاتے ہیں۔ اُن کی تنقید، فہرست سازی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں مقالے کا عنوان ہوگا ''جدید اردو غزل'' غزل تو اس میں کہیں نظر نہیں آئے گی، البتہ غزل گو شاعروں کی لمبی لمبی قطاریں ہر طرف دکھائی دیں گی آگے وہ فہرست سازوں کی خصوصیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کوئی نام چھوٹنے نہ پائے، خواہ معقولیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لیکن معقولیت کا دامن چھوٹنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ دامن کبھی ہاتھ میں رہا ہو۔ ان کے مطابق کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو اپنے عجزِ بیان کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے لکھتے ہیں۔ گویا اظہار، عدم اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر بھی لکھیں، نتیجہ یکساں ہوتا ہے، یعنی بات سر سے گزر جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے نقادوں کا علم چونکہ وسیع اور خیالات نہایت گہرے ہوتے ہیں'' اس لیے اردو زبان اس وسعت اور گہرائی کا ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے۔ ان کے مطابق معترضین اس قسم کے نقادوں کو عجز بیانی کا طعنہ دیتے ہیں، حالاں کہ طعنوں کی مستحق اردو زبان ہے جو چار پانچ سو سال سے مروج ہونے کے باوجود اپنی تنگ دامانی کا علاج نہیں کر سکی۔ ایسے ناقدین پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ہمیں اس قسم کے نقادوں پر رحم آتا ہے کہ علم تو اُن کے پاس بہت سا ہے اور قاری ایک بھی نہیں۔''

نقادوں کی طرح مشفق خواجہ نے تنقید کی بھی مختلف قسموں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جیسے ''تقریباتی

تنقید''، مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ اس طرح کی تنقید کے دائرے میں وہ مضامین اور مقالے آتے ہیں جو کسی کتاب کی تقریب رونمائی یا کسی ادیب کے اعزاز میں منعقد ہونے والی محفل میں پڑھے جاتے ہیں مشفق خواجہ نے تنقید کی ایک اور قسم ''دوستانہ تنقید'' بھی بتائی ہے۔ ان کے مطابق اس تنقید کے نمونے کتابوں کے فلیپوں اور دیباچوں کی صورت میں نظر آتے ہیں ایک اقتباس دیکھیے جس میں مشفق خواجہ دوستانہ تنقید پر سختی سے چوٹ کرتے ہوئے ان پر پابندی لگانے کا مشورہ دیا:

> ''یہ صحیح ہے کہ تقریباتی تنقید نے ہمارے ادب کو ایک مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار کر دیا ہے لیکن اس تنقید کے بارے میں کیا خیال ہے جو دوستوں کی کتابوں پر لکھی جاتی ہے۔ اور جو جلسوں میں تو نہیں پڑھی جاتی لیکن رسالوں میں چھپوا دی جاتی ہے۔ دونوں ڈاکٹروں نے (ڈاکٹر سلیم اختر اور انور سدید) اپنے دوستوں اور ان کے بے شمار کتابوں پر مضامین لکھے ہیں:
>
> ''ان میں سے ایک بھی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں دوستی کا خیال نہ رکھا گیا ہو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تعریف جلسوں میں ہو تو بری، رسالوں میں ہو تو مستحسن۔ اگر تقریباتی یا فرمایشی تنقید کی طرح دوستانہ تنقید پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے نقاد لکھنے سے دست بردار ہو کر شریفانہ مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔[1]

مشفق خواجہ نے اکثر و بیشتر تنقید اور تنقید نگاروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں نقادوں کے وجود سے ہی انکار ہے بلکہ مشفق خواجہ ایک باشعور ادیب کی حیثیت سے اس بات کے قائل ہیں کہ نقاد نہ صرف فن پارے کی تشریح و توضیح کرتا ہے بلکہ فن پارے کے حسن و قبح اور قدر و قیمت کے تعین کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے اور انہیں اس بات سے بھی انکار نہیں ہے کہ ایک نقاد جہاں فن کار کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے وہاں قارئین کے تصور ادب کی اصلاح بھی کرتا ہے مشفق خواجہ کے نزدیک معتدل اور متوازن

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی۔ ص: 130-131

تنقید ہی بلند پایہ ادب کی تخلیق کے لیے معاون اور رہنما ثابت ہوسکتی ہے۔

محقق، تحقیق اور تحقیقی مقالے:

مشفق خواجہ بنیادی طور پر ایک محقق ہیں لیکن انہوں نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے تحقیق اور محقق دونوں کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ دراصل مشفق خواجہ ایسی تنقید کے قائل نہیں ہیں جس میں صرف سنین پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور اس میں سارا وقت صرف کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایسے ہی محققین کو وہ طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تحقیق ایک خشک اور بے مزہ کام ہے۔ ہم سے تو کسی تحقیقی مقالے کے دو صفحے بھی پڑھے نہیں جاسکتے، حیرت ہوتی ہے کہ محقق حضرات پانچ پانچ سو صفحے کی کتابیں کیسے لکھ دیتے ہیں، کسی پرانے شاعر کے دیوان کو پڑھیے تو اس میں دو چار شعر کام کے ضرور مل جائیں گے، لیکن اسی شاعر کے بارے میں کوئی تحقیقی مقالہ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر نے کام کے دو چار شعر کہہ کر اپنا وقت ضائع کیا تھا، کیونکہ وہ تو دنیا میں آیا ہی اس لیے تھا کہ کسی محقق سے اپنا سالِ وفات متعین کرا سکے۔ یہ شاعر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ شعروں میں ہر بات بیان کر دیتے ہیں لیکن اپنا سالِ وفات نہیں بتاتے۔ اتنی ذرا سی بات کو چھپانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محققوں کو ان کے سال ہائے وفات معلوم کرنے میں اپنی عمریں ضائع کرنی پڑتی ہے''[1]

شاعر کی سال وفات کے بعد سال پیدائش اس کے سفر کا حال اور اس کی تعلیم کا ذکر وغیرہ میں وقت برباد کرتا ہے اسی لئے مزاحیہ انداز میں وہ محقق کی خامیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کسی شاعر کا سالِ وفات معلوم کرنا بظاہر سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سادہ سی بات کی تہہ تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے، سب سے پہلے تو محقق کو یہ

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:49

ثابت کرنا پڑتا ہے کہ شاعر کا کوئی سال پیدائش بھی ہے کیوں کہ کسی کا سال پیدائش معلوم نہ ہوتو اس کی پیدائش مشکوک ہوجاتی ہے۔ظاہر ہے جوشخص پیدا ہی نہیں ہوگا اس کا مرنا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا محققین پہلے کسی شاعر کے پیدا ہونے کے شواہد پیش کرتے ہیں اور پھر اسے کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں، یعنی اس کی وفاتِ حسرت آیات کا ذکر کرتے ہیں۔''

پیدائش اور وفات کے درمیان بھی بہت سے واقعات تحقیق طلب ہوتے ہیں، مثلاً شاعر نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی یا تلمیذ الرحمٰن ہونے پر قناعت کی۔ دہلی سے لکھنو تک کا سفر پیادہ کیا یا بیل گاڑی سے؟ بیل گاڑی میں اس کے ساتھ بیلوں کے علاوہ اور کون کون تھا؟ اس نے اپنے کلام پر کس سے اصلاح لی؟ کردار کے سلسلے میں اصلاح کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی؟ الغرض اس قسم کے بے شمار مسائل زیر بحث آتے ہیں۔تب کہیں جا کر متعلقہ شاعر کی شخصیت کے خد وخال نمایاں ہوتے ہیں۔لیکن یہ سب کچھ ایسے سنجیدہ، بے مزہ اور خشک اسلوب میں ہوتا ہے کہ قاری کو شاعر کی وفات سے زیادہ اس کی پیدائش پر افسوس ہوتا ہے''۔[1]

مذکورہ اقتباس مشفق خواجہ کے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب کی بہترین مثال ہے اس اقتباس میں مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ کس طرح غیر ضروری تحقیق بے مزہ کے ساتھ ساتھ خشک ہوجاتی ہے۔

تحقیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی نئی اور اہم بات دریافت کی جائے لیکن کبھی کبھی ہمارے محقق کوئی خاص چیز کی دریافت میں غیر ضروری تحقیق کرتے ہیں جس سے قاری کی دلچسپی تحقیقی مقالوں سے کم ہونے لگتی ہے ایسے ہی محققوں پر انھوں نے چوٹ کی ہے، لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:49, 50

''تحقیق صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو زندگی سے بیزار ہوتے ہیں یا جنھیں مزید تحقیق کرنی ہوتی ہے۔ ''مزید تحقیق'' سے مراد یہ ہے کہ جب ایک محقق کسی شاعر کی وفات کا سنہ دریافت کرتا ہے تو دوسرا مہینہ بتاتا ہے۔ تیسرا اِس کا کھوج لگاتا ہے کہ اس مہینے کی کس تاریخ کو یہ سانحہ گزرا تھا۔ چوتھا محقق یہ راز فاش کرتا ہے کہ شاعر کا انتقال کتنے بج کر کتنے منٹ پر ہوا تھا۔ پانچواں محقق پہلے چار محققوں کی تحقیق کو غلط ثابت کر کے ازسرِ نو تحقیق کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا تحقیق ایک ایسا کام ہے جو ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا''۔[1]

آج کی تحقیق کے معیار سے مشفق خواجہ مطمئن نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے محققوں پر مزاح کے پردے میں چوٹ کی ہے۔ جو معیاری شاعری پر تحقیق کرنے کی بجائے غیر معقول کتابوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ہم نے اکثر دوست شاعروں سے یہ کہا ہے کہ اگر آج اُن کی قدر نہیں ہو رہی تو انہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے، آئندہ زمانے کے محقق اُن کے دیوانوں کی گرد جھاڑنے کا فریضہ ضرور انجام دیں گے۔ اسی ضمن میں ہم نے ایک مرتبہ یہ بھی عرض کیا تھا کہ ایک فی صد شاعر آنے والی نسلوں کے لیے شعر کہتے ہیں، باقی ننانوے فی صد آنے والے محققوں کے لیے۔ یہ ننانوے فی صد شاعر اگر نہ ہوں تو محقق ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں''۔[2]

ایسی تحقیق جس سے ادب کو کوئی فائدہ نہ ہو اسے وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی محققین کی خامیوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے وہ مزاحیہ انداز میں ان کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص: 50

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ۔ص: 148

''بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں محقق عموماً وہی ہوتے ہیں جن کے پاس علم ہو نہ ہو، وقت خاصا ہوتا ہے۔ یہ لوگ کرم خوردہ، آب رسیدہ، دریدہ، بوسیدہ، اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ کتابوں اور اذکارِ رفتہ پرانے شاعروں کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرنے میں عمریں بسر کر دیتے ہیں، جن سے ادب کو تو کیا، خود محقق حضرات کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ اُلٹا نقصان ہی پہنچتا ہے کہ پہلے نظر ، پھر سماعت اور آخر میں مجموعی صحت خراب ہو جاتی ہے اور جب ان محققوں کے نتائج تحقیق سامنے آتے ہیں تو ان سے استفادہ کرنے والوں کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔''[1]

ایسے ہی محققین کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے وہ گمشدہ مصنفین کی تلاش کرنے والے محققین پر طنز کیا ہے۔

''بعض لوگ تحقیق سے بلاوجہ تعصب برتتے ہیں حالانکہ یہ ایک مفید کام ہے، اہل تحقیق کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ وہ گم شدہ کتابوں ہی کو نہیں، گم شدہ مصنفین کو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ گم شدہ بچوں کی تلاش کا کام جو لوگ کرتے ہیں، معاشرہ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گم شدگانِ ادب کو تلاش کرنے والے بھی عزت کے مستحق ہیں جب کسی پرانے گم شدہ شاعر پر کوئی کتاب نظر آتی ہے تو ہم اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں''۔ [2]

مشفق خواجہ نے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کی خراب صورت حال کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے ان کے مطابق یہ مقالات عام طور پر ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں یہ مقالات ابواب کی بے ترتیبی اور تحریر کی بے ربطی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں جو سندی تحقیق ایک خامی ہے وہ کہتے ہیں:

''یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اردو ادب کی عزت افزائی کا سبب غزل کو شعرا ہیں

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔78

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:133

یا وہ مقالہ نگار جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔غزلوں کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ کیا کہا جا رہا ہے،اور کیوں کہا جا رہا ہے، پی ایچ ڈی کے مقالے دیکھیے تو گمان گذرتا ہے جیسے غزلیں کہی جا رہی ہیں جس طرح غزل کے ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اُسی طرح اِن مقالوں کے ایک باب کا دوسرے باب سے تو کیا، ایک صفحہ کا دوسرے صفحے سے بھی کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔''[1]

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں زندہ ادیبوں پر تحقیقی مقالے لکھوانے کا رجحان عام ہوا ہے کیونکہ اس میں اہل تحقیق کے لیے سہل طلبی اور تن آسانی کی راہیں کھلتی ہیں۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ بعض اوقات زندہ ادیبوں پر اس لیے تحقیق کی جاتی ہے کہ ہر ممکن مدد ہو سکتی ہے۔ایسے ہی محققین پر دوسروں کے حوالے سے وہ اپنی بات رکھتے ہوئے طنز کرتے ہیں:

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے جو آداب تحقیق کے منافی ہے۔ تحقیق صرف اُن پر ہونی چاہیے جو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔مرحومین پر تحقیق کرنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ کوئی مرحوم ادیب کسی محقق کو اپنے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتا جب کہ زندہ ادیب ہر ممکن مدد کر سکتا ہے، یہاں تک کہ محقق کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے تحقیقی مقالہ بھی لکھ کر دے سکتا ہے''۔ [2]

کالم نگاری

دورِ حاضر میں کالم کی صنف نے بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔اس کی ایک وجہ تو اس صنف کا مزاج ہے جو بے تکلفی سے عبارت ہے اس کے علاوہ اس کے مطالعہ سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ

---

[1] سخن در سخن، ص:115۔

[2] سخن در سخن، ص 96

ہر طرح کے موضوعات کو اپنے اندر سمیٹنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔عصر حاضر میں علمی وادبی، سیاسی وسماجی، معاشی ومعاشرتی غرض ہر میدان میں کالم نویسی ہورہی ہے۔مشفق خواجہ نے جہاں ادب کی دیگر اصناف کے تعلق سے اپنے کالموں میں رائے دی ہے اسی طرح کالم نویسی کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے ان کے مطابق کالم نگاری ایک جان جوکھوں کا کام ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''کالم نگاری جان جوکھوں کا کام ہے، لکھنے والے کے لیے بھی اور پڑھنے والے کے لیے بھی، کیوں کہ بیشتر لکھنے والے پڑھنے والوں کے صبر کا امتحان لیتے ہیں۔''[1]

کالم نویسی مشفق خواجہ کے نزدیک جان جوکھوں کے کام ہی نہیں بلکہ نہایت مشکل کام ہے کیوں کہ ان کے مطابق اردو ادب کی دوسری اصناف کے مقابلہ میں یہ خاصی مشکل چیز ہے اور اس پر خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔بہت پڑھنا پڑتا ہے اور اس پر غور وفکر کرنا پڑتا ہے پھر جا کر کچھ لکھا جاتا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''کالم لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔یہ کوئی ناول، افسانہ، نظم، غزل انشائیہ اور تنقید قسم کی چیز تو ہے نہیں کہ بے تکان اور بلا سبب لکھتے چلے گئے۔اس کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی ہے، بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور پھر اس پر سوچنا پڑتا ہے۔ تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت''۔[2]

ادیبوں کی سیر وسیاحت

ادیبوں کی سیر وسیاحت بھی ہمارے ادبی کلچر کا ایک حصہ بن گیا ہے ادیب ادب کے حوالے سے مختلف ممالک کی سیر وسیاحت کرتے ہیں اور اپنے سفر کے تجربات ومشاہدات، کسی نا کسی شکل میں قاری تک پہنچاتے ہیں ہندوستان اور پاکستان کے ادیب اکثر ادب کے حوالے سے ایک دوسرے کے ملک آتے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ۔109

[2] سخن ہائے گسترانہ،ص:268

جاتے ہیں مشفق خواجہ کے مطابق پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں کے لیے ادب سیر وسیاحت کا ایک وسیلہ بن گیا ہے اور جن ادیبوں کو اپنے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا وہ دوسرے ملک جا کر اپنے آپ کو ''مشاہیر'' میں شمار کراتے ہیں چنانچہ ادیبوں کی اس طرح کی سرگرمیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے مشفق خواجہ نے ادب کے مقصد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، کہتے ہیں:

''ہندوستان سے ہمارے سیاسی تعلقات کیسے ہی ہوں ادبی مراسم نہایت خوشگوار ہیں۔ یہاں کے ادیب وہاں اور وہاں کے ادیب یہاں کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔اس وجہ سے ادب، ادب نہیں رہا سیر وسیاحت کا وسیلہ بن گیا ہے۔اس صورت حال سے بہت سے جعلی ادیبوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے، جنہیں اپنے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا، وہ دوسرے ملک میں جا کر مشاہیر میں اپنا شمار کراتے ہیں۔ وہاں ریڈیو کی اردو سروس میں خارج از آہنگ انٹرویو دیتے ہیں، یہاں مشاعروں میں خارج از وزن و معنی شعر سنا کر سامعین کا مذاق اور اپنا گلہ خراب کرتے ہیں۔بعض ''مشاہیر'' سفرنامے بھی لکھتے ہیں جنہیں لکھنے کے لیے ارادے کی اور پڑھنے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے'' [1]

ایسے ادیب جو پاکستان سے ہندوستان جاتے ہیں ان کی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے ان پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج کل پاکستان اور ہندوستان کے ادبی تعلقات خاصے خوش گوار ہو رہے ہیں۔ عام پاکستانی روزگار کے لیے دوبئی وغیرہ جاتے ہیں لیکن غم روزگار سے بے نیاز ہو کر ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔اور وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے اور انہیں خوب بانس پر چڑھایا جاتا ہے اور پھر اسی حالت میں اُن کے ادبی قد وقامت کی پیمائش کی جاتی ہے۔ گویا جن ادیبوں کو خود اُن کے ملک میں کوئی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:228

نہیں پوچھتا اُن کے پوچھنے والے بلکہ آنسو پونچھنے والے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں'' [1]

ایک اور جگہ ایسے ادیبوں پر چوٹ کی ہے جو ہندوستان سے پاکستان آتے ہیں ان کی ادبی سرگرمیوں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قسمیں بتائی ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان سے آنے والے ادیب کئی طرح کے ہوتے ہیں۔کچھ تو وہ ہیں جنہیں تفریحی مقاصد کے لیے بلایا جاتا ہے۔وہ ''اسی مے خانے کی مٹی اسی مے خانے میں'' کے مصداق مشاعروں میں صرف یا خرچ ہو جاتے ہیں۔کچھ وہ ہیں جو ''تبادلے'' کی اسکیم کے تحت تشریف لاتے ہیں۔جس طرح بعض ممالک میں قیدیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔اسی طرح پاک وہند کے درمیان غیر سرکاری سطح پر ادیبوں کا تبادلہ ہوتا۔وہ یوں کہ کچھ پاکستانی ادیب اپنے وسائل یا اثرات سے کچھ ایسے ہندوستان ادیبوں کو ادبی جلسوں میں مدعو کرتے ہیں جو اپنے ملک میں با وسیلہ اور با اثر ہوتے ہیں۔پھر وہ جوابی کاروائی کے طور پر اپنے پاکستانی دوستوں کو ہندوستان بلا کر حساب برابر کر دیتے ہیں'' [2]

ادبی انعامات

ہماری ادبی دنیا میں ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف علمی وادبی اداروں نے مختلف قسم کے انعامات رکھے ہیں اور یہ انعامات ان کی مناسب اور معتبر تصانیف پر دیئے جاتے ہیں،لیکن کبھار تقسیم انعام سے ادیبوں کو شکایت بھی ہوتی ہے اسی طرح جمیلہ ہاشمی کو بھی ممتاز مفتی کو دیئے گئے انعام پر شکایت ہوئی تھی مشفق خواجہ نے اس واقعہ کے حوالے سے تقسیم انعام کے اس مسئلہ پر مزاحیہ انداز میں چوٹ کی ہے:

''محترمہ جمیلہ ہاشمی نے بتایا کہ اس مرتبہ ان کا ناول ''دشتِ سوس'' اور ممتاز

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:298

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:228

مفتی کا سفر نامہ ''لبیک'' دونوں انعامی مقابلے میں شامل تھے انعام ''لبیک'' کو مل گیا محترمہ فرماتی ہیں: ''میں اس کا مطلب کیا لوں؟ اس سوال میں جواب بھی موجود ہے یعنی یہ ہے کہ مفتی صاحب کو انعام از رہ ترحم ملا ہے۔ محترمہ کی خدمت میں عرض ہے کہ انعام دینے والے انعام ہی دے سکتے ہیں جرمانہ تو نہیں کر سکتے۔

جرمانے کے ذکر پر ہمیں استاد لاغر مرادی کا ایک قول برحق یاد آ گیا فرماتے ہیں: یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے انہیں اب انعامات ملتے ہیں''۔[1]

ایک اور جگہ اپنے مزاحیہ کردار سے ہم کلامی کرتے ہوئے انعامات کے لین دین پر اعتراض کیا ہے اور ایسے ہی اشخاص کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ہم: اچھا اب یہ بتائیے کہ ادبی انعامات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وہ: جن کو انعام نہیں ملتا، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ الزام بڑی حد تک درست ہے، کیونکہ بعض ایسی کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں، جو جرمانے کی مستحق تھیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک سال جو شخص جج ہوتا ہے، دوسرے سال وہی امیدوار بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے انعامات میں'' لین دین'' کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو چکا ہے''۔[2]

غالب شناسی

اردو شاعری کی تاریخ میں مرزا غالبؔ کی شاعری اور عظمت تسلیم شدہ ہے۔ مشفق خواجہ کے پسندیدہ شاعر بھی غالب ہیں۔ غالب کی شاعری پر ہر دور میں لکھا گیا ہے اور آج بھی ان کے پرستاروں کی کمی نہیں

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:191

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:174

ہے جوانھیں موضوع بنانا پسند نہ کرے۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے اس غالبؔ شناسوں کو اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے اور بتایا ہے کہ ماہرین غالبیات نے غالب کے ساتھ جو سلوک کیا ہے ان پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے شاعری نہیں کی، کوئی جرم کیا تھا، جس کی سزا انہیں مسلسل مل رہی ہے۔ نقادوں، محققوں، شارحوں اور فلم سازوں نے غالبؔ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جرم کے مقابلے پر سزا کا تناسب کچھ زیادہ ہوگیا ہے، ہر نقاد تنقید میں ہاتھ صاف کرنے کے لیے غالبؔ کو تختۂ مشق بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غالبؔ کی فکر سے لے کر بے فکری تک ہر موضوع پر ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں، جن کے سامنے غالبؔ کے نامۂ اعمال کی سیاہی بھی ماند پڑتی نظر آتی ہے۔ محققوں کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں، اس لیے انہوں نے غالب تو غالب، غالب کے اہلِ محلّہ پر بھی تحقیقی مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اس طرح حاصل کی ہیں جس طرح لوگ رائٹرز گلد اور اکادمی ادبیات کے انعام حاصل کرتے ہیں شارحوں نے غالبؔ کے شعروں میں وہ معنی تلاش کیے ہیں جن کا خود غالبؔ کو بھی علم نہیں تھا۔ یہ شرحیں اگر غالبؔ کی زندگی میں چھپ جاتیں تو وہ خودکشی کر لیتے، یہ اچھا ہی ہوا کہ غالبؔ نے خودکشی نہ کی، ورنہ ان کی خودکشی کے اسباب پر بھی تین چار درجن کتابیں لکھ کر اتنے ہی محقق ماہرین غالبیات کی صف میں کھڑے ہو جاتے۔ فلم سازوں نے بھی غالبؔ کے ساتھ جو مثالی سلوک کیا ہے۔ اسے بعد از وفات قاتلانہ حملے کا نام دیا جا سکتا ہے''۔[1]

مشفق خواجہ کے مطابق اکثر ماہرین غالبیات کا یہ حال کہ جسے لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا وہ غالب پر طبع آزمائی کر کے اپنی سخن فہمی کا ثبوت دیتے ہیں چنانچہ ایسے ہی محققین کا وہ بڑے دلچسپ انداز

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص 352

میں مذاق اڑاتے ہیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے نقادوں اور محققوں کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ کر دے دیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھو نہ سمجھو، اس پر لکھو ضرور۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا، وہ غالب پر طبع آزمائی کر کے اپنی سخن فہمی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑتا ہے۔ اِسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ محققوں اور نقادوں کی کوششوں سے غالب کو اُس کے گناہوں کی سزا اِسی دنیا میں مل گئی۔ اب اُس کا داخلِ جنت ہونا یقینی ہے۔ غالب کو جنت میں جانے کے یوں تو بے شمار فائدے ہوں گے، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محققوں اور نقادوں سے جان چھوٹ جائے گی''۔[1]

مشفق خواجہ نے آفتاب احمد خان نامی پاکستانی کے دو غالب شناسوں کے حوالے سے یہ بتایا کہ غالب کا کلام انھیں ازبر ہے اور ان کو غالب کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا بھی کہا جاتا ہے ان میں سے ایک آفتاب احمد صاحب جن کا تعلق کئی سرکاری عہدوں سے رہا ہے ان کی غالب شناسی کو مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آفتاب صاحب بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ سنا ہے کہ سرکاری فائلوں اور میٹنگوں میں وہ غالب کے شعروں سے بہت کام لیتے تھے۔ سرکاری اہل کار غالب کے شعروں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آفتاب صاحب کی آراء سے عموماً اتفاق کر لیتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں دہلی میں انتظامی اصلاحات کے بارے میں جو سارک کانفرنس ہوئی تھی، اُس میں پاکستانی وفد کی قیادت آفتاب صاحب نے ہی کی تھی۔ کانفرنس میں اُنہوں نے اپنی تقریر میں غالب کے شعر اس کثرت سے استعمال کیے تھے کہ اہل کانفرنس غالب کو کوئی ایسا مفکر سمجھے جو انتظامی مسائل پر درجہ استناد رکھتا ہے''۔[2]

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی

[2] سخن ہائے ناگفتنی، ص: 45۔

آفتاب احمد خاں کی غالب شناسی کی طرح ہندوستان کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر خلیق انجم کی غالب شناسی کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''غالب سے اُن کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے دہلی والوں نے غالب کے مزار کی دیکھ بھال کا کام اُنہیں کے سپرد کر دیا ہے۔ اردو کے عام محقق قبریں کھودتے اور مردے خراب کرتے ہیں، خلیق انجم پہلے محقق ہیں، جو ایک قبر کی دیکھ بھال کرتے اور مردے کو حتی الامکان آرام پہنچاتے ہیں۔ یعنی مزار کی چابی اپنے پاس رکھتے ہیں اور سخن ناشناسوں کو مزار کے قریب نہیں جانے دیتے اِسی لیے وہ خود بھی کبھی کبھار ہی وہاں جاتے ہیں''۔[1]

اقبال شناسی

غالب کی طرح اقبال بھی اردو کے ایک عظیم شاعر گذرے ہیں اور ان کی ازدواجی اور ادبی زندگی پر بے شمار ادیبوں نے ضخیم ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور آج بھی اُن کے کسی نہ کسی گوشہ پر تحقیق جاری ہے، چنانچہ ایک جگہ ماہرین اقبالیات پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے لکھا ہے:

''اب تک علامہ اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا وزن بلا مبالغہ کئی ہزار من ہوگا اور اگر اس میں لکھنے والوں کی غلطیوں اور غلط کاریوں کا وزن بھی شامل کر لیا جائے تو صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو جاتی ہے''۔[2]

محققین اقبالیات کی یہ صورتِ حال ہے کہ انھوں نے اقبال کی زندگی سے جڑے ہر واقعہ کو موضوع بنایا ہے چاہے وہ معقول ہو یا غیر معقول بس اس موضوع پر طبع آزمائی کر کے اقبال شناسوں نے ماہرین اقبالیات ہونے کا ثبوت دیا ہے چنانچہ ایک اقتباس دیکھئے جس میں مشفق خواجہ نے ماہرین اقبالیات کے اس فعل پر طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی۔ ص:86۔

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:298۔

''یہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا جب ''اقبال اور بھوپال اور اقبال اور حیدرآباد'' جیسی کتابوں کی شہرت ہوئی تو ایک صاحب نے ''اقبال'' اور ٹنڈ و آدم کے موضوع پر کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ جب ان صاحب سے یہ کہا گیا کہ علامہ اقبال تو کبھی ٹنڈ و آدم گئے ہی نہیں تھے تو پھر آپ اس موضوع پر کتاب کیسے لکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا:

''میں اپنی مجوزہ کتاب میں یہی تو ثابت کروں گا کہ علامہ اقبال کبھی ٹنڈ و آدم گئے ہی نہیں تھے'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق ہمارے ادیبوں نے اقبال پر مضمون یا کتاب لکھنے کے کچھ آسان طریقے ایجاد کر لیے ہیں جس میں بغیر کسی زحمت کے اور بغیر سوچے سمجھے اقبال کے متعلق طویل سے طویل مضامین آسانی سے لکھے جا رہے ہیں۔ انھیں اس طریقہ کار پر افسوس ہے اسی لیے وہ ایسے اقبال شناسوں پر اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اقبال پر مضمون لکھنے اور کتاب بنانے کے ایسے سانچے ایجاد ہو گئے ہیں کہ بغیر کسی زحمت کے حتیٰ کہ سوچے سمجھے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ ایک طرف سے ان سانچوں میں علامہ اقبال کے شعر ڈالے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے مطلوبہ ضخامت کا مضمون یا کتب برآمد ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو اقبال اور شاہین کے موضوع پر مضمون لکھنا ہے تو کلیاتِ اقبال کا اشاریہ دیکھ کر ان تمام شعروں کو یکجا کر لیجیے، جن میں شاہین کا ذکر آیا ہے۔ شعروں کے درمیان نثر کے ایک ایک دو دو جملے (جو اقبال ہی کے شعروں کا سلیس اردو میں ترجمہ ہوں) درج کرتے چلے جایئے مضمون تیار ہو جائے گا۔ اگر مضمون کو طویل کرنا مقصود ہو تو شاہین غازی پوری، شاہین مفتی اور امیر اللہ شاہین جیسے شاعروں کی غزلوں کے مقطع بھی مضمون میں شامل کر لیجیے، جب یہ شعرا علامہ اقبال کے شاہین سے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص: 299۔

تخلص مستعار لے سکتے ہیں تو علامہ کے شاہین کو بھی حق حاصل ہے کہ ان کے
مقطوں کو کنجشک فرومایہ سمجھ کر ان پر ہاتھ صاف کرے''[1]

مشفق خواجہ کے مطابق اقبال کے تعلق سے کچھ مضامین اور کتابیں بھی ایسی چھپتی رہتی ہیں جو معیاری نہیں ہوتی۔ان کا کہنا ہے کہ ایسی کتابوں سے یقیناً لکھنے والوں کو شہرت ملتی ہے لیکن اس سے اقبال کو یا پھر ان کے چاہنے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ایسے ہی اقبال شناسوں پر معترض ہو کر مزاحیہ انداز میں وہ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کا انتقال تو ایک ہی مرتبہ ۲۱/اپریل کو ہوا تھا۔مگر ان کے ہم
جیسے عقیدت مندوں کو ہر سال کئی کئی مرتبہ اس مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ سانحہ
بار بار اس لیے پیش آتا ہے کہ سارا سال علامہ کے بارے میں ایسے ایسے
مضامین اور کتابیں چھپتی رہتی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ آخر علامہ سے
ایسی کون سی غلطی ہوگئی تھی، جس کی انہیں سزا مل رہی ہے۔ان مضامین اور
کتابوں سے مانا کہ لکھنے والوں کو شہرت ملتی ہے، لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ علامہ
کی شہرت اور ان کے عقیدت مندوں کی صحت خراب ہو رہی ہے۔''[2]

جوش شناسی

غالب اور اقبال شناسوں کے بعد مشفق خواجہ جوش شناسوں پر اعتراضات کئے ہیں۔مشفق خواجہ کے مطابق جوش پر لکھنے والے ناقدین نے صرف دو ہی باتوں کو دہرایا ہے وہ یہ کہ وہ ''شاعر انقلاب تھے اور بڑے قادر الکلام تھے چنانچہ ایسے جوش شناس ناقدین کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے وہ ان پر سوال قائم کرتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''جوش ملیح آبادی کی وفات کے بعد گذشتہ بارہ تیرہ برسوں میں ان کے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:298۔
[2] سخن ہائے گسترانہ ''مرتب'' ڈاکٹر انوار سدید فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی۔ص:298۔

بارے میں بے شمار مقالات اور رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سارے انبار میں ان کی شاعری کے متعلق کوئی فکر انگیز تحریر نظر نہیں آتی۔ بیسیوں نقادوں نے ان کی شاعری پر طبع آزمائی کر کے صرف ان دو باتوں کو دہرایا ہے کہ وہ شاعر انقلاب تھے اور بڑے قادر الکلام تھے۔ حالانکہ ان خصوصیات کے جاننے کے لیے کسی نقاد کی رہ نمائی کی ضرورت نہیں ہے، یہ خصوصیات ہر اس شخص پر خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں جو جوش کے کسی بھی مجموعہ کلام کے چار صفحے پڑھنے کی توفیق رکھتا ہو۔ اگر ہمارے نقادوں کی جوش شناسی یہی ہے تو جوش ناشناسی کسے کہا جائے گا؟''[1]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ جوش کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے تعلق سے بھی بہت لکھا گیا ہے اور ان کی شخصیت کچھ ایسے پہلوؤں کا بھی انکشاف کیا گیا ہے۔ جن کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ایسے ہی جوش شناسوں پر جنھوں نے ان کی شاعری سے زیادہ ان کی حیات پر زور دیا ہے ان پر اعتراض اور طنزیہ لہجے میں ان کی جوش شناسی پر چوٹ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''جوش کی شاعری کے برعکس اُن کی شخصیت کے بارے میں لکھنے والوں نے زیادہ بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے اور مضامین نو کے ایسے ایسے انبار لگا ئے ہیں کہ اگر جوش زندہ ہوتے تو انہیں اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی جس کے نتیجے میں اس کتاب میں بیان کردہ بہت سے وقوع پذیر نہ ہونے والے واقعات خارج ہو جاتے اور بہت سے ایسے واقعات شامل کیے جاتے جنھیں کتاب لکھتے وقت مصنف نے نظر انداز کر دیا تھا''۔[2]

---

[1] [2] سخن ہائے ناگفتنی۔ص:176

اردو کتابوں کی صورتِ حال

مشفق خواجہ کے ادبی موضوعات میں ایک اہم موضوع اردو کتابوں کی موجودہ صورتحال بھی ہے۔ انہوں نے جابجا اپنے کالموں میں اردو کتابوں کی خستہ حالی اور ان کے معیار کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق آج کل جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ بالکل مبہم سی ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ ان کے لکھے جانے کا سبب کیا ہے اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو یہ راز نہیں کھلتا کہ آخر ہم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے، جس کی سزا کے طور پر یہ کتابیں ہمیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ آگے ایک نقاد کے حوالے سے ان غیر معیاری ادبی کتابوں پر خوب طنز کیا ہے کہتے ہیں:

> ''پچھلے دنوں ایک مشہور نقاد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''میں نے پانچ برس تک ایک انگریزی اخبار میں اردو کتابوں پر تبصرے لکھے، اس سارے عرصے میں ایک بھی ڈھنگ کی کتاب پڑھنے کو نہ ملی، افسوس کہ میرے پانچ سال ضائع ہوگئے'' ہم نے عرض کیا: ''آپ کو اپنے پانچ برسوں کے ضائع ہونے کا ملال ہے جب کہ ہمارے مصنفین اپنی پوری پوری زندگیاں ضائع کر دیتے ہیں پھر بھی خوش رہتے ہیں''۔ جناب نقاد نے فرمایا۔ وہ اس لیے خوش رہتے ہیں کہ وہ کتابیں لکھتے ہیں اور میرے ملال کا سبب یہ ہے کہ میں انہیں پڑھتا ہوں''۔[1]

مشفق خواجہ کے خیال میں آج کل بعض کتابیں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور ایسی کتابیں صرف الماریوں کی زینت ہوتی ہیں اور پڑھی نہیں جاتی چنانچہ وہ قاسمی صاحب کے حوالہ سے ان کے خیالات کو درست مانتے ہوئے بعض نئی کتابوں کو بھی دیمک زدہ اور کرم خوردہ کہا ہے جو تحقیق کا موضوع بن سکتی ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ۔ص:93

''قاسمی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے، اگر کسی کتاب کو دیمک لگ جائے تو اس کا قدیم ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔بات بالکل درست ہے،اس پر ہم یہ اضافہ کریں گے کہ جہاں تک کسی کتاب کو دیمک لگنے کا تعلق ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ پرانی کتاب ہی ہو، آج کل بعض نئی کتابیں بھی موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ''دیمک زدہ'' اور کرم خوردہ ہوتی ہیں اور تحقیق کا موضوع بن سکتی ہیں'' [1]

اسی طرح آگے ایک جگہ مشفق خواجہ معیاری اور غیر معیاری کتابوں پر تبصرہ کیا ہے۔ان کے مطابق آدمیوں کی کتابیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں یعنی اچھی اور بری ہوتی ہیں جن کے باطن اور ظاہر میں فرق ہوتا ہے چنانچہ کتابوں کا آدمی کی خصوصیات سے موازانہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آدمیوں کی طرح کتابوں کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔بعض کتابوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔سرورق ایسا کہ نظر نہیں جمتی، کتابت ایسی کے جیسے پروین رقم نے موتی چن دیے ہوں، طباعت ایسی کہ سیاہی سے روشنی پھوٹی جاتی ہے۔کاغذ ایسا جو کرنسی نوٹوں کے کاغذ بھی شرمائیے لیکن مطلب پر نظر ڈالیے تو پہلوے حور میں لنگور والی بات یاد آتی ہے بعض کتابیں اس کے برعکس ہوتی ہیں۔سرورق ایسا جیسا اکیڈیمی لیٹرز کے خبرنامے کا ہوتا ہے۔کتابت ایسی جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔طباعت ایسے جیسے ریلوے کے ٹکٹوں کی ہوتی ہے، کاغذ وسیاہی کھردار اور زردی مائل، جس پر ڈاک خانے کی رسیدیں چھپتی ہیں، لیکن کتاب کے مطالب پر نظر ڈالیے تو ذہن روشن ہوجاتا ہے'' [2]

مشفق خواجہ کو ادبی کتابوں سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں نثری اور شعری تصانیف کی پہچان ان کے خط سے ہورہی ہے نہ کہ معنی وہ مطالب سے۔اس کے علاوہ ان کے ظاہری خصوصیات بھی ایک جیسی ہوتی ہے اس لئے وہ اس امر پر طنز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:99

[2] سخن ہائے گسترانہ،ص:217

''نثر اور نظم میں الگ الگ کتابیں لکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قارئین کسی کوشش کے بغیر جان سکتے ہیں کہ کون سی کتاب نثر میں ہے اور کونسی نظم میں۔ کیونکہ نثر کی کتاب باریک خط میں ہوتی ہے۔اور نظم کی جلی خط میں۔موجودہ زمانے میں نثر اور نظم میں خط ہی کا فرق رہ گیا ہے خط کے اندر جو کچھ ہوتا ہے۔ یکساں ہوتا ہے۔یعنی واقعہ وبیان اور مطالب کے اسقام۔نیز دور افتادہ خوبیاں بھی ایک ہی جیسی ہوتی ہیں''۔[1]

مشفق خواجہ نے ''انتخاب کلام'' کے مروجہ طریقے کار کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے، لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں کسی شاعر کا انتخاب مرتب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوران مطالعہ پسندیدہ اور مشہور شعروں کو نشان زد کر دیا جاتا ہے''۔ص:۲

مشفق خواجہ کے مطابق موجودہ دور کی کتابوں کی صورتحال مختلف ہوگئی۔کتابیں لکھنے کا کام آج کل آسان ہوگیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ادیب بن جاتے ہیں جب کہ قاری ان کتابوں سے مطمئن نہیں ہوتے اس صورتحال پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہوگیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے۔''[3]

ادبی کتابوں کی اشاعت

مشفق خواجہ نے ادبی کتابوں کی زیادہ تعداد میں اشاعت کو بھی طنز کا ہدف بنایا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ آج کل شعراء اس قدر زود نویسی سے کام لے رہے ہیں کہ ایک بعد دیگر مجموعہ کلام کی قطار لگا رہے ہیں

---

[1] سخن در سخن۔ ص:177

[2] سخن در سخن۔ص:130 [3] سخن در سخن،ص39

۔ان کے مطابق ''آج کل یہی ہوتا ہے کہ ایک مجموعہ کلام کی سیاہی خشک نہیں ہوتی اور دوسرا شائع ہوجاتا ہے''۔چوں کہ شعراء کو بہت جلد شہرت مل جاتی ہے اس لیے ہر کوئی شاعر بننا چاہتا ہے۔اسی چکر میں لوگ جلد از جلد اپنا دیوان چھپانا چاہتے ہیں۔جس کی وجہ سے معیاری کتابیں سامنے نہیں آپارہی ہیں۔یہی وجہ ہے مشفق خواجہ اس صورتحال سے بیزار ہوکر ایسے شاعروں پر طنز کرتے ہیں:

> ''تیسری دنیا کے بعد ممالک میں اتنی آسانی سے تو مارشل لا بھی نہیں لگتا جتنی آسانی سے ہمارے ملک میں ہر تیسرا آدمی صاحبِ دیوان بن جاتا ہے اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اچھے خاصے مقبول لوگ بھی شاعری کرنے اور دیوان چھپوانے کی فکر میں ہیں۔شاعری کوئی زیادہ بری چیز نہیں ہے لیکن ''جن کا کام اسی کو ساجھے'' والا اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔[1]

شعراء کے اس کثرت سے مجموعے شائع ہونے پر ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک مضمون ''مجھے شعری مجموعوں سے بچاؤ'' میں یہ شکایت کی تھی کہ انھیں شاعر حضرات بہت پریشان کرتے ہیں۔ ہر کوئی اپنا شعری مجموعہ لا کر ان سے یہ کہتا ہے کہ اس پر آپ اپنی رائے دیں اور گیان چند جین نے یہ بھی کہا تھا کہ کثرت سے مجموعے شائع ہونے کی ایک وجہ اکادمیوں کی مالی امداد بھی ہے۔مشفق خواجہ گیان چند کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی یہی صورتحال ہے۔یہاں تجارتی ادارے اپنے اشتہارات کے لیے ان شعری مجموعوں کی اشاعت کے لیے مدد کرتے ہیں اور اکثری شعری مجموعے تو صرف انہیں اشتہارات کے لیے شائع کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشفق خواجہ ایسے شاعروں پر جو شاعری کو معیاری بنانے کی بجائے اسے شائع کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں ان پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گیان چند کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان میں تقریباً ہر صاحب دیوان شاعر اپنے دیوان کے ساتھ ایک بروشیر بھی چھاپتا ہے۔دیوان کے لیے کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑتی کیوں کہ شاعری کے سانچے اور ڈھانچے پہلے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص ۳۲۴

موجود ہیں انھیں کو کام میں لاکر دیوان تیار کرلیا جاتا ہے لیکن بروشیر میں شامل
کرنے کے لیے آراء اور اشتہارات کے لیے دردر کی گدائی کرنی پڑتی ہے۔
شاعر جتنی محنت بروشیر پر کرتا ہے، اگر اتنی محنت وہ اپنی شاعری پر کرے تو اس کی
شاعری پر نہ سہی، اخلاقی حالات پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔''[1]

کثیر تعداد میں کتابوں کی اشاعت سے مشفق خواجہ مایوس نظر آتے ہیں کیوں ان کے نزدیک تعداد اشاعت معنی نہیں رکھتی بلکہ وہ معیار کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کثیر تعداد میں کتابیں شائع کرنے والوں کو وہ کاغذ کا ضائع کرنا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں::

''1986ء کا آدھا سال گزر چکا ہے۔ ہم پریشان تھے کہ نظیر صدیقی کی کوئی
نئی کتاب اب تک شائع کیوں نہیں ہوئی۔ خیال آیا کہ کاغذ کی کمی کی وجہ سے ایسا
ہوا ہوگا، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگی، کیوں کہ حال ہی میں تقریباً پانچ درجنوں
شاعروں کے دیوان شایع ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا ملک
کاغذ بنانے کے معاملے میں نہ سہی، ضائع کرنے کے سلسلے میں خود کفیل ہے۔[2]

کتابوں کی فروختی

مشفق خواجہ نے جہاں اپنے کالموں میں اردو کی غیر معیاری کتابوں اور شعراء کے کثرت سے دیوان شائع ہونے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہیں انھوں نے اردو کتابوں کی کم فروختی پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک میں مصنف تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اسکی کتاب کا پہلا ایڈیشن
کبھی ختم نہیں ہوتا''۔[3]

بعض اوقات کتاب فروشوں کے پاس کتابیں رکھے رکھے پرانی ہو جاتی ہیں۔ ان کا کوئی خریدار

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 185
[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص 323
[3] سخن ہائے گسترانہ۔ ص 171

نہیں ہوتا۔ مشفق خواجہ کے مطابق کتاب فروش کبھی کبھار اپنی دوکانوں میں کتاب رکھنے کا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ غرض کتابوں کی فروختی کی اس صورتِ حال کو انھوں نے ایک مزاحیہ واقعہ کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

''اشک صاحب کی طرح ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ادیبوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ یہ بیچارے خود ہی کتابیں لکھتے ہیں۔ خود ہی چھاپتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خود ہی پڑھتے ہیں۔ وہ اپنی کتابیں کتب فروشوں کی دکانون پر لے جاتے ہیں تو دکان دار کتابیں رکھنے کا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہر سال اپنے دیوان کی قیمت میں پانچ روپے کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا: ''حضرت! آپ کا دیوان بکتا تو ہے نہیں پھر آپ اس کی قیمت میں اضافہ کیوں کرتے رہتے ہیں؟''

انھوں نے فرمایا: ''گودام کا کرایا بھی تو دینا پڑتا ہے۔

ہم نے عرض کیا ''جب کوئی کتاب کی اصل قیمت نہیں دیتا تو گودام کا کرایہ کیا دے گا''۔

انھوں نے اطمینان سے جواب دیا:

''اصل قیمت تو کب کی سوخت ہو چکی۔ اب تو صرف گودام کا کرایہ ہی رہ گیا ہے''۔[1]

مشفق خواجہ کے مطابق کتابیں فروخت نہ ہونے کی بڑی وجہ نئی نسل میں ذوقِ مطالعہ کی کمی ہے۔ ان کے خیال میں ننانوے فیصد ادیبوں کی کتابوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ اسی صورتحال پر وہ نشتر چلاتے ہوئے میرؔ کے حوالے سے طنز کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''میر تقی میر کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔ ۷۳ واں ہم نے دریافت کیا ہے جوان

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص۔196

کے دیوان اول میں ہے اور یہ ہے:

قیامت کو جرمانہ شاعری پر

مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

میر صاحب کا معاملہ تو قیامت تک کے لیے ملتوی ہوگیا کہ وہ بڑے شاعر تھے لیکن ہمارے نانوے فیصد ادیب اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیتے ہیں۔ان کی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔جب کوئی پڑھتا نہیں تو کتابوں کے فروخت ہونے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔بس شرمندگی کی دولت ہاتھ لگتی ہے اور یہی دولت بیداد کتاب لکھنے والے کا خالص منافع ہوتی ہے''۔[1]

قارئین کی کمی

ادیب اور قاری کا رشتہ نہایت گہرا ہوتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ قاری کی عدم موجودگی میں ایک ادیب کی تخلیقات بلاضرورت ٹھہرتی ہیں۔اسی طرح اگر ایک تخلیق کار کا وجود نہ ہوتو قاری کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین نہیں ہوسکتی۔مشفق خواجہ کے مطابق دورِ حاضر میں ادیب اور قاری کے درمیان عدم توازن کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔قارئین کی تعداد میں دن بہ دن کمی ہورہی ہے تخلیق کاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔اسی صورتِ حال کا اظہار خیال کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

''جس رفتار سے شعرائے کرام پیدا ہورہے ہیں، اس کے مقابلے میں قارئین کی شرح پیدائش بہت کم ہے اور اس کا امکان ہے کہ آگے چل کر یہ جنس معدوم ہوجائے گی''۔[2]

قارئین کی کمی کا سبب ذوق مطالعہ کی کمی ہے۔نئی نسل میں ذوق ادب کا رجحان ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس میں انہیں دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں دکھائی دیتا کیوں کہ جدید دور میں نئی نسل کی دلچسپی کے بہت سے سامان

---

[1] سخن ہائے گفتنی،،ص92

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 101

پیدا ہو گئے ہیں۔ایک عام قاری کے لیے تو یہ بات زیادہ تشویش ناک نہیں لیکن افسوسناک بات تو یہ ہے کہ نوجوان تخلیق کار خود اپنے آپ کو مطالعہ سے دور رکھتے ہیں اسی صورتِ حال پر مشفق خواجہ طنز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''نئی نسل کو اپنے بزرگوں سے یہ شکایت نہیں کرنی چاہئے کہ انھوں نے اپنے بعد کے شاعروں کو نہیں پڑھا کیوں کہ خود نئی نسل نے اپنے سے پہلے کے شاعروں کو پڑھنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی۔ سچی بات یہ ہے کہ نئی نسل کو سوائے مشاعرے پڑھنے کے کچھ اور پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے''[1]

کتابت کی غلطیاں

عصر حاضر میں جدید ٹکنالوجی کی جتنی سہولتیں ہو گئیں ہیں وہیں نقصانات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً کمپیوٹر کی ایجاد سے کمپوزنگ کا کام آسان ہو گیا ہے اور کتابت کے لیے کاتب کی مدد کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے بھی عصر حاضر کی کتابوں میں بے شمار غلطیاں در آئی ہیں جس کی وجہ سے قاری کو دشواری ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ مشفق خواجہ نے ادبی کتابوں اور قاری کے ساتھ ساتھ ان کتابوں میں موجود کتابت کی غلطیوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔مثال کے طور پر ان کا ایک اقتباس دیکھئے جس میں انھوں نے انیس ناگی کے حوالے سے کتابت کی غلطی پر بھرپور طنز کیا ہے:

> ''انیس ناگی اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں خود کفیل ہیں۔نہ صرف یہ کہ کتابیں وہ خود لکھتے ہیں بلکہ ان کی کمپوزنگ اور کاپی پیٹنگ بھی خود ہی کرتے ہیں۔خود کمپوز کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں بھی طبع زاد ہوتی ہیں اور انھیں کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ قاری (بشرطیکہ دستیاب) ان غلطیوں سے بھی محظوظ ہوتا ہے''[2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 182

[2] سخن ہائے گفتنی، ص 134

اسی طرح ایک اور جگہ انیس ناگی کی کتاب ''غالب ایک شاعر ایک اداکار'' کے دیباچہ کے حوالے سے بھی انھوں نے کمپوزنگ کی وجہ سے ہورہی غلطیوں پر اس طرح ضرب لگائی ہے، لکھتے ہیں:

> انیس ناگی کی زیرِنظر کتاب کا دیباچہ سعادت سعید نے لکھا ہے جس میں از راہِ سعادت مندی اس کتاب کو غالبیات میں اہم اضافہ قرار دیا گیا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں سعادت سعید دیباچہ لکھنے کی بجائے اگر کتاب کی پروف ریڈنگ کر لیتے تو اچھا تھا اس لیے شاید ہی کوئی صفحہ ہوگا جس پر کتابت کی دو چار غلطیاں نہ ہوں مثلاً قلبیت کی جگہ کلبیت اور بحث و تمحیص کی جگہ بحث و تحیث جیسی غلطیاں ہوں شبہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نئے خیالات اپنے ساتھ ایک نیا نظامِ املا بھی لے کر آئے ہیں''۔[1]

بعض کتابوں میں کتابت کی غلطیاں اس قدر ہوتی ہیں کہ پوری کتاب اچھی خاصی اغلاط نامہ معلوم ہوتی ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ کتاب قاری تک پہنچنے سے پہلے ان غلطیوں کو درست کرنا وہ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب ''عشرت فانی'' کی کتابت کی غلطیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کتابت کی ان ہی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔:

> ''یہ کتاب اس اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں کتابت کی غلطیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اتنی تو اردو کی کتابوں میں معنوی اغلاط بھی نہیں ہوتیں۔ شاید ہی کوئی صفحہ ہوگا جس پر کم از کم چھ سات غلطیاں نہ ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ ابواب کے عنوانات میں بھی یہ خصوصیت برقرار رکھی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشرت صاحب نے یہ کتاب ڈاکٹر عبارت بریلوی کی فرمائش پر تصنیف ہی نہیں کی، اس کتابت کے لیے بھی انہیں کو زحمت دی ہے۔''[2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، 217

[2] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص 255۔

اسی طرح ایک اور کتاب ''گفتگو'' کی کتابت کی غلطیوں کی قلعی بھی بڑے مضحکہ خیز انداز میں کھولی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> ''کتابت کی غلطیوں کی بات چل نکلی ہے تو یہ عرض کر دینا نا مناسب نہ ہوگا کہ زیرِ نظر کتاب ''گفتگو'' کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس پر کتابت کی دس بارہ غلطیاں نہ ہوں۔ خصوصاً شعروں پر تو وہ ظلم ڈھائے گئے ہیں کہ اچھے خاصے شعر بھی کیفی اعظمی کے شعر بن کر رہ گئے ہیں۔ کتابت کی ان غلطیوں کی بناء پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کتاب ''مشاہرین ادب'' کی نہیں ''مشاہرین کتابت'' کی بات چیت کا مجموعہ ہے''۔[1]

کتابت کی غلطیوں پر مشفق خواجہ نے بہت لکھا ہے ضخامت کے پیشِ نظر صرف چند ہی مثالیں دی گئیں ہیں لیکن ان کے مطابق اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک قاری کی حیثیت سے ادب کی صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور طنز نگار کی حیثیت سے اس کی اصلاح کے متمنی ہیں۔

کتابوں کی قیمت

مشفق خواجہ نے کتابت کی غلطیوں پر جہاں اظہارِ خیال کیا ہے وہیں وہ اردو کتابوں کی زیادہ قیمت کو بھی نشانہ طنز بنایا ہے۔ دورِ حاضر میں کتابوں کی قیمت بہت زیادہ ہے بڑھ گئی۔ اس کی وجہ مشفق خواجہ نزدیک کتابوں کی لاگت ہو سکتی ہے لیکن انھوں نے مہنگائی کا مذاق اڑاتے ہوئے کتابوں کے معیار کو بھی نشانۂ طنز بنایا ہے۔ ان کے مطابق کتابوں کی قیمت اور مصنف کی قیمت کا تعین الگ الگ کرنا ہوگا دراصل وہ معیار کو بنیاد بناتے ہوئے اس صورتحال پر طنز کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ ہم نے اس قسم کی مہنگی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ اچھے وقتوں میں اتنی قیمت کی کتاب مع مصنف مل جایا کرتی تھی۔ اب مہنگائی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص 273

کا زمانہ ہے، کتاب پر لاگت اتنی زیادہ آجاتی ہے کہ کتاب اور مصنف دونوں کی
قیمتیں الگ الگ مقرر کرنی پڑتی ہیں۔[1]

مشفق خواجہ کے مطابق کتابیں مہنگی ہونے کی ایک دوسری وجہ پبلیشر بھی ہوتے ہیں جو بغیر سوچے سمجھے کتابوں کی قیمت مقرر کر دیتے ہیں۔ انھوں فیض کے کلیات کے حوالے سے پبلشیر وں کی اس حرکت پر طنز کیا ہے:

''اس سال ایک اور مہنگی کتاب ''نسخہ ہائے وفا'' یعنی کلیاتِ فیض احمد فیض
بھی شائع ہوء۔ اس کی قیمت ۱۶۵ روپے تھے۔ لیکن جوں ہی فیض صاحب کی
آنکھیں بند ہوئی قیمت میں پندرہ روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ پہلی کتاب ہے
جس کی قیمت میں مصنف کی آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے ہوا ورنہ عام طور پر
پبلیشر خود ہی آنکھیں بند کر کے کتابوں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں''[2]

مشفق خواجہ کے مطابق پبلشروں کا اس طرح سے بغیر سوچے سمجھے کتابوں کی قیمت مقرر کرنا ایک طرح سے قاری کو کتابوں سے دور رکھنا ہے کیوں کہ قاری بعض اوقات اچھی کتابیوں کو خرید کر پڑھنا چاہتا ہے لیکن ان کتابوں کی قیمت اس کے حوصلوں کو پست کر دیتی ہے۔ مشفق خواجہ نے اس صورت حال پر کئی جگہ افسوس کا اظہار کیا ہے۔ مشفق خواجہ چوں کہ ایک حساس ادیب ہیں اس لیے بار بار انھیں اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ جن کتابوں کا معیار اعلیٰ نہیں ہوتا تو پھر ان کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہوتی ہے اپنی اسی غم وغصہ کا اظہار انھوں نے مزاح کے پردے میں انیس ناگی کے حوالے کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پچھلے مہینے انیس ناگی کی کئی کتابیں ایک ساتھ
شائع ہوئی ہیں تو ہم نے ان کی تلاش میں کراچی کی کتابوں کی تمام دکانوں کی
سیر کر ڈالی خاصی مشکل سے ایک دکان سے ان کی دو کتابیں ملیں۔ ہم نے جب

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:219
[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:156

بڑے اشتیاق سے ان کتابوں کو خریدا تو دکان دار نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ہم نے اس حیرت کا سبب پوچھا تو اس نے کہا "یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کی کتابیں کس قسم کے لوگ خریدتے ہیں۔دکان دار نے نہایت دردناک لہجے میں کہا۔ ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ میرے پاس اور بھی ہے وہ بھی آپ لے جایئے۔ دکان دار کی یہ خواہش ہم ضروری پوری کر دیتے لیکن کتابوں کی قیمت اتنی زیادہ تھیں کہ دکان دار پر رحم کھانے کے بعد خود حالت قابلِ رحم ہو جاتی۔[1]

ادبی کتابوں کی تقریبِ رونمائی

کتابوں کی رسم اجراء یا رونمائی تقریبیں بھی ہمارے ادبی کلچر کا ایک جز ہیں دراصل کتابوں کی رونمائی یا رسم اجراء ناشر یا کوئی علمی و ادبی ادارہ کرتا ہے جہاں سے وہ کتاب شائع ہوتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ کتاب کی اہمیت وافادیت کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کریں جس کے لیے ناشر یا ادارا ایسے مقررین کو مدعو کرتا ہے جو متعلقہ کتاب کے موضوع پر عبور رکھتا ہو لیکن مشفق خواجہ کے مطابق موجودہ دور میں ان تقاریب کی نوعیت کچھ اور ہے ان کے خیال میں مصنفین خود ہی اس قسم کی تقریب کا انتظام کرتے ہیں اور اس تقریب میں کی جانے والی تقریریں موضوع سے ہٹ کر ہوتی ہیں ان کے نزدیک بعض تقریریں مبالغہ آرائی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہیں تو بعض رسمی و فرمائشی ہوتی ہیں۔ان تقاریب میں اکثر لوگ ادبی مسرت کے بجائے لذتِ کام و دہن کے حصول کے لیے شرکت کرتے ہیں۔غرض ایک واقعہ کے حوالے سے اس صوت حال پر نشتر زنی کی ہے لکھتے ہیں:

> ''افتخار عارف کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے مجموعہ کلام کی غائبانہ تقریبِ رونمائی ہو چکی ہے عموماً یہ ہوتا ہے کہ مصنفین خود ہی اس قسم کی تقریب کا انتظام کرتے ہیں اور شروع سے آخر تک

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص213

موجود رہتے ہیں تا کہ کوئی مقرر گفتنی اور ناگفتنی کے فرق کو نظر انداز نہ کر دے۔''[1]

رسم اجراء کی تقاریب میں موضوعِ تصنیف سے ہٹ کر کی جانی والی تقریروں کو مشفق خواجہ نے ''جگن ناتھ آزار کی ایک کتاب ''بوئے رسیدہ'' کی تقریب رونمائی کی روداد کے ذریعہ یوں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ کہتے ہیں

''آزاد صاحب کی کراچی تشریف آوری سے کچھ دن پہلے ان کا نیا مجموعہ کلام ''بوائے رسیدہ'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا۔ آزاد صاحب کی کراچی میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناشر نے ''بوئے رسیدہ'' کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا جس میں کراچی کے مشہور نقادوں نے مقالے پڑھے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی تمام نقادوں نے جو مقالے پڑھے وہ ''بوئے رسیدہ'' کی بجائے تقریب کے دعوت نامے کے مطالعے کا نتیجہ تھے۔ ایک مقالہ نگار سے ہم نے کہا: ''حضرت! آپ نے کتاب کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں، آزاد صاحب کے بارے میں سامنے کی باتیں کہہ دیں ہیں''۔ انھوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا: ''آزاد صاحب کے سامنے، سامنے ہی کی باتیں نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ قصہ یہ ہے کہ تقریب سے صرف چند گھنٹے پہلے مجھ سے مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا ہے تھا۔ کتاب مجھے اس وقت ملی جب میں مقالہ لکھ چکا تھا''۔

آزاد صاحب کو بھی اس کا احساس تھا کہ مقالہ نگاروں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم نے ان کی دل جوئی کی خاطر عرض کیا: ''پاکستان میں یہی رواج ہے کہ کتابوں کی رونمائیوں میں جو مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ وہ متعلقہ کتابوں کو پڑھے بغیر لکھے جاتے ہیں''۔ آزاد صاحب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس کا سبب پوچھا تو ہم نے بتایا:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 240

''کتاب پڑھنے کے بعد اس کی خوبیاں تلاش کرنے کا کام مشکل ہو جاتا ہے''۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس قدرطویل ہوگیا ہے لیکن مشفق خواجہ کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے پورا اقتباس دینا ضروری تھا۔ دراصل مشفق خواجہ کم وقت میں اس طرح کی تقریبوں کے انعقاد کو درست نہیں مانتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مختلف واقعات کے حوالے سے اس طرح کی تقریبوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔

اسی طرح ایک اور کتاب ''رفیق دل فگاراں'' کی تقریب رونمائی کو طنز و مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ اس تقریب میں بھی کسی مقرر نے کتاب کا ذکر نہیں کیا بلکہ صدر جلسہ کی تعریف میں ہی سبھی مقررین نے اپنی اپنی تقریریں ختم کی۔ انھوں نے عالیہ امام کے مضمون کے حوالے سے اس طرح کی تقریروں پر بھرپور طنز کیا ہے:

> یہ تقریب رونمائی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب تھی۔ کتاب کا ذکر کسی مقرر نے نہیں کیا، زیادہ تر صدر جلسہ ہی کی تعریف میں تر زبانی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے جو ایک طویل مضمون پڑھا، وہ بھی بیگم نصرت بھٹو کی تعریف میں تھا۔ اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔
>
> ''سرو قد، متوازن اعضا، آتش رنگت، رومان انقلاب میں ڈوبی ہوئی بے قرار آنکھیں، گہریز ہنسی، ہندی و عجمی تہذیب کا مرقع، خود اعتمادی و مضبوطی لیے ہوئے مترنم انداز، دل کی آنچ میں تپے ہوئے الفاظ، شوخ و خواب آلود لہجہ جو ہر دل میں آویزاں، حسن پرست و حسن آگاہ مزاج میں راگ بھوپالی کی نغمگی''۔
>
> اس آغاز ہی سے مضمون کے انجام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے پرانے زمانے میں جب شاعر امیروں، رئیسوں اور بادشاہوں کے قصیدے پڑھتے تھے تو ان کے منھ موتیوں سے بھر دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کا مضمون قصیدہ نگاری کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ اسے سن کر صرف دس ہزار روپے عنایت فرمانا، بخل کی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 300

انتہا ہے۔اس سے کہیں زیادہ قیمت تو اس اقتباس کی ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے۔اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی جگہ ہم ہوتے تو یہ رقم واپس کر دیتے لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیتے ہیں کہ اگر بیگم صاحبہ نے یہ رقم دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لی تو جلسہ تقریب رونمائی کے اخراجات کون ادا کرے گا''۔[1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ رونمائی کی تقریبوں میں رسمی اور فرمائشی تقرریں بھی ہوتی ہیں اس امر پر طنز کرتے ہوئے نہایت سخت لہجے میں کہتے ہیں:

''رونمائی کی تقریبوں میں بیشتر تقریریں اس حد تک رسمی و فرمائشی ہوتی ہیں کہ لٹریچر کی روح سے آشنائی کے خواہاں لٹریچر کی روح قبض ہونے کا منظر دیکھ لیتے ہیں''۔[2]

یہ بات سچ ہے کہ جو تقریر رسمی یا فرمائشی ہوتی ہے اس میں جھوٹ کا عنصر ضرور ہوتا ہے مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ وہ تقاریب اجرا کے اس لیے مخالفت ہیں کہ اس میں چھوٹی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ مزاحیہ انداز میں اس طرح کی مبالغہ آرائی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر ہم کتابوں کی تقاریب اجراء کے خلاف ہیں تو محض اس لیے کہ ان کے ذریعے جھوٹی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں اور جب صاحبان کتاب ان پلوں کے ذریعے ادب کا سمندر عبور کرنا چاہتے ہیں تو پل سمیت، بلکہ ایڈمرل ایم آئی ارشد سمیت سمندر کی موجوں میں بہہ جاتے ہیں۔[3]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ انھیں تقاریب کی وجہ سے ہمارے ادب میں جھوٹی تعریف کرنے اور سننے کا رجحان عام ہوا ہے دراصل اسے وہ ایک شرم ناک کام تصور کرتے ہیں لیکن بعض ادیب اس بات پر فخر کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک واقعہ کے حوالے سے ایسے لوگوں پر انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے:

---

[1] سخن ہائے گفتنی، ص 165

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ص:122

[3] سخن ہائے گسترانہ۔ص:268

''محسن صاحب نے اپنے مراسلے میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ کتابوں کی تقریب رونمائی کی بنیاد کس نے ڈالی تھی۔ اب تک کئی مصنف اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے دعوے پیش کر چکے ہیں۔ محسن صاحب نے سب کے دعوؤں کو جھٹلا کر خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تصنیف ''شکستِ شب'' پہلی کتاب ہے جس کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس دعوے کو اعترافِ جرم سمجھنا چاہئے کیوں کہ کتابوں کی تقاریب رونمائی سے ہمارے ادب میں جھوٹی تعریف کرنے اور جھوٹی تعریف سننے کا رجحان عام ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ جب کوئی غلط کام کرتے تھے اس پر شرماتے تھے۔ اب فخر کرتے ہین اور اخباروں میں اعلان کرتے ہیں کہ اس غلط کام کو کسی اور سے منسوب نہ کیا جائے'' [1]

مشفق خواجہ نے ان تقاریب میں کیے جانے والے طعام کے انتظام کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق موجودہ دور میں اس طرح کی تقاریب میں ''اکثر لوگ ادبی مسرت کے بجائے لذتِ کام و دہن کے حصول کے لیے'' شریک ہوتے ہیں۔ ایک کتاب ''مکرر کہے بغیر'' کی رونمائی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے اعلیٰ اور شاندار پیمانے پر تقاریب کا اہتمام کرنے والوں کو بھی نشانہ تنقید بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''خدا بھلا کرے، منظر علی خاں منظر کا کہ انھوں نے پچھلے ہفتے ان کی کتاب ''مکرر کہے بغیر'' کی رونمائی اتنے شاندار پیمانے پر کی کہ ہم پروین شاکر کی تقریب کو بھول گئے۔ حاضرین کی تعداد، تصویروں کے معیار اور کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی کے اعتبار سے یہ تقریب کم از کم ان لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گی جو ایسی تقریبوں میں ادبی مسرت کے بجائے لذتِ کام و دہن کے حصول کے لیے جاتے ہیں۔'' [2]

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، 56۔

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ص:199

غرض مشفق خواجہ کے خیالات کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان تقاریب کو محض ادبی مسرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جو لوگ ادب کی صحیح قدر و قیمت کے تعین کے بجائے جھوٹی شان و شوکت اور دوسرں کو خوش کرنے کے لیے اس طرح کی محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں ان کی ان خامیوں کو بھی انھوں نے بے نقاب کیا ہے اور اس طرح اپنے کالموں کے ذریعہ اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔

چند ادبی کتابیں:

مشفق خواجہ نے جہاں ادب ادیب اور ادبی کتابوں کی صورتحال کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے وہیں چند ادبی تصانیف پر شگفتہ تبصرے بھی کئے ہیں۔ ادب میں تبصروں کی بڑی اہمیت ہے تبصرے کے ذریعہ ہم کسی بھی تصنیف کا ایک نظر میں مطالعہ کر سکتے ہیں اور تبصروں سے ہی تنقید، تحقیق اور تعبیر کی راہیں ہموار ہوتی ہیں تبصرہ نگاری کے لیے اعلیٰ علمی و ادبی ریاض ہونا ضروری ہے اور ایک تبصرہ نگار کے لیے وسیع مطالعہ دیانتدار اور غیر جانبدار ہونا بھی ضروری ہے مشفق خواجہ میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مشفق خواجہ اپنے ادبی کالموں میں کسی تصنیف یا ادب پارے کا مکمل تجزیہ پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اس تصنیف یا فن پارے کے بعض ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں جن تک عام قاری کی رسائی نہیں ہوتی۔ مشفق خواجہ اپنے زیر مطالعہ ادب پاروں پر تھوڑی دیر کے لیے ایسے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں میں سامنے آجاتی ہیں یہی ان کے تبصروں کی خاص خوبی ہے۔ وہ اپنے تبصروں میں طویل طویل بحثوں اور ہر قدم پر نظریہ سازی سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذوق سلیم اور وسعت مطالعہ کی روشنی میں ایسے محاکے پیش کرتے ہیں جو بظاہر ہماری حس مزاح کو چھوتے ہیں لیکن ان پر لطف اور پر مزاح محاکموں کے ذریعے وہ اپنے قاری کی تنقیدی بصیرت میں بیش بہا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک جگہ مظفر علی سید نے ان کی تبصرہ نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

''کتابوں کے سلسلے میں حسنِ اقتباس ان کا خاص جوہر ہے وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتی ہے۔ وہ کسی بھی مصنف کے لکھے ہوئے مختلف فقروں اور پیراگرافوں.....اوران پر رواں رائے زنی کی مدد سے ایک ایسی خندہ آور تلخیص تیار کرتے ہیں جو زیرِ نظر تصنیف کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دے''۔ [1]

مشفق خواجہ کسی بھی ادبی فن پارے پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس کو لفظاً لفظاً پڑھتے ہیں اور اس میں بیان کردہ چند ایسی باتوں کو نوٹ کرتے ہیں جس سے اس فن پارے کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا بھی انداز ہوتا ہے۔ مظہر امام ایک جگہ ان کے وسعتِ مطالعہ کے بارے میں کہا ہے کہ:

''علم کو مزاح بنانا بڑا مشکل کام ہے جیسے ''خامہ بگوش'' نے کر دکھایا ہے۔ وہ کتاب کو سونگھ کر اظہارِ خیال نہیں کرتے بلکہ اسے لفظاً لفظاً پڑھتے ہیں حتّٰی کہ بین السطور پر بھی نظر رکھتے ہیں''۔ [2]

مشفق خواجہ اپنے تبصروں میں پوری طرح سے دیانتداری اور غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے بعض لوگ بدظن ہو کر آپ سے خفگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان سے ایک انٹرویو میں ایک سوال یہ کیا گیا تھا کہ جن شخصیات یا کتابوں کا آپ مضحکہ اڑاتے ہیں، ان کی جانب سے خفگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے تاثرات پر آپ کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے اس سوال کے جواب میں مشفق خواجہ کہتے ہیں:

''اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ خیز بات نظر آتی ہے تو میں اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا اگر میں کسی غلط رجحان

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:15

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:62

کی مذمت کرتا ہوں تو کیا بُرا کرتا ہوں"۔ [1]

مشفعق خواجہ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو کسی تعصب کی بنا پر تبصرہ کرتے ہیں نہ مرعوب ہو کر بلکہ غیر جانبداری سے فن پارے کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے کالموں میں بے شمار ادبی کتابوں پر تبصرہ ملتے ہیں، یہ تبصرے انہوں نے براہِ راست بھی کیے ہیں، بالواسطہ بھی، یعنی بعض کالم کسی خاص کتاب کو موضوع بنا کر لکھے ہیں یا بعض کتابوں پر تبصرے کوئی خاص ادبی موضوع پر کی جانے والی بحث کے دوران کیے ہیں۔ ذیل میں مشفق خواجہ کے چند تبصروں کا جائزہ لیا جا رہا ہے، جن سے مشفق خواجہ کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے:

(۱) ارمغانِ خالد

''ارمغان خالد'' کے مرتب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ہیں یہ کتاب تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں شاعر عبدالعزیز خالد کے بارے میں مختلف شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے مضامین، خاکے اور نظمیں جمع کی گئی۔ اس طرح سے یہ کتاب شاعر عبدالعزیز کے فن اور شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی ہے مشفق خواجہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالعزیز خالد سے متعلق تحریروں کی جمع آوری کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے ان کے مطابق اس کتاب میں ہر وہ تحریر کو شامل کیا گیا ہے جس میں خالد کا نام نظر آیا ہو جس کی وجہ سے ایسی بہت سی غیر اہم اور غیر ضروری تحریریں بھی اس کتاب میں شامل ہوگئی ہیں چنانچہ مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''اس کتاب میں خالد کے بارے میں وہ تمام تحریریں یک جا کر دی گئی ہیں جو مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔ نیز کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں جو پہلی مرتبہ اسی کتاب کے ذریعے منظر عام پر آئی ہیں۔ مرتب نے منتشر تحریروں کو جمع کرنے میں جو محنت کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ خالد کی شخصیت اور فن پر طویل مقالوں کے ساتھ ہر وہ جملہ اور پیراگراف بھی اس کتاب میں شامل کر دیا

---

[1] بحوالہ، طاہر مسعود، شخصی انٹرویو ''مشمولہ' یہ صورت کو کچھ خوابوں کے، ص:232

گیا ہے جس میں مرتب کو خالد کا نام نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی ایسی تحریریں
بھی اس کتاب میں شامل ہوگئی ہیں جن کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ ان میں لفظ
''خالد'' خطاطی کے اعتبار سے بہت عمدہ لکھا گیا ہے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس میں مشفق خواجہ ایک غیر جانبدار تبصرہ نگار نظر آتے ہیں انہوں نے اس کتاب کی خوبی کے ساتھ اس کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

مشفق خواجہ نے ایک طرف اس کتاب کی تحقیقی اہمیت کو تسلیم بھی کیا ہے اور مرتب کی محنت کی داد بھی دی ہے اور شاعر خالد کے نام کا بے جا استعمال پر اعتراض بھی کیا ان کا خیال ہے کہ مرتب کا معیار انتخاب کڑا ہونا چاہیے اور اُسے اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنا آنا چاہیے مشفق خواجہ کے مطابق اس کتاب میں مرتب نے اس تفریق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ جس کا اظہار انہوں نے طنز کے پیرائے میں اس طرح کیا ہے:

''بہر حال مرتب کی یہ محنت بے فائدہ نہیں۔ سو سال بعد جب خالد پر تحقیق
ہوگی تو محققوں کا ''خام مواد'' کی فراہمی کے لیے اخبارات وجرائد کی گرد چھاڑنا
نہیں پڑے گی۔ سب کچھ انہیں ایک ہی جگہ مل جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ
جن لوگوں کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے بعض کے بارے
میں سو سال بعد محققوں کو یہ جاننے میں دقت پیش آئے گی کہ یہ لوگ کون تھے اور
کیا بیچتے تھے۔ یہ بات باانداز دیگر یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ زیر نظر کتاب میں
شامل بعض تحریروں کے لکھنے والوں کے نام محض اس لیے باقی رہ جائیں گے کہ
انہوں نے خالد پر کبھی کچھ لکھا تھا''۔ [2]

(۲) بُری عورت کی کتھا

یہ کتاب پاکستانی شاعرہ کشور ناہید کی آپ بیتی ہے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں قدم قدم پر مردانہ معاشرے کی قائم کردہ غیر منصفانہ اور جابرانہ روایات سے بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی

---

[1] [2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:11

ہیں اوران کے مطابق کہ یہ کسی بُری عورت کی کتھا نہیں ہے بلکہ ان برے لوگوں کی کہانی ہے جن کے ساتھ ایک عورت مختلف رشتوں کے سہارے زندگی گذارتی ہے چنانچہ مشفق خواجہ اس آپ بیتی پر اس لیے اعتراض ہے کہ اس کا موضوع وہ نہیں ہے جو اس میں بیان کیا گیا ہے اس لیے اس غلط موضوع کے انتخاب پر اعتراض کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کشور ناہید کی آپ بیتی کا نام ہے ''بُری عورت کی کتھا'' لیکن پوری کتاب میں وہ بری عورت کہیں نظر نہیں آتی جس کی یہ کتھا ہے۔ یہ تو بُرے لوگوں کے درمیان گھری ہوئی ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے جس کو قدم قدم پر مردانہ معاشرے کی قائم کردہ غیر منصفانہ اور جابرانہ روایات سے بغاوت کرنی پڑی۔ برے لوگ تو وہ ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔

ان برے لوگوں میں ماں باپ، بھائی بہن، شوہر، بچے سسرال والے استانیاں، شاعر ادیب دوست اور عشاق سب ہی شامل ہیں۔ ابا اس لیے برے کہ کم پڑھے لکھے تھے اور بچوں کو تعلیم پر کچھ خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جب بیٹی نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تو سخت مشتعل ہوئے اور یہ کہا ''میرے گھر مت آؤ۔ تم نے غیر ذات کے لڑکے سے شادی کی ہے، برقعہ اتارا ہے''۔

اماں تو ہمیشہ یہی کہتی تھی: ہائے میں تجھے کیا کھا کے جنا تھا'' مگر بیٹی کی شادی کے بعد تو وہ حد سے بڑھ گئی اور یہ کہا ''میں دودھ نہیں بخشوں گی، ..... بھائی اس لیے برے تھے کہ وہ غیر لوگوں یعنی شاعروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں وغیرہ کا گھر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔۔۔ عشاق اس لیے برے تھے کہ کوئی بوقت ملاقات پان کھانے کی غیر رومانی فرمائش کرتا اور کوئی کشور کے بچوں سے خود کو ''ماموں جان کہلوا کر خوش ہوتا ..... سسرال والے اس لیے برے تھے کہ انہوں

---

۱ ۲ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:11

نے پہلا کام یہ کیا کہ کشور کو بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دھمکیاں دیں کہ
ہمارے لڑکے کو چھوڑ دو ورنہ اغوا کر لی جاؤ گی'' [1]

منظر پتلی

یہ کتاب محسن بھوپالی کے ''ہائیکو'' کا مجموعہ ہے مشفق خواجہ کا خیال ہے اس مجموعہ میں محسن بھوپالی ایک مصور کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں اور اس میں ہر وہ مخلوق کو انہوں نے موضوع سخن بنایا ہے جو شاعری کی کتابوں میں نہیں بلکہ علم حیونات کی کتابوں میں نظر آتی ہیں ان کے اس انوکھے روپ کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محسن بھوپالی شاعر تو تھے ہی، زیر نظر مجموعے میں وہ ایک باکمال مصور کی حیثیت سے بھی سامنے آئے ہیں۔انہوں نے نہایت چابک دستی سے کونا کوں مظاہر فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دوران مطالعہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کتاب نہ ہو، کوئی آرٹ گیلری ہو جہاں قاری، ایک ناظر کی حیثیت سے مصوری کے شاہ کاروں سے محظوظ ہو رہا ہے۔یہ کمال فن کسی کسی کی قسمت میں ہوتا ہے۔

اور قسمت کے اعتبار سے ہم بھی کچھ ایسے برے نہیں ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے ذریعے ایک ان دیکھی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔اس کتاب میں بہت سی ایسے چیزیں نظر آئیں جو عموماً شاعری کی کتابوں میں نہیں ہوتیں۔علم حیوانات کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔مچھر، بھنگے، تتلیاں، مینڈک، مچھلیاں، مرغابیاں، بگلے، مور، بھنورے غرض کہ ہر وہ مخلوق جس سے اس دنیائے آب وگل کی رونق ہے۔اس کے حوالے سے محسن بھوپالی نے نئے نئے مضمون نکالے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں بازی گر ٹوپی سے خرگوش نکالا کرتے تھے'' [2]

---

[1] سخن در سخن،، ص:۲۲،۲۳

[2] سخن در سخن، ص:۱۷۹،۱۷۸

تحریریں چند

اس کتاب کے مصنف ''الطاف گوہر'' ہیں مشفق خواجہ کے مطابق اس میں نو تنقیدی مضامین، دو شخصی خاکے تین تقریباتی تحریریں اور نظموں غزلوں، کے علاوہ دو طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور ایک افسانے نما تحریر ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق اس کتاب کا مصنف کوئی پیشہ وار ادیب نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کتاب کی ادبی اہمیت ہے چنانچہ مصنف کا تعارف پیش کرتے ہیں اور ان کے اسلوب نگاری کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''الطاف گوہر پیشہ ور نقاد ہیں نہ ہمہ وقتی شاعر۔ ادب ان کی زندگی کی ترجیحات میں بھی شامل نہیں۔ اس کے باوجود ان کی یہ کتاب ایک اہم ادبی تصنیف ہے اور اس شخص کی نظر سے گزرنی چاہیے جسے ادب سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ایک ایسا اسلوب تحریر نظر آتا ہے جو اردو کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا۔ غلط نویسی کے اس دور میں صحیح اردو میں لکھی ہوئی کتاب نظر آجائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے''۔

مشفق خواجہ نے جہاں اس کتاب کی ادبی اہمیت کو سراہا ہے وہیں اس کتاب میں موجود تنقیدی مضامین پر تنقید بھی کی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں شامل تنقیدی مضامین کی تین قسمیں بتائی ہیں جیسے ''تقویم پارینہ''، ''مشق سخن'' اور ''تقریباتی مضامین'' مضامین کی ان قسموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے آج کے تناظر میں اس کی اہمیت کو پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''الطاف گوہر نے جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں ان میں سے بعض ''تقویم پارینہ'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ''نوجوان اسکول کا نظریہ شعر'' یا ''نئی شاعری کی موت''۔ ان کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ ان سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایسے مضامین بھی لکھے جاتے تھے۔ بعض مضامین ''مشق سخن'' کے

---

1 خامہ بگوش کے قلم سے، ص:32

ذیل میں آتے ہیں جیسے ''قومی ادب اور سرکاری ادب اور ''پاکستانی ادیب کا مسئلہ''۔ان میں مفروضات کو مسائل بنا کر بات سے بات نکالی گئی ہے۔ممکن ہے ربع صدی قبل جب یہ مضامین لکھے گئے تھے،ان کی کوئی اہمیت ہو،لیکن آج اِن میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی''۔ [1]

مشفق خواجہ نے الطاف گوہر کے اسلوب کا تعین بھی کیا ہے ان کے خیال میں الطاف گوہر کے اندازِ تحریر کی نمایاں خوبیاں وضاحت اور ابلاغ ہے ان کے مطابق گوہر کا اسلوب سادہ اور آسان ضرور ہے لیکن اس کی الگ سے کوئی پہچان نہیں ہے لکھتے ہیں:

''الطاف گوہر کا ذخیرۂ الفاظ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہر طرح کے خیالات کا اظہار پر قادر ہیں، وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، نہایت وضاحت سے کہہ دیتے ہیں اور کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی خیال تشنۂ اظہار رہ گیا یا کوئی پیرایہ اظہار خیال کی ترسیل میں ناکام رہا۔الطاف گوہر کے اسلوب کی الگ سے کوئی شناخت نہیں جیسے محمد حسین آزاد یا ابوالکلام آزاد کا اسلوب۔لیکن ہم اسے اردو کے بنیادی اسالیب میں شمار کر سکتے ہیں جیسے مولوی عبدالحق یا ڈاکٹر عابد حسین کا اسلوب''۔ [2]

ان کی تبصرہ نگاری کی خوبی یہی ہے کہ وہ کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلے تو خوبیوں پر اظہار خیال کرتے ہیں اور ساتھ خامیوں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ناقد کی حیثیت سے ان کا نظریہ متوازن ہے۔

(۵) دامنِ یوسف

یہ تصنیف محترمہ بیگم سرفراز اقبال کی ہے جس میں انہوں نے اپنے نام فیض کے خطوط کو ان کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے جس پس منظر کے ساتھ فیض کے ان کے خطوط کو پیش کیا گیا

---

۱ ۲۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۳۲

ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فیض کی سوانح حیات کا ایک باب ہے۔اس کتاب میں فیض کے کُل 56 خطوط ہیں ان میں سے تقریباً خطوط اتنے مختصر ہیں کہ ''عزیزی'' سے شروع ہوکر ''فقط'' پر ختم ہوتے ہیں چنانچہ مشفق خواجہ نے غیر ادبی اور ذاتی نوعیت کے خطوط کو شامل کرنے خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''دامن یوسف'' اور یہ تالیف لطیف ہے محترمہ سرفراز اقبال کی۔محترمہ نے اپنے نام فیض کے خطوں کو ان کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اس طرح یہ کتاب ان کی آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئی ہے ایک ایسی آپ بیتی جسے فیض کی سوانح حیات کا ایک باب بھی کہا جا سکتا ہے.....اس کتاب میں فیض کے کل ۵۶ خطوط ہیں۔چند خط محترمہ کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔تین چار کے علاوہ باقی سب خطوط مختصر ہیں لیکن ان کے اختصار میں ایک جہانِ معنی نظر آتا ہے۔ابتدائی دو چار خطوط ''عزیزی'' سے شروع اور ''فقط'' پر ختم ہوتے ہیں۔ان کے بعد کے خطوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔[1]

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ کو غیر ضروری تفصیلات جو ادیب اپنی تصنیفات میں دیتے ان پر سخت اعتراض ہے یعنی ایسے خط جن کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے مرتب فیض خطوط کو ترتیب کرتے وقت انہیں بھی شامل کر دیا جس کی وجہ سے اس کی ادبی حیثیت کم ہوگئی چنانچہ ان کا یہ نظریہ ہے کہ مرتب کو کسی ادبی شخصیتوں کے خطوط کو ترتیب کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مشفق خواجہ کے مطابق اس کتاب میں شامل فیض احمد فیض کے خطوط ان کی جذباتی اور رومانی زندگی کی داستان سناتے ہیں مشفق خواجہ نے کالم میں ان خطوط کے مختلف اقتباسات نقل کرتے ہوئے ان پر دلچسپ تبصرے کیے ہیں ایک اقتباس دیکھیے:

۱۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:41

"..... ایک مرتبہ محترمہ حج کر کے آئیں تو فیض نے انہیں لکھا: "خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہارے نوسو پورے ہو گئے ہیں۔ اب اگلے نوسو ہونے تک تمہیں کافی لمبی چھٹی ہے"..... محترمہ جب پہلی مرتبہ نانی اماں بنیں تو فیض صاحب نے برسوں پہلے نانا بن چکے تھے، انہیں مبارک باد کا خط لکھا۔ یہ خط نانا نانی کے باہمی ربط کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے، "آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں، مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے لیے ایک گرینڈ مدر کا بیج بنوالو جو بوقت ضرورت سامنے لگالیا کرو، لیکن خیر نانی پن سے تم میں کیا فرق آئے گا۔ البتہ اب ہم واقعی ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا"۔ [1]

مشفق خواجہ نے فیض کے خطوط کے ایسے ہی چیدہ چیدہ اقتباسات درج کر کے ان پر اتنے معنی خیز تبصرے کیے ہیں کہ فیض کی شخصیت کا رنگین اور رومانی پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے آخر میں انہوں نے اس کتاب کے نام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کتاب کو "دستِ زلیخا" کی کارفرمائیاں کہنے والے لوگوں سے اختلاف کیا ہے ان کے مطابق کتاب کے موضوع کی بجائے قاری کو اسی سے سرکار رکھنا چاہئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام "دامن یوسف" کے بجائے "دامن تار تار" ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر "دستِ زلیخا" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکی داماں کی حکایت بیان کی گئی ہے، اس لیے وہی نام درست ہے۔ جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو فریقین کا طریقہ واردات ہے اور پڑھنے والوں کو اسی سے سروکار رکھنا چاہیے"۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:44

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:48

اقبال یورپ میں

اس کتاب کے مصنف اقبال شناس سعید اختر درّانی ہیں۔ مشفق خواجہ نے ان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر درانی صاحب اقبال پر تحقیقی کام کی طرف متوجہ ہوئے انہوں نے یورپ کے بعض اداروں اور افراد کے پاس اقبال سے متعلق غیر مطبوعہ مواد کا سراغ لگایا اور متعدد مضامین لکھے ان مضامین سے اقبال کی زندگی کے بہت سے مخفی پہلو سامنے آئے لہٰذا انہیں مضامین کا مجموعہ ''اقبال یورپ میں'' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ جو اقبالیات میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشفق خواجہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی اس خامی پر سخت طنز کیا ہے انھیں دراصل اس بات پر اعتراض ہے کہ سعید اختر درانی نے اس میں غیر اہم اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرنے کی بجائے اسے مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں سفر نامے کی خوبیاں بھی موجود ہیں، افسانوی اسلوب کی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اس کے علاوہ یہ کتاب تحقیق اور تخلیق کا دلچسپ امتزاج بھی ہے ایک اقتباس دیکھیے جس میں مشفق خواجہ نے ڈاکٹر درانی کے اسلوب نگارش اور انداز تحقیق پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اقبال یورپ میں'' کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر درانی نے اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کیا اور ''ایماویگے ناسٹ'' کو اپنا موضوع بنا کر رسالہ ''افکار'' میں ایک طویل سلسلہ مضامین لکھا ان مضامین سے اردو تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔
>
> علامہ اقبال سے ایماویگیناست کا تعلق یہ تھا کہ وہ علامہ اقبال کے جرمنی میں قیام کے دوران انہیں جرمن زبان پڑھایا کرتی تھی۔ کوئی اور محقق ہوتا تو وہ ایما کے مختصر حالات لکھنے پر اکتفا کرتا لیکن ڈاکٹر درانی نے ان محترمہ کی سات پشتوں

پر تحقیق کر ڈالی۔ ایما کے اہل خاندان، ان کی رہائش گاہوں اور قبروں کے بارے میں وہ تمام تفصیلات پیش کر دیں جو اب تک پردۂ راز میں تھیں۔ یہی نہیں دورانِ تحقیق خود ڈاکٹر صاحب پر جو گزری، اس کی تفصیلات بھی انہوں نے اس طرح قلم بند کی ہیں جیسے یہ سب باتیں بھی علامہ اقبال یا ایما ویگیناست کے نامہ ہائے اعمال کا حصہ ہوں..... ڈاکٹر صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ وہ دورانِ تحقیق پیش آنے والے ہر واقع کو تحقیق ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تحقیق میں افسانوی انداز پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے..... ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں گہرائی کا اِسے اندازہ کیجئے کہ علامہ اقبال نے ہائڈل برگ کے جس مکان میں قیام کیا تھا۔ اس کے موجودہ مالک سے بھی انہوں نے ملاقات کی اور اس کے مفصل حالات زندگی قلم بند کیے اور یہ بھی بتایا کہ اس مکان کی تین منزلوں میں اب کون کون رہتا ہے۔ اور ۱۹۰۷ء سے لے کر اب تک اس مکان میں کس قسم کی تعمیراتی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مفید اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ مالک مکان کے نواسے کی عمر چار برس اور نواسی کی عمر سات برس ہے"۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ نے جہاں درانی صاحب کی اس تحقیقی کتاب کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے وہیں ان کے انداز تحقیق سے اختلاف بھی کیا ہے انھیں اس بات سے سخت اعتراض ہے کہ درانی صاحب نے چند معاملات میں غیر ضروری اور بے جا تحقیق کا مظاہرہ کیا ہے اور جوش تحقیق میں ایسی معلومات بھی فراہم کی ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہے غرض ان اختلافات کو وہ ہجو ملیح کے پیرائے بیان کرتے ہیں۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۵۱

زندہ پانی سچا

یہ ساقی فاروقی کا شعری مجموعہ ہے جس میں ان کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے انہیں ایک جدید ترین شاعر قرار دیا ہے ان کے مطابق ساقی فاروقی کا تعلق یوروپ سے ہے اور وہاں کی ادبی، ثقافتی اور معاشرتی طرز زندگی کو نمایاں کر کے انھوں نے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کا تعارف پیش کرتے ہوئے انھیں جدید ترین شاعر قرار دیتے ہیں:

> ''وہ (ساقی فاروقی) گزشتہ ۲۵ برسوں سے اپنے معاشرے سے کٹ کر ایک اجنبی معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی شعری اور ثقافتی روایات سے رشتہ برقرار رکھا ہے اور اجنبی معاشرے کی علمی، ادبی اور ثقافتی قدروں سے استفادہ کر کے اپنی شاعری کا افق وسیع بھی کیا ہے یہی وجہ ہے کہ عام اردو شاعروں کی نسبت ان کے موضوعاتِ سخن میں وسعت بھی ہے اور تنوع بھی۔ اس بنا پر اگر انہیں اردو کے جدید شاعروں میں جدید ترین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا''۔ [1]

[1] خامہ بگوش کے قلم سے ''مرتب'' مظفر علی سید، ص:۶۱

مشفق خواجہ کے مطابق ان کے کلام میں جانوروں کا بہت ذکر آیا ہے بعض جانوروں پر تو انہوں نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ساقی کے کلام میں جانوروں کے ذکر کی بہتات پر طنز کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''ساقی کو جانوروں سے خاصی دلچسپی ہے۔ مجموعہ کلام کیا ہے، اچھا خاصا چڑیا گھر ہے جس میں جگہ جگہ درندے، پرندے، چرندے، اور گزندے، نظر آتے ہیں۔ کتے، مینڈک، خرگوش، سور اور بلے پر تو مستقل نظمیں بھی موجود ہیں۔ ایسا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۵۱

معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نے میر تقی میر کا کلام بہت غور سے پڑھا ہے۔میر صاحب نے کتوں، بلیوں اور بکریوں وغیرہ پر کئی مثنویاں لکھی ہیں۔''دوشکارنامے'' بھی تصنیف کیے ہیں جن میں دنیا جہاں کے جانوروں کا ذکر ہے، ساقی نے سوچا ہوگا کہ میر صاحب کی عظمت کا راز شاید ان کی جانور نویسی میں ہے، لہٰذا انہوں نے بھی اس مخلوق کو نشانہ ستم بنایا''۔[1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے مشفق خواجہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو پسند نہیں کرتے جس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ان کے نزدیک ادب کو دوسروں کے فائدے کے لیے ہونا چاہئے کیوں کہ غیر ضروری باتوں سے ادب کا مقصد پورا نہیں ہوتا اسی لیے وہ ایسے تخلیق کاروں پر اعتراض کرتے ہیں جو غیر ضروری باتوں کے بیان کے لیے ادب کا استعمال کررہے ہیں۔

اردو ادب کے مغربی دریچے

یہ نظر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل چھ (۶) تنقیدی مضامین ہیں۔مشفق خواجہ نے اس کتاب پر مختصر سا تعارف پیش کر کے اس کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق اس میں دو مضامین مصنف کی ایک اور کتاب میں بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں دراصل مصنف نے اپنی ایک نئی کتاب کی تشکیل میں اپنی ایک پرانی کتاب سے استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ پورے کے پورے مضمون ہی اڑا لیے ہیں غرض مشفق خواجہ نے مصنف کے اس فعل کی طرف لطیف پیرائے میں یوں توجہ مبذول کرائی ہے لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب کے ہر صفحے سے مصنف کے وسیع مطالعہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔انہوں نے دوسری کتابوں سے بے شمار اقتباسات ہی نقل نہیں کیے پورے کے پورے مضمون بھی اڑا لیتے ہیں۔مثلاً اس کتاب میں شامل پہلے دو مضمون

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۶۲

(اظہار یا ابلاغ)۔(اردو ادب اور شعبہ اردو) ہم ایک اور کتاب میں بھی پڑھ چکے ہیں۔اس کتاب کا نام ہے ''میرے خیال میں'' اور یہ ۱۹۶۸ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی تھی۔یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ اس دوسری کتاب کے مصنف بھی نظیر صدیقی ہی ہیں۔اگر خدانخواستہ کوئی اور ہوتا تو نظیر صدیقی پر سرقے کا الزام لگ جاتا۔موجودہ صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک نئی کتاب کی تشکیل میں اپنی ایک پرانی کتاب سے استفادہ کیا ہے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ اپنی کتابوں سے نظیر صاحب ہی بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کسی اور میں نہیں ہوسکتی''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ اس طرح کے استفادہ کو ''سرقہ'' کہتے ہیں اور اس رجحان کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ محض ''کتاب سازی'' کے شوق کی خاطر اپنے پرانے مضامین کو بارِ دگر شائع کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے مطابق نظیر صدیقی نے کتاب کے دیباچے میں کتاب کے نام کا جواز بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس کتاب کے مضامین چونکہ مغربی شعر وادب کے ان مسائل اور موضوعات پر مبنی ہیں جو اردو شعر وادب پر اثر انداز ہیں اس لیے اس کا نام ''اردو ادب کے مغربی دریچے'' تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشفق خواجہ اس ''جواز'' سے اختلاف کرتے ہوئے اس کتاب کے نام کو گمراہ کن قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ان میں سوائے پہلے مضمون (اظہار یا ابلاغ) کے کسی مضمون کا موضوع ایسا نہیں ہے جو اردو شعر وادب پر اثر انداز رہا ہو۔''اردو ادب اور شعبۂ اردو'' کے عنوان سے جو مضمون ہے،اس میں کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے نصاب کی تفصیلات دی گئی ہیں۔دو مضامین میں جدید امریکی اور برطانوی شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں.....ایک مضمون میں کولن ولسن کا تعارف

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۶۴

کرایا گیا۔کولن ولسن اردو ادب پر نظری صدیقی کے برابر بھی اثر انداز نہیں رہا۔ آخری مضمون سترھویں صدی کے مابعد الطبیعیاتی شاعر جون ڈن کے بارے میں ہے۔نظری صدیقی نے خود اعتراف کیا ہے کہ اردو والوں کی جون ڈن سے شناسائی برائے نام ہے۔جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر اس شاعر کے اردو ادب پر اثر انداز ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے''۔ [1]

تبصرہ نگار عموماً کتاب کا تعارف اس کی خامیوں اور خوبیوں کے علاوہ اس کی قیمت پر بھی نظر رکھتا ہے۔مشفق خواجہ نے بھی اپنے تبصروں میں ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھا ہے لیکن یہاں بھی ان کا انداز مزاحیہ اور طنزیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مجموعی طور پر نظیر صدیقی کو سراہاتے ہوئے انھوں نے اس کی قیمت زیادہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ مزاحیہ پیرائے میں لکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر نظری صدیقی کی اس تنقیدی کتاب کو فکر انگیز کتاب کہتے ہوئے اس کی قیمت پر یوں تنقید کی ہے لکھتے ہیں:

''بہ حیثیت مجموعی نظیر صدیقی کی کتاب خاصی فکر انگیز ہے اور جب اس کی قیمت پر نظر ڈالی جائے تو یہ تشویش انگیز بھی نظر آتی ہے۔اتنی مہنگی کتاب وہی لوگ خرید سکتے ہیں جو ناشر یعنی نیشنل بک فاونڈیشن جیسے سرکاری ادارے کو خیراتی ادارہ سمجھ کر اس کی مدد کرنا چاہتے ہوں''۔[2]

اُو کھے لوگ

''اُکھے لوگ''ممتاز مفتی کا شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں ابن انشاء،اشفاق احمد،ادا جعفری، بانو قدسیہ،قدرت اللہ شہاب اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے خاکے موجود ہیں۔اس مجموعہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے انھوں نے مصنف کا تعارف بھی پیش کیا ہے اور کتاب کی خصوصیات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۶۵

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۶۷

ممتاز مفتی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اسی لیے ان کے خاکوں میں افسانے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ سچے واقعات کو بھی افسانوی انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی اسی خامی کا وہ مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ممتاز مفتی کا تازہ ترین کارنامہ ان کی کتاب ''اوکھے لوگ'' ہے جو شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ابن انشاء اشفاق احمد، ادا جعفری، بانو قدسیہ اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے خاکے ہیں۔ ممتاز مفتی چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، اس لیے وہ سچے واقعات کو بھی افسانہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور کہیں کہیں اس کے برعکس بھی عمل ہوتا ہے۔ یعنی افسانوی باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ سچے واقعات ہوں۔ اس کی بہترین مثال قدرت اللہ شہاب کا خاکہ ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ مفتی نے ان تمام خاکوں میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے چاہے کسی شخصیت کا کوئی پہلو ناگفتہ ہی کیوں نہ غیر جانبداری سے بیان کرتے ہیں ان کی اس خوبی پر بڑے لطیف پیرائے میں یوں روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ممتاز مفتی دوسروں کی شخصیات کو بے نقاب کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سرفہرست یہ ہے کہ کس نے کتنے معاشقے کیے کن حالات میں کیے اور کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اس قسم کے واقعات کے بیان میں ممتاز مفتی اس حد تک فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ اپنے پیر و مرشد قدرت اللہ شہاب کو بھی نہیں بخشے''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،، ص:۶۹

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۷۳

مکالمات

''مکالمات''انیس ناگی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب فکر انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی ،غرض اس کتاب کی فکر انگیزی اور دلچسپی پر معنی خیز انداز میں روشنی ڈالی ہے:

> ''یہ دلچسپ اور فکر انگیز کتاب ہے۔دلچسپ اس لیے کہ ناگی نے بڑے مزے مزے کی باتیں کی ہیں۔فکر انگیز اس لیے کہ پڑھنے والا فکر وتشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ تنقید ہے یا عہد حاضر کے پاکستانی ادیبوں کے خلاف اعلان جنگ''۔ [1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ انیس ناگی نے اپنے اس تنقیدی مضامین کے مجموعہ میں کئی ادیبوں پر غیر ضروری تنقید کی ہے جیسے فیض احمد فیض ،قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، انتظار حسین وغیرہ ان کے مطابق وہ کسی سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے چنانچہ انیس ناگی کی اس خامی پر طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے:

> ''انیس ناگی نے اپنے مجموعہ مضامین میں کئی ادیبوں کے بارے میں اپنے عجیب وغریب خیالات پیش کیے ہیں۔فیض احمد فیض ہوں یا قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں یا انتظار حسین، وہ کسی سے مطمئن نظر نہیں آتے حالانکہ ان ادیبوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا وہ انیس ناگی کو مطمئن کرنے کے لیے ادب تخلیق کر رہا ہے۔قرۃ العین حیدر اور ان کے ناول ''گردش رنگ چمن'' کے بارے میں انیس ناگی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی شہرت اور مقبولیت سے وہ اتنے خائف ہیں کہ انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، حالاں کہ قرۃ العین حیدر کو انیس ناگی کے مستقبل تو تاریک، ماضی وحال سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۸۶

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:۸۹

دراصل مشفق خواجہ کوایسے ادیبوں سے سخت اعتراض ہے جو بے لاگ تنقید کرتے ہیں یا بغیر سوچے سمجھے تنقید کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کتابوں پر تبصرے کرتے وقت ان باتوں پر ضرور غور کرتے ہیں اور ان کی ان خامیوں کی نشاندہی کرکے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

''چہار خواب''

یہ قمر جمیل کا شعری مجموعہ ہے، مشفق خواجہ اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی خامیوں کی طرف مزاحیہ انداز میں اشارہ کیا ہے اور ثبوت کے طور پر چند شعر بھی نقل کیے ہیں جیسے:

ہم باد بہاری ہیں کبھی آکے ترے پاس
اے دوست تجھے نیند سے بیدار کریں گے

اجنبی ملکوں، اجنبی لوگوں میں آکر معلوم ہوا
دیکھنا سارے ظلم وطن میں لیکن ہجرت مت کرنا

غرض ایسے اور بھی شعر نقل کرتے ہوئے قمر جمیل کی غزل گوئی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے، کہتے ہیں:

> یہ اشعار اردو غزل کی بہترین روایات کے نہ صرف آئینہ دار ہیں بلکہ ان کی توسیع بھی ہیں۔ اگر کوئی اس قسم کے دو چار شعر بھی کہہ لے تو اسے اردو غزل کی تاریخ کے متن میں نہ سہی غلط نامے میں ضرور جگہ مل جائے گی۔ قمر جمیل نے اس قسم کے بیسیوں شعر کہے ہیں، اس لیے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز مقام کے مستحق ہیں''۔ [1]

قمر جمیل کے مجموعہ کلام میں غزلوں کے علاوہ نثری نظمیں بھی شامل ہیں نثری نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے ان کی نثری نظموں کو محض ایک تکلف قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق ان کی بعض نثری نظموں میں شاعرانہ خیالات کم اور ناقدانہ خیالات زیادہ بیان ہوئے ہیں اس لیے مشفق خواجہ نے ان نظموں کو ''تنقیدی مضامین'' کہا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ان نظموں میں ''گھوڑے'' کا ذکر کثرت سے آیا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۹۲

ہے۔اس لیے اس کے مجموعہ کلام کو وہ ''نفرس نامہ'' کہتے ہیں۔

زنجیر نغمہ

''زنجیر نغمہ'' ڈاکٹر محمد حسن کا شعری مجموعہ ہے، مشفق خواجہ نے کتاب کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ محمد حسن نے دو دیباچے تحریر کیے ہیں ایک آغاز میں اور دوسرا آخر میں۔ان کے مطابق محمد حسین نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ شاعری کے ذریعہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے لیکن مشفق خواجہ کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے ان کے مطابق ان کی نظمیں سیاسی نہیں ہیں بلکہ ایک ''وسیع فلسفیانہ نظام'' کی آئینہ دار ہیں۔محمد حسین نے اپنے دیباچہ میں وزن اور بحر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ وزن اور بحر کی شاعری میں ضرورت نہیں ہوتی اگر اتفاق سے آجائے تو ان سے اجتناب بھی نہیں کرنا چاہیے، مشفق خواجہ کو محمد حسین کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں ہے ان کی ان باتو اں پر اختلاف کرتے ہوئے ان کی خامیوں کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> ''یہ بات اس لیے کہی ہے کہ انہوں نے بعض نظمیں وزن اور بحر میں لکھنی شروع کیں مگر بات نہ بنی تو وزن اور بحر کو بالائے طاق رکھ کر بعجلت ممکنہ نظموں کو مکمل کر دیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عجلت میں ڈاکٹر صاحب نے بیشتر نظموں کے مفاہیم ومطالب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے''۔[1]

کلیات حبیب جالبؔ

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ فیض کے بعد حبیب جالب اردو کے دوسرے شاعر ہیں جن کا کلیات لندن سے چھپا ہے یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے، مشفق خواجہ نے لندن میں چھپنے اور ضخامت میں زیادہ ہونے پر تو انہیں مبارکباد دی لیکن اس کی کمیوں اور خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ان کے مطابق ضخامت ہی سب کچھ نہیں معیار بھی ضروری ہے اور معیار کے اعتبار سے وہ کم وزنی بتاتے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:111

''فیض کے بعد حبیب جالب دوسرے اردو شاعر ہیں جن کی کلیات لندن سے چھپی ہے۔ یہ اِن دونوں شاعروں کی عظمت کی دلیل ہے۔ فیض کی عظمت کی تو کئی اور دلیلیں بھی ہوسکتی ہیں، لیکن جالب کی عظمت کے لیے فی الحال یہی ایک دلیل دست یاب ہوئی ہے جو خاصی وزنی ہے۔ جالب کی کلیات بھی خاصی وزنی ہے، بڑے بڑے سائز میں دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔ تین کلو سے کم کیا ہوگی۔ اگر کلام کو وزن بھی شامل کرلیا جائے تو کلیات کے وزن میں ۱۰۔۱۵ گرام کا اضافہ ہوسکتا ہے''۔ ۱

ورودِ مسعود

''ورودِ مسعود''، مسعود حسین خان کی آپ بیتی ہے۔ ''آپ بیتی''، مشفق خواجہ کا دلچسپ موضوع ہے۔ اپنے کالموں میں انہوں نے بے شمار آپ بیتیوں پر اظہار خیال کیا ہے اُن میں سے ایک آپ بیتی ''ورودِ مسعود'' بھی ہے۔ ''ورودِ مسعود'' کا تعارف پیش کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ وہ اسے اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں شمار کرتے ہیں، اس کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہم نے ''ورودِ مسعود'' کو اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں اس لیے شمار کیا ہے کہ اس کے دامن میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو آپ بیتی کے دائرے میں نہ آتی ہو، عام آپ بیتی نگاروں کی طرح انہوں نے اپنے موضوع سے کہیں انحراف نہیں کیا اور اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان سے کام رکھا ہے.....اس کتاب میں مصنف نے واقعات کو خوش اسلوبی اور دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے''۔ ۲

مشفق خواجہ ایک باشعور نقاد کی طرح جہاں اس تصنیف کی خوبیاں بیان کرتے ہیں وہیں اس کے

---

۱ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۱۱۸

۲ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۱۶۱

بعض کمزور پہلوؤں کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''ورودِ مسعود'' کا خوب صورت پیرایہ بیان قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کتاب کو شروع کرنے اور ختم کرنے کے درمیان کوئی دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملتی کہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ''بیان'' کتنا ہے اور ''آرائشِ بیان'' کتنی''۔[1]

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں بیان سے زیادہ ''آرائش بیان'' پر توجہ صرف کی ہے ان کی اس خامی کی طرف مشفق خواجہ نے کس قدر خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

اسی طرح آگے وہ اس آپ بیتی میں پیش کردہ نشیب و فراز پر تنقید کرتے ہوئے بڑے شائستہ لہجے میں طنز کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ورودِ مسعود'' ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے، ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک فرد ہی کی نہیں، ایک پورے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ''نشیب'' عموماً دوسروں کے ہیں ''فراز'' خود لکھنے والے کے''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اس کتاب کی ایک دوسری کمزوری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ان کا خیال ہے کہ مصنف نے کہیں کہیں اپنے علم لسانیات کا غیر ضروری اظہار بھی کیا ہے اور جا بجا اپنے کلام کے چیدہ چیدہ نمونے بھی نقل کیے ہیں، مثلاً:

''کہیں کہیں انہوں نے اپنے لسانیات کے علم اور اپنی شاعری سے کتاب کو

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: ۱۶۲

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: ۱۶۴

گراں بار بنانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کوشش میں
کامیاب نہیں ہوئے۔اس طرح یہ کتاب آپ بیتی کے بجائے لسانی بحثوں کی
کھتونی بننے سے بال بال بچ گئی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے مختلف حیلوں بہانوں
سے اپنا تین چوتھائی کلام مختلف مقامات پر درج کیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی
میں نہ سہی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے''۔ [1]

مجموعی طور پر کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کو غیر جانبداری سے پیش کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے ''ورود، مسعود'' کو کامیاب آپ بیتی کہا ہے اور اسے بھرپور زندگی کی روداد قرار دیا ہے۔

بازگشت و بازیافت

''بازگشت و بازیافت'' ساقی فاروقی کے نثری مضامین کا مجموعہ ہے مشفق خواجہ کے مطابق اس میں چند تنقیدی مضامین، دو (۲) شخصی خاکوں کے علاوہ مراسلات بھی موجود ہیں مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ''باز گشت و بازیافت'' کی خوبی جدت اور تازگی کے علاوہ اسلوب و خیالات کی تازگی کی وجہ سے بھی ہے، آگے انھوں نے ساقی فاروقی کی متوازن تنقیدی رویے کی ستائش بھی کی ہے لکھتے ہیں:

''یہ مجموعہ عام تنقیدی مجموعوں سے یکسر مختلف ہے۔اس میں روایتی تنقید والی
کوئی بات نہیں، ساقی کو جہاں کوئی اچھی بات نظر آتی ہے دِل کھول کر اس کی داد
دیتے ہیں اور جہاں کوئی برائی دکھائی دیتی ہے اس کی مذمت بھی کشادہ دلی سے
کرتے ہیں''

آگے وہ ان کی جدید شاعری سے دلچسپی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس پر مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ساقی کا محبوب موضوع اردو کی جدید شاعری ہے جس کے مطالعے میں
انہوں نے ایک عمر صرف کی ہے۔یہی عمر کسی بہتر کام میں بھی صرف کی جاسکتی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۱۶۱

تھی۔لیکن اس صورت میں زیرِنظر کتاب وجود میں نہ آتی''۔ [1]

کھوئے ہوؤں کی جستجو

یہ تصنیف شہرت بخاری کی آپ بیتی ہے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ اس کتاب کا یہ نام موضوع کے لحاظ سے مکمل مناسبت رکھتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کے حوالے سے بعض اہم اور گمشدہ شخصیات کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی اس خامی پر طنز کیا ہے''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' یہ ضخیم کتاب یادوں اور یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔

> ''شہر بخاری نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں اور اپنے حوالے سے بعض شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔کتاب کا نام اُس کے موضوع سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔شہرت بخاری نے بعض گمشدہ شخصیات ہی کو نہیں، اپنے آپ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسروں کو تو کسی حد تک تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں لیکن اپنا سراغ نہیں لگا سکے۔شائد اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس جہت میں تلاش کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں''۔ [2]

آپ بیتی کا فن علیحدہ ہوتا ہے اور خاکہ نگاری کا لیکن شہرت بخاری نے اپنی آپ بیتی میں خاکہ نگاری کے فن سے زیادہ استفادہ کیا ہے جس پر مشفق خواجہ کو اعتراض ہے۔ چنانچہ وہ ان کی خامی کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں:

> ''بعض ابواب مکمل طور پر شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔یہی شخصی خاکے اِس کتاب کی جان ہیں۔کاش شہرت بخاری آپ بیتی کے چکر میں نہ پڑتے صرف شخصی خاکے لکھتے۔سید عابد علی عابد، یوسف ظفر، احسان دانش، ناصر کاظمی اور بعض غیر معروف لوگوں کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔اس

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۱۷۶

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۲۰۸۔

سے ان شخصیات کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔خصوصاً اپنے
گھریلو ملازم (مختار) کا جو خاکہ انہوں نے لکھا ہے اسے اردو کے اچھے شخصی
خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے''۔[1]

مشفق خواجہ نے جہاں اس کتاب کی خوبیوں کو سراہا ہے وہیں اس کے مواد کی بے ترتیبی کی خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کے مطابق اس کتاب میں واقعات کی تکرار بھی پائی جاتی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''شہرت بخاری نے یوں تو اس کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ذیلی
فصلیں بھی قائم کی ہیں لیکن مواد کے اعتبار سے کوئی خاص ترتیب نظر نہیں آتی۔
جو واقعہ جہاں یاد آیا، لکھ دیا اور اگر دوبارہ یاد آ گیا تو تب بھی لکھنے میں تکلف نہیں
کیا''۔ [2]

غالب ایک شاعر، ایک اداکار

مشفق خواجہ نے اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ انیس ناگی کی تنقیدی کتاب ہے جس میں انہوں غالب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور غالب کی زندگی و شخصیت پر مختلف اعتراضات کیے ہیں۔ مشفق خواجہ نے ان اعتراضات کو مہمل اور مضحکہ خیز قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ انیس ناگی کے بیانات کو اگر صحیح مان لیا جائے تو غالب گردن زدنی قرار پائے گا۔ انیس ناگی کے مطابق غالب میں دنیا کی ہر برائی موجود تھی۔ چنانچہ انیس ناگی کے ان بیانات کو اپنی تنقید کی گرفت میں لیتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''انیس ناگی کی دوسری کتاب ''غالب ایک شاعر ایک اداکر'' ہے۔ چھوٹے
چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں بڑے بڑے دعوے کیے گئے۔ غالب پر
جو کچھ لکھا گیا ہے انیس ناگی اسے سو ختنی قرار دیتے ہیں اور خود انیس ناگی نے جو
کچھ لکھا ہے اسے صحیح مان لیا جائے تو غالب گردن زدنی قرار پاتے ہیں۔ دنیا کی

---

[1] [2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:۲۰۹

> کوئی برائی ایسی نہیں جو غالب میں موجود نہ ہو..... اپنے آپ کو وہ کچھ سمجھنے لگتا ہے جو وہ نہیں ہوتا۔ اپنی تعریف مبالغہ آرائی سے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انیس ناگی نے سب سے بڑی دلیل یہ دی ہے کہ غالب نے اپنی کتاب ''پنج آہنگ'' کا منظوم اشتہار لکھ کر خود تشہیری جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ خود تشہیر اگر جرم ہے تو انیس ناگی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے عہد کے تقریباً تمام ادیب غالب سے بڑھ کر جرائم پیشہ ہیں۔ وہ اپنی تعریف میں خود ہی نہیں لکھتے، دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں اور اس قسم کی گمراہ کن تحریروں کو بڑے فخر سے اپنی کتابوں میں شامل کرتے ہیں''۔[1]

مشفق خواجہ کو بعض بے جا اعتراضات کرنے والے ادیبوں سے بھی سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ وہ ان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت ان کی اس خامی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ مختلف دلائل سے اس کی تفصیل سے وضاحت بھی پیش کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے مطابق انیس ناگی نے غالب پر اعتراضات کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ غالب کے اپنی بیوی سے تعلقات ناخوشگوار تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب دن بھر قلعہ معلی میں رہتے اور شام کو شراب پیتے اور دوستوں سے گپ بازی کرتے تھے۔ چنانچہ مشفق خواجہ انیس ناگی کے اس بیان پر اپنے فرضی کردار استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے یوں جواب دیتے ہیں ہے لکھتے ہیں:

> ''استاد لاغر مرادآبادی نے یہ سن کر فرمایا: ''یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ آج کل کے اکثر ادیب صبح سے شام تک دفتروں میں رہتے ہیں اور پھر رات کے ایک بجے تک پاک ٹی ہاؤس قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں کیا ان سب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ ان کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے''؟ استادِ گرامی کے اس سوال کا جواب انیس ناگی ہی دے سکتے ہیں۔ دو بڑوں کے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: ۲۱۴

درمیان بحث میں دخل دینے کی ہم جسارت نہیں کر سکتے"۔ [1]

مشفق خواجہ نے مصنف کے اعتراضات کے جوابات دینے کے علاوہ ان کی اس تصنیف میں موجود کتابت کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ دیباچہ نگار سعادت سعید کے املائی غلطیوں کی بھی نشاندی کی ہے۔

دوسفرنامے

اس تصنیف معروف نقاد اور انشائیہ نگار نظیر صدیقی ہیں مشفق خواجہ کے مطابق انہوں نے اس میں دوسفروں کی روداد بیان کی ہے پہلا سفر بمبئی اور کلکتے کا ہے جو 1950ء کی بات ہے دوسرا سفر 1980ء کا جس میں انہوں نے اسلام آباد سے لندن کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے ان سفرناموں میں ایسے بلاضرورت واقعات قلمبند کیے ہیں جس سے پڑھنے والے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پہلے سفرنامے کا خلاصہ لکھتے ہوئے وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں:

> "پہلے سفرنامے کا خلاصہ یہ ہے کہ ۷/اگست ۱۹۵۰ء کو پاکستانی وقت کے مطابق تین بجے دن بذریعہ ہوائی جہاز جناب مصنف ڈھاکے سے روانہ ہوئے اور اسی دن ہندوستانی وقت کے مطابق تین ہی بجے کلکتے پہنچ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان میں وقت کے آدھ گھنٹے کے فرق کی وجہ سے نظیر صدیقی کو یہ فائدہ ہوا کہ وقت صرف کیے بغیر سفر کا مرحلہ طے کرلیا۔ لیکن اس قسم کا کوئی فائدہ سفرنامہ پڑھنے والوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ انھیں کلکتے پہنچنے تک کی تفصیلات جاننے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے"۔ [2]

نظیر صدیقی نے اپنے سفرنامے بعض دلچسپ واقعات کا بیان کیا ہے۔ مشفق خواجہ نے ان واقعات کو بڑے شگفتہ اسلوب کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے خواتین کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشفق خواجہ نے ان کے ان "دوسفرنامے" پر لکھے گئے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: ۲۱۴

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: ۲۲۳

کالم کاعنوان ''سفرنامہ یا تذکرۃ النساء'' رکھا ہے۔انہوں نے ان سفرناموں کے مختلف اقتباسات نقل کرتے ہوئے ان پر نہایت پر لطف اور دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''لندن میں بھی یوسف خان کمبل پوش کی طرح نظیر صدیقی کی توجہ کا مرکز خواتین ہی تھیں ۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جن دنوں نظیر صدیقی لندن میں تھے وہاں کے سارے مرد یا تو کسی خوف کی وجہ سے گھروں میں دبکے بیٹھے رہتے تھے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے۔اسی لیے سفرنامے میں مردوں کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔لندن کی خواتین بڑی فراخ دِل اور متواضع تھیں۔ایک لفٹ میں بہت بھیڑ تھی۔ایک خاتون نظیر صاحب کے ساتھ کھڑی تھی۔نظیر صاحب نے کوئی جملہ کسا تو وہ کہنے لگی: ''تم بڑے شریر لڑکے ہو''۔نظیر صاحب اپنے لیے ''لڑکے'' کا لفظ سن کر بہت خوش ہوئے یہ واقعہ پڑھ کر ہمیں نظیر صاحب سے بھی زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ لندن کی خواتین کس درجہ مردم شناس ہیں''۔ [1]

شاخ ہری اور پیلے پھول

مشفق خواجہ کے مطابق یہ ڈاکٹر عالیہ امام کی آپ بیتی ہے۔اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے عالیہ امام کے اسلوب تحریر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق ان کا اسلوب آرائش اور تکلف سے عبارت ہے اور انہوں نے محاوروں کے ہاتھ پاؤں خوب توڑے ہیں ان کے مطابق عالیہ امام کی تحریر میں الفاظ کا بے جا اور بے محل استعمال دکھائی دیتا ہے۔مشفق خواجہ نے زیر مطالعہ آپ بیتی میں سے مثال کے طور پر چار جملے نقل کرتے ہوئے زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:225

''مزدور تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہو رہا تھا''۔

''آفتاب کی کرنیں بہت دور دور تک اپنی کرنوں کا جال پھیلا رہی تھیں''۔

''انہوں نے صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کی''۔

''اسلام کا تقدس بے معنی ہے اگر اقتدار چراغوں کی زد پر ہے''..... یہ جملے ڈاکٹر عالیہ امام کے ہیں جو ہم نے ان کی کتاب ''شاخ ہری اور پیلے پھول'' سے کشید کے ہیں.....ان چار جملوں کو محمد حسین آزاد کی زبان میں شہادت گاہِ اردو کے چار ستون سمجھنا چاہیے''۔ [1]

مشفق خواجہ نے ڈاکٹر عالیہ امام کے اسلوب تحریر کے ساتھ مواد پر بھی گفتگو کی ہے ان کا کہنا ہے کہ اس آپ بیتی میں غیر ضروری تفصیلات اور معلومات کی اس قدر بہتات ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاری کے صبر کا امتحان لیا جا رہا ہو۔ غیر ضروری تفصیلات اور معلومات کی نشاندہی کرتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''کتاب کا نام اگرچہ ''شاخ ہری اور پیلے پھول ہے لیکن یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ہری شاخ نظر نہیں آتی ہے نہ کوئی پیلا پھول ۔اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو غیر متعلق باتوں کا جھاڑ جھنکار۔ کہیں موسیقی کی تاریخ اس طرح بیان کی جا رہی ہے اگر پڑھنے والے کو موسیقی سے دلچسپی ہو تو یہ دلچسپی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے..... کتاب کا ایک بڑا حصہ یوم میر انیس، جشن مجنوں، جشن رئیس امروہوں اور پاک و ہند مشاعروں کی رودادوں کے لیے وقف کیا گیا ہے..... یہاں تک بھی معاملہ غنیمت ہے.....لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر محمود حسین کی ایک طویل تقریر نظر آئی جس کا موضوع میر انیس ہیں''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:214

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:236

عشرت فانی

یہ تصنیف عشر رحمانی کی آپ بیتی ہے جس کو عشر رحمانی نے ''معمولی سی سرگزشت'' کہا ہے۔ اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے اسے نہایت اہم تصنیف قرار دیتے ہیں لیکن کہیں کہیں جو غیر ضروری تفصیلات ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عشرت صاحب نے اپنی کتاب کو ''معمولی سی سرگزشت'' کہا ہے یہ محض انکسار ہے۔ بڑے سائز کے ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتاب کو کسی طرح بھی ''معمولی'' نہیں کہا جاسکتا۔ یہ غیر معمولی طور پر ضخیم کتاب ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ دلچسپ بھی ہے۔ اس میں رام پور کلکتہ، دلی، لکھنو، ڈھاکہ، کراچی، راولپنڈی اور لاہور میں گزارے ہوئے دنوں کی یادیں پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیتی ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک یکساں دلچسپی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اس میں بہت سے ادیبوں اور ریڈیو اور اسٹیج سے وابستہ افراد کا تذکرہ ہے بعض ادیبوں (امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، وغیرہ) کے بارے میں بڑی نادر معلومات ملتی ہیں۔ تقریباً پون صدی پر محیط اس داستان حیات میں ہر مذاق کے قاری کو اپنی دلچسپی کا سامان مل جاتا ہے۔ لیکن کہیں بے جا اجمل اور کہیں غیر ضروری تفصیل کھٹکتی ہے''۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مشفق خواجہ نے کتاب کو قاری کی دلچسپی کا مکمل سامان کہا ہے وہیں اس میں پیش کردہ چند غیر اہم معلومات غیر ضروری تفصیل اور تشریح پر بھی تنقید کی ہے۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ ایسے کئی غیر ضروری واقعات کی تفصیلات بیان کر کے کتاب کی ضخامت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ایک واقعہ کے حوالے سے وہ ان کی اس خامی کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> ''غیر ضروری تفصیلات سے کتاب کو ''گراں بار'' کرنے کی ایک مثال

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 254

ملاحظہ ہو۔ رسالہ ''شمع'' دہلی کے ادارے کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار ''آئینہ'' جاری کیا گیا تھا جس کے ایڈیٹر ظ۔انصاری تھے،عشرت صاحب نے ''آئینہ'' کے مالکان اور ظ۔انصاری کے اختلافات پر کئی صفحے ضائع کیے ہیں۔ عشرت صاحب کو یہ سب کچھ لکھتے ہوئے شاید یاد نہیں رہا کہ وہ آپ بیتی لکھ رہے ہیں نہ کہ ظ۔انصاری کی سوانح عمری''۔[1]

سرگزشت

یہ عبدالمجید سالک کی آپ بیتی ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ یہ آپ بیتی عام آپ بیتیوں سے ہٹ کر ہے اس آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آپ بیتیاں دروغ کو فروغ دینے کے لیے لکھی جاتی ہیں لہٰذا مشفق خواجہ کے نزدیک یہ آپ بیتی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے، اس کی اس خوبی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب تک ہماری نظر سے کسی صحافی کی آپ بیتی نہیں گزری تھی۔مولانا عبد المجید سالک کی ''سرگزشت'' ہم نے پڑھی ہے لیکن مولانا صرف صحافی نہیں تھے اور بہت کچھ بھی تھے۔اُن کی آپ بیتی کا بڑا حصہ اسی ''اور بہت کچھ'' کے حوالے سے ہے..... یہ آپ بیتی عام آپ بیتیوں سے مختلف ہے اور اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آپ بیتیاں دروغ کو فروغ دینے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اس آپ بیتی کے لکھنے والے نے بڑی بے دردی اور سفاکی سے اپنا کچا چھٹا بیان کیا ہے''۔[2]

مشفق خواجہ کے مطابق عبدالمجید سالک کی یہ آپ بیتی ان کی صحافتی زندگی کی داستان ہے لیکن انہوں نے کہیں کہیں اپنی نجی زندگی کے واقعات کو بھی پیش کرنے میں بے باکی اور حقیقت نگاری کا مظاہرہ کیا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:254

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:263

ہے یہاں آپ بیتی سے ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے ان کی بے باکی کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے ناشائستہ اور غیر اخلاقی الفاظ پر طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ویسے تو یہ موصوف کی صحافتی زندگی کی داستان ہے لیکن کہیں کہیں انہوں نے غیر صحافی حالات وواقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً اپنے والدہ بزرگوار کا نام بتائے بغیر ان کے اعلیٰ کردار کی تصویر کشی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے پریشان حال وعسرت کے باوجود دیانتدارانہ طور پر زندگی بسر کی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے: ''کبھی کبھی والد اور والدہ میں ایسی کمینوں کی طرح تو تکار ہو جاتی کہ مجھ کو ڈر ہوتا کہ کہیں واقعی مار پیٹ شروع نہ ہو جائے۔ پھر ڈر ہوتا کہ کہیں والد طلاق نہ دے دیں والدہ کو'' والدین کے طرز عمل کو کمینوں کے طور طریقوں سے تشبیہ دینا سعادت مندی نیز صحافتی حقیقت نگاری کی انتہا ہے''۔[1]

لمحے

مشفق خواجہ اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مولانا کوثر نیازی کا مجموعہ کلام ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس پر رئیس امروہی نے تبصرہ کرتے ہوئے اس کی رسم رونمائی میں کوثر نیازی کے اسلوب کو خوب سراہا تھا لیکن مشفق خواجہ کو اس سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے کوثر نیازی کے کلام کی بعض لفظی اور عروضی خامیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے استاد لاغر مرادآبادی کے حوالے سے ان کے اسلوب نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''پچھلے ہفتے اس مجموعے کی تقریب رونمائی ہوئی تھی جس میں رئیس امروہی نے فرمایا تھا: ''مولانا کوثر نیازی کو اپنی بات شعر میں کہنے اور الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے اور وہ انداز بیان کی نزاکتوں اور اسلوب کی تمام تر نفاستوں کے محرم راز ہیں''۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:263

حضرت رئیس کے اس بیان کی تصدیق مولانا کے اس مختصر دیباچے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے تازہ مجموعہ کلام پر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: ''اگر اسے فن کارانہ تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اردو شاعری کو بعض نئے اسلوب دینے کی کوشش کی ہے''۔ جناب رئیس اور مولانا نیازی کے بیانات پر جب ہم نے حضرت لاغر مرادآبدی سے تبصرہ کرنے کی گذارش کی تو انہوں نے فرمایا: ''دونوں ٹھیک کہتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے اردو شاعری کو اتنے اتنے اسالیب دیے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ کہیں وہ عروض اجتہاد فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں مصرعوں پر مصرعے خارج از آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ لفظوں کے تلفظ اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں، ساکن حرف کو متحرک اور متحرک کو ساکن کر دیتے ہیں۔ کہیں وہ قافیوں میں جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ چلی، گلی اور دھلی کا قافیہ ملی (ملی بھگت والا) باندھتے ہیں''۔[1]

اس رائے کے بعد وہ مولانا کوثر نیازی کے دو شعر نقل کر کے اس میں عروضی و لفظی خامیوں کی اس طرح نشاندہی کرتے ہیں، مثلاً:

''مرگیا ترا شاعر ترا کوثر نیازی
سونے سونے سے ہیں کیوں کوچہ و بازار ترے

پہلے مصرعے میں ''نیازی'' کو ''نازی'' پڑھا جائے تو وزن درست ہوگا، حالانکہ مولانا صاحب کا نازیوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا شعر یہ ہے

تم سے بڑھ کر ہوگا کوثر کون تمہارا دشمن اور
سالوں کی محنت کو پل بھر میں صفایا کر بیٹھے

سالوں کی محنت، اور صفایا کی داد کچھ رئیس امروہی ہی دے سکتے ہیں جن کے نزدیک اس شعر کے مصنف کو الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے''۔[2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:289

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:290

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ نہ صرف اچھے مبصر ہے بلکہ ایک معتدل ناقد بھی ہیں۔ ان کا یہ اقتباس عملی تنقید کی بہترین مثال ہے۔

اندھیری رات کا تنہا مسافر

''اندھیری رات کا تنہا مسافر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے بتایا کہ شہزاد منظر کا ناول ہے لیکن مشفق خواجہ کو اس تصنیف کے ناول ہونے پر اعتراض ہے، کیونکہ ان کے مطابق یہ ناول ضخامت کے اعتبار سے اتنا مختصر ہے کہ اسے ''ناول'' نہیں کہا جا سکتا بلکہ طویل افسانہ یا ناولٹ کہنا چاہئے: چنانچہ مشفق خواجہ اس ناول سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ناول کے شروع میں ۱۴ صفحات دیباچے کی نذر ہوئے ہیں اور آخری آٹھ صفحات میں مصنف کی ایک اور تصنیف ''جدید اردو افسانہ'' کے بارے میں مشاہیر کی رائیں درج کی گئی ہیں اگر ان چیزوں کو ناول کا حصہ نہ سمجھا جائے تو باقی ۱۲۲ صفحات رہ جاتے ہیں اور وہ بھی درسی سائز میں چھاپا جاتا تو اس کی ضخامت اِس کتاب کے ایک باب کے برابر ہوتی ہے۔اس بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہزاد منظر کی اس تصنیف لطیف کو ناول کہنا بڑی زیادتی ہے، اسے طویل مختصر افسانہ زیادہ سے زیادہ ناولٹ کہنا چاہیے'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق اس مختصر ناول کے تمام واقعات کلکتہ اور لند کے گرد گھومتے ہیں۔شہزاد منظر کو کبھی لندن جانے کا اتفاق نہیں ہوا انہوں نے اس ناول میں لندن کی معاشرت کو پیش کرنے کے لیے ''لندن'' سے متعلق لکھی گئی انگریزی، اردو، بنگلہ اور ہندی کتابوں سے مدد لی۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ لندن کے تعلق سے لکھنے کے لیے شہزاد منظر نے تاریخ اور جغرافیے کی کتابیں جس قدر پڑھیں اور با قاعدہ تحقیق کی کی بنا پر مشفق خواجہ نے کہا کہ انھیں محقق مان لینا چاہئے، لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:302

''اس ناول کے سارے واقعات کلکتہ اور لندن کے گرد گھومتے ہیں۔اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جناب مصنف کبھی لندن نہیں گئے اس لیے انہیں لندن کے پس منظر میں ناول لکھنے کا کوئی حق نہیں..... جب شہزاد منظر نے لندن نہیں دیکھا تو لندن کے پس منظر میں ناول کیسے لکھ لیا۔اس کا جواب خود شہزاز منظر نے ان الفاظ میں دیا ہے: ''میں نے اس بارے میں کافی تحقیق سے کام کیا ہے۔انگلستان خصوصاً لندن کے بارے میں انگریزی، اردو، بنگلہ اور ہندی میں جتنی کتابیں، سفرنامے، خودنوشت سوانح حیات اور یادداشتیں ملیں، پڑھ لیں۔ہندوستانی اور پاکستانی تارکین وطن سے ملاقاتیں کیں، اور جب کافی معلومات حاصل ہوگئی تو میں نے ناول لکھنا شروع کیا''۔

اب تک تو یہی سنا تھا کہ جب لوگ سفر کیے بغیر سفرنامے لکھتے ہیں تو غیر ممالک کے بارے میں کتابیں پڑھتے ہیں، شہزاد منظر پہلے مصنف ہیں جنہوں نے ناول لکھنے کے لیے اتنی بہت سی تاریخ اور جغرافیے کی کتابیں پڑھیں اور باقاعدہ تحقیق کی۔اس بنا پر ہماری تجویز یہ ہے کہ موصوف کو ناول نگار نہ سہی، محقق تو ضرور مان لینا چاہیے''۔

[1] خامہ بگوش کے قلم سے ''مرتب'' مظفر علی سید، ص: 309

دراصل مشفق خواجہ کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کو نظر میں رکھتے ہیں اور ایک کامیاب ناقد کی طرح جو فن پارہ اپنے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔اس کو وہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں سمجھتے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے طنزیہ انداز اختیار کیا اور مصنفین کی ان خامیوں کی اصلاح کی کوشش کی۔

مکرر کہے بغیر

اس کے مصنف منظر علی خاں ہیں۔منظر علی خاں نے اس کتاب کے تعلق سے کہا ہے کہ یہ انشائیے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 302

نہیں ہیں بلکہ مضامین اور شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔اس بات کوملحوظ رکھا کہ یہ کتاب ''شخصی خاکوں'' پر پوری نہیں اترتی۔ کیوں کہ مشفق خواجہ کسی بھی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اس کے فن کوذہن میں رکھ کرتبصرہ کرتے ہیں اور منظرعلی خان کے اس مجموعہ مضامین کی خامی کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں رقم طراز ہیں:

> ''مکرر کہے بغیر'' مضامین اور شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں خود مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ انشائیے نہیں ہیں ۔اگر اس دعوے کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوچنا پڑے گا کہ آخر یہ مضامین ہیں کیا۔(قاری اور مصنف میں سے کسی ایک کوتو سوچنا ہی چاہیے!)اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہم نے مضامین پڑھے،لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ کیونکہ یہ مضامین کسی سانچے یا واقعے کا سبب تو بن سکتے ہیں،نتیجہ نہیں ہوسکتے ۔بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین ہیں جنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ منظر صاحب نے شاعری چھوڑ کر نثر کی طرف جوتوجہ کی ہے اس سے شاعری اور نثر دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔شاعری کو یوں کہ اسے خراب کرنے والوں کی تعداد میں ایک کی کمی ہوگئی اور نثر کو یوں کہ اسے پامال کرنے والوں میں ایک کا اضافہ ہوگیا''۔[1]

مشفق خواجہ نے اس کتاب کی خامیوں کی نشاندہی کے بعد اس کے دیباچہ نگار وزیر آغا، اور مختار زمن کے پیش لفظ اور فلیپ نویس،شفیق الرحمٰن ،سید ضمیر جعفری،اور کرنل محمد کی تحریروں پر بھی پر لطف تبصرہ کرتے ہوئے طنز کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب پر ڈاکٹر وزیر آغا نے نہایت عالمانہ دیباچہ لکھا ہے جس کی وجہ سے کتاب میں علم کی جو کمی رہ گئی تھی اس کی تلافی بڑی عمدگی سے ہوجاتی ہے۔ مختار زمن صاحب نے بھی اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں پیش لفظ لکھا ہے۔جس کی خوبی یہ ہے کہ اسے اردو کی کسی بھی کتاب کے ساتھ بطور پیش لفظ شائع کیا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:315

جاسکتا ہے۔فلیپ پر موجودہ عہد کے تین بڑے مزاح نگاروں شفیق الرحمن، سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کی تحریریں ہیں، تینوں نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ مصنف کی تعریف کی ہے۔اتنی فراخ دلی کا تو سودا نے اپنی ہجویات میں بھی مظاہرہ نہیں کیا''۔[1]

ایک دِل ہزار داستان

یہ آغا اشرف کی آپ بیتی ہے۔مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ آغا اشرف نے اس میں اپنی داستان نہیں لکھی بلکہ اپنے دِل کی داستان بیان کی ہے۔نتیجہ میں یہ آپ بیتی عشقیہ ناولوں سے زیادہ دلچسپ بن گئی ہے۔ مشفق خواجہ نے اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے بڑے شائستہ لہجے میں اس کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے،فرماتے ہیں:

'' آغا اشرف کی آپ بیتی اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔آغا صاحب نے اپنی کم اور اپنے دل کی داستان زیادہ لکھی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کتاب کا ہیرو اُن کا دل ہے،اور خود آغا صاحب اپنے دل کے تابع مہمل کی حیثیت سے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ عشقیہ ناولوں سے زیادہ دلچسپ اور رومانی فلموں سے زیادہ سنسنی خیز اس کتاب میں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی تمنا میں بعض نوجوان اپنی زندگی اور جس کی حسرت میں بعض بوڑھے اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اس آپ بیتی پر تبصرہ کرتے ہوئے جس پہلو کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ آغا اشرف کی نقل نگاری یا سرقہ نویسی ہے مشفق خواجہ کے مطابق ''ایک دِل ہزار داستان'' میں بعض حصے یوسف حسین خان کی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' سے منقول میں جو ''ایک دل ہزار داستان'' سے بائیس (۲۲) سال پہلے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:316

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:330

1967ء میں شائع ہوئی تھی۔مثال کے طور پر انہوں نے دونوں آپ بیتیوں سے چار چار ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جو تقریباً حرف بہ حرف ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں مشفق خواجہ کا یہ بھی خیال ہے کہ کہیں کہیں آغا صاحب نے بعض جگہوں پر عبارت میں جزوی تبدیلیاں ضرور کی ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کا بیان صیغۂ حال میں ہے اور آغا اشرف کا صیغۂ ماضی میں، چنانچہ آغا اشرف کی اس سرقہ نویسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''.....آغا اشرف نے فرانس کی سیاحت سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہی کچھ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' میں بھی ہے۔یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی یعنی آغا اشرف کی کتاب سے پورے بائیس (۲۲) سال پہلے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۱۹۲۶ء میں فرانس گئے تھے،انہوں نے اس ملک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ لفظ بہ لفظ موجود ہے۔البتہ آغا صاحب نے کہیں کہیں کچھ الفاظ تبدیل کر دیے ہیں تا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی عبارت کے ''دستم'' دور ہو جائیں..... ڈاکٹر یوسف حسین خان کا بیان صیغۂ حال میں ہے اور آغا اشرف کا صیغۂ ماضی،.....اب یہ اہل تحقیق کا کام ہے کہ یہ معلوم کریں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے بائیس برس بعد لکھی جانے والی آغا صاحب کی کتاب سے کس طرح استفادہ کیا۔ڈاکٹر یوسف حسین خان بہت عالم فاضل آدمی تھے۔یقیناً ان کے پاس ایسا کوئی علم ہوگا جس کے ذریعے وہ مستقبل میں لکھی جانے والی کتابوں کے مطالب سے واقف ہو جاتے ہوں گے''۔[1]

مشفق خواجہ کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تبصرہ کرتے وقت نہ صرف فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں بلکہ اس کے مشمولات پر بھی ان کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ص:335

جنم کنڈلی

یہ فہیم اعظمی کا ناول ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق یہ پورا ناول ایک ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جس میں ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے اور ایک جملے کا دوسرے جملے سے بالکل تعلق نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے اپنے بے شمار پسندیدہ الفاظ کو ان کے معانی سے جدا کر کے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ لفظ و معنی کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن اس کتاب میں مشفق خواجہ کو یہ کمی نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ ان کی ان کمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جنم کنڈلی'' سے ۲۶۹ صفحوں میں ہمیں ایسی بات نظر نہیں آئی جس کی بناء پر اس کتاب کو ''تجرباتی ناول'' کہا جا سکے۔ البتہ ایک تبصرہ نگار کا وہ مشہور فقرہ ضرور یاد آیا جو اس نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا ''اس کتاب کے تمام ابواب ایک دوسرے سے مسلط ہیں اور یہ مصنف کا نہیں جلد سازی کا کمال ہے..... ''جنم کنڈلی'' پڑھنے کے بعد ہمیں تو کچھ ایسا محسوس ہوا۔ جیسے مصنف نے اپنے بے شمار پسندیدہ الفاظ کو ان کے معانی سے جدا کر کے اس کتاب میں جمع کر دیا ہو۔ جمیل الدین عالی نے کبھی کہا تھا..... ''لفظ و معنی ہوئے رو رو کے جدا میرے بعد'' ..... عالی صاحب کو خوش ہونا چاہئے کہ ان کی زندگی ہی میں ایک ایسی کتاب شائع ہو گئی ہے۔ جس میں لفظ و معنی کی جدائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔[1]

مشفق خواجہ نے اس ناول کے جس پہلو کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ مصنف کی فحاش گوئی اور عریانیت نگاری ہے۔ ان کے مطابق مصنف نے عریانی و فحاشی کے خیالات کو پیش کرنے کے لیے کسی علامت یا استعارے کا استعمال نہیں کیا بلکہ صاف اور واضح الفاظ میں ان خیالات کو بیان کیا ہے اور مرد و عورت کے کپڑوں کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ دراصل مشفق خواجہ ایک شائستہ اور با اخلاق انسان تھے اور وہ

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ۲۸۔

ادب میں بھی ان پہلوؤں کوملحوظ رکھنے پر زور دیتے ہیں یہی وجہ ہےانہوں اس ناول کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب کسی لانڈری کے رسیدوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> مصنف کوفحاشی وعریانی سے خاصی دلچسپی ہے۔اس کا کچھ اندازہ تو کتاب کے سرورق ہی سے ہوجاتا ہے۔سرورق میں استعمال کی گئی علامتوں کی تشریح کتاب کے ہر صفحہ پر ملتی ہےاور وہ بھی کھلےلفظوں میں فلیپ نگاروں نے کہا ہے کہ مصنف نے علامتی واستعاراتی انداز اختیار کیا ہےلیکن ہمارا خیال ہے کہ عریانی وفحاشی کے معاملات میں مصنف نے علامتوں اوراستعاروں کا لبادہ نہیں اوڑھا، ہر بات صاف صاف اور واضح الفاظ میں کہی گئی ہے۔افسوس کہ ہم مثالیں پیش نہیں کرسکتے،تاہم اس قدر ضرور کہیں گے کہ مردوں اورعورتوں کے کپڑوں کے حوالے سے جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے مصنف کے ذہن اور ذہنیت کوبا آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔صرف پتلون اتارنے اور زپ کھولنے کاذکر کم ازکم پچاس جگہ ملتا ہے۔عورتوں اورمردوں کے کپڑوں کاذکراس کثرت سے ملتا ہے کہ یہ کتاب کسی لانڈری کی رسیدوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے"۔ [1]

آخر میں مشفق خواجہ نے کتاب کے دیباچہ نگار انجم اعظمی کی سخن فہمی کوتنقید کانشانہ بناتے ہوئے اس کتاب کوعالم جنوں کی کیفیت میں وجود میں آنے والی تصنیف قرار دیا ہے۔

کیا قافلہ جاتا ہے:

اس تصنیف کے خالق نصراللہ خان ہیں یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔مشفق خواجہ کے مطابق اس میں کل 52 شخصیات کے خاکے ہیں جن میں ادیب، علما سیاست داں، موسیقاروغیرہ کوموضوع بنایا گیا ہے۔مشفق خواجہ کاخیال ہے کہ نصراللہ خاں نے ان خاکوں میں لفظوں کے ذریعہ مرقع کشی ہی نہیں کی بلکہ ان مرقعوں میں جان بھی ڈالی ہے غرض اس کتاب کی خوبیوں کوسراہتے ہوئے انہوں نے اس کوگزشتہ نصف

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،۲۹۔

صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں کا منظر نامہ قرار دیا ہے اس کے علاوہ ان کا کہنا ہے کہ ان شخصی خاکوں کے حوالے سے نصر اللہ کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ کتاب جگ بیتی کے ساتھ ساتھ آپ بیتی بھی ہے۔فرماتے ہیں:

> ''کیا قافلہ جاتا ہے'' جس میں باون شخصیات کی فلمی تصویریں ہیں۔ان میں علما بھی ہیں اور سیاسی دان بھی، ادیب بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ان سب کو خان صاحب نے اپنی یادوں کے حوالے سے دیکھا ہے اور ایک ایسی محفل آراستہ کی ہے، جس میں سبھی آشنا چہرے ہیں۔ پہلے ہم انھیں دور سے دیکھتے تھے اور اب قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ڈاکٹر وحید قریشی نے ٹھیک لکھا ہے''۔اگر یہ قافلہ رفتگان ہے لیکن اس قافلہ میں شامل سب لوگ اس کتاب کے صفحات میں جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔خان صاحب نے لفظوں سے مرقع کشی ہی نہیں کی ان مرقعوں میں جان بھی ڈالی ہے۔اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں گذشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں کے حوالے سے خود نصر اللہ خان کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ گویا یہ کتاب جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی''۔[1]

اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت بھی مشفق خواجہ کی نظر مذکورہ صنف کے فن پر رہی ہے۔ خاکہ نگار در اصل دوسروں کی زندگی کو پیش کرتے وقت کبھی کبھی اپنے شخصیت کا بھی بیان کرتا ہے۔اس کتاب میں بھی مشفق خو کو یہ خصوصیت نظر آئی جس کا ذکر انہوں نے اس اقتباس میں کیا ہے۔

جدید اردو غزل: ایک مطالعہ:

اس کتاب کے مصنف غزل گو شاعر نظیر صدیقی ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق نظیر صدیقی صرف

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ۲۹۔

غزل گوشاعر ہی نہیں بلکہ غزل کے نقاد بھی ہیں زیر مطالعہ کتاب میں نظیر صدیقی کے چار تنقیدی مضامین ہیں جو مختلف اوقات ہی میں نہیں، بلکہ مختلف ذہنی کیفیات میں لکھے گئے ہیں جس میں مصنف نے اپنے بعض بیانات کی تردید بھی خود ہی کردی ہے۔

مشفق خواجہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جس پہلو پر روشنی ڈالی ہے وہ مصنف کا معیار انتخابِ شعراء ہے ان کا کہنا ہے کہ مصنف نے جدید اردو غزل کے شعراء اور ان کے کلام کے انتخاب کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ قدیم تذکرہ نگاروں کی طرح بالکل سطحی انداز کا ہے ان کی اس خامی پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں لکھتے ہیں:

> کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم قدیم زمانے کا کوئی تذکرۂ شعرا پڑھ رہے ہیں۔ پرانے تذکرہ نگاروں کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب وہ کسی شاعر کا نام اور اس کا ایک آدھ شعر سن لیتے تھے تو فوراً اسے شاملِ تذکرہ کر لیتے تھے۔ نظیری صدیقی کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انھیں کسی رسالے میں نجمہ تصدق اور امتہ الرؤف نسرین کا کلام نظر آیا۔ انھوں نے فوراً ناموں کو نوٹ کیا۔ نسرین کے اس قسم کے شعر انھوں نے انتخاب میں شامل کیے ہیں
>
> دیکھیے اب نہ یاد آیئے آپ
>
> آج کل آپ سے خفا ہوں میں
>
> اور پھر اس قسم کے شعروں پر یہ فیصلہ صادر کیا ہے: ''غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نسرین اردو کی دو تین بہترین شاعرات میں سے ہیں''۔ نظیر صدیقی کی جگہ اگر ہم ہوتے تو ''غالباً'' کے بجائے ''یقیناً'' لکھتے اور دو تین شاعرات والی بات بھی حذف کر دیتے کہ اردو کو اگر ایک ہی بہترین شاعرہ مل جائے تو بہت ہے۔[1]

مشفق خواجہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ہجو ملیح سے کام لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ مصنف نے

---

[1] ہائے گسترانہ مرتب، ۱۱۸۔

جدید اردو غزل کے شعراء کے انتخاب میں کسی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا اپنے عہد کے ہر اچھے برے شاعر کو اس میں شامل کیا ہے تا کہ کسی کو اس بات کی شکایت نہ رہے کہ اس کا نام اس میں نہیں آیا۔ لہذا اسی امر کی بناء پر مشفق خواجہ اس کتاب کے نام پر اعتراض کرتے ہوئے اس کا نام جدید اردو غزل ''ایک مطالعہ کی بجائے ''جدید اردو غزل: ایک اشاریہ'' تجویز کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> زیر نظر کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جناب مصنف نے اپنے عہد کے اچھے برے ہر طرح کے شاعروں کو بڑی خوبصورتی سے ٹانک دیا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کوئی اس کتاب میں بار پانے کا مستحق ہے یا نہیں، بس اس سے سروکار ہے کہ کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کا نام کتاب میں نہیں آیا۔ اس بناء پر کتاب کا نام ''جدید اردو غزل: ایک مطالعہ'' کی بجائے ''جدید اردو غزل۔ ایک اشاریہ'' ہوتا تو اچھا تھا'' [1]

شمع اور دریچہ:

یہ تصنیف محمد ابن الحسن سید کی ہے جو مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق اس کا موضوع مبہم ہے اور اس پر ہر مضمون میں اس کثرت سے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ کتاب کا مرکزی موضوع قاری کی گرفت کے باہر ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ مشفق خواجہ یہ بھی بتایا کہ ابہام کی کیفیت یہ کتاب کے علاوہ اس کے دیباچہ میں بھی پائی جاتی ہے مکمل دیباچہ پڑھنے کے بعد بھی یہ راز نہیں کھلتا کہ آخر کار اس دیباچہ میں کتاب کے موضوع کو لے کر کیا بحث کی گئی ہے چنانچہ مشفق خواجہ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اس کے موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ پوچھا جائے کہ زیر بحث کتاب کا موضوع کیا ہے تو اس کا جواب ہم تو کیا، شاید، جناب مصنف بھی نہ دے سکیں۔ کہنے کو تو یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، لیکن ہر مضمون میں اس کثرت سے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ۲۸۔

ہے کہ مرکزی موضوع ہاتھ نہیں آتا۔مثلاً دیباچے ہی کو لیجیے۔اس کے آخر میں کاتب وغیرہ کا شکریہ ادا ضرور کیا گیا ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ اس طویل تحریر کو دیباچہ کا نام دیا جائے۔اس میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد کا تذکرہ ہے۔ان لوگوں کا ذکر ہے جو لمبے لمبے نام رکھتے ہیں (اور محمد ابن الحسن سید جیسے مختصر چہار لفظی نام نہیں رکھتے) ڈھاکے اور اسلام آباد کی یاد دیں ہیں۔یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دیباچہ ان سب میں سے کس کی خاطر لکھا گیا ہے''[1]

یادوں کا جشن:

''یادوں کا جشن'' کنور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی ہے، مشفق خواجہ نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ ''یادوں کا جشن'' میں جوش کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' جیسے گرما گرم لطیفے خاصی تعداد میں ہیں، ان کے مطابق یہ مماثلت صرف گرم لطیفوں کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ خود جوش کی ذات بھی ان دونوں آپ بیتیوں کا مشترکہ عنصر ہے چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

''.....اس میں جوش صاحب کی ''یادوں کی برأت'' جیسے گرما گرم لطیفے خاصی تعداد میں ہیں..... کنور مہندر سنگھ بیدی اور جوش ملیح آبادی کی آپ بیتیوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ صرف گرما گرم لطیفوں کی حد تک نہیں ہے، بلکہ خود جوش صاحب کی ذات بھی دونوں آپ بیتیوں میں مشترک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کنور صاحب نے جوش صاحب کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔شاید دوران تحریر انہیں یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے بارے میں کتاب لکھ رہے ہیں یا جوش صاحب کے بارے میں۔اگر جوش صاحب سے متعلق تمام حصوں کو الگ کر لیا جائے تو ایک اور یادوں کی برأت تیار ہو سکتی ہے''۔ [2]

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ۱۳۸۔

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص: ۲۳۰

مشفق خواجہ نے جہاں خامیوں کی نشاندہی کی ہے وہیں غیر جانبداری سے اس کتاب میں جو خوبیاں نظر آئیں ان کی ستائش بھی کی ہے۔انہوں نے اس کی خصوصیت کا بھی احاطہ کرتے ہوئے بتایا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے اس آپ بیتی میں واقعات کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے خاص کر جن شخصیات کے شخصی خاکے قلمبند کیے ہیں ان میں جان ڈال دی ہے۔آپ بیتی کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کنور صاحب کو جو لوگ ذاتی طور پر جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ موصوف باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت ان کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے۔جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں یا کسی کا شخصی خاکہ لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتاب نہیں پڑھ رہے۔سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں''۔ [1]

کرشن بھی کر گیا

مشفق خواجہ نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کتاب پاکستان کے ایک نقاد ڈاکٹر محمد حسین کی ہے۔جس میں مصنف نے قیام بمبئی کی یادیں قلمبند کی ہیں۔مشفق خواجہ کے مطابق مصنف نے اس میں سات برسوں کی یادیں جمع کی ہے، اس یادنویسی کا کام مصنف نے ۹/ مارچ ۱۹۷۷ء تک یاداشت پر مبنی پورے پونے چار سو صفحات پر مکمل کیا۔مشفق خواجہ نے اس کتاب کی جن خامیوں پر اظہار خیال کیا وہ اس میں بیان کردہ واقعات کی بے ترتیبی ہے۔ان کا خیال ہے کہ مصنف نے بمبئی کے سات سالہ قیام کی یادوں کو بیان کرنے میں نہ کسی تاریخ کو پیش نظر رکھا ہے اور نہ واقعات کی ترتیب کو۔بس جو واقعہ جہاں یاد آیا اس کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ان خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''بمبئی کے ہفت سالہ قیام کی یادیں بغیر کسی ترتیب کے مصنف کے ذہن میں آئیں اور پھر اسی بے ترتیبی سے کاغذ پر منتقل کر دی گئیں۔پونے چار سو صفحات کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:۲۳۱

اور نہ کسی تاریخی یا واقعاتی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بات سے بات اس طرح نکلتی ہے۔ جس طرح کلاشنکوف سے گولیاں۔ سردار جعفری اور سلطانہ جعفری کے معاشقے کا ذکر کرتے کرتے علامہ اقبال کی شاعری کے اوصاف بیان کر دیے جاتے ہیں۔ جیسے یہ شاعری بھی انہیں مخصوص حالات کا نتیجہ ہو۔ اختر الایمان کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے کہ لڑکیوں کا پیچھا کس طرح کرتے تھے، ٹیگور کی گیتانجلی کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ بنگال میں نہیں بہار میں لکھی گئی تھی۔ مسعود پرویز کے ایک رومان کی تفصیل کے ضمن میں تذکرہ آجاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے مصنف کے گلے پر چھری رکھ کر ان سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت کے فارم پر دستخط کرا لیے تھے"۔ [1]

مشفق خواجہ مصنف کی اس خامی پر بھی روشنی ڈالی کہ انہوں نے اپنی اس یادداشت میں بے شمار بڑی شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے لیکن اظہار میں ادب و احترام کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اپنے بزرگ ادیبوں کے اظہار میں بھی تکلفی برتی ہے، جیسے جوش وغیرہ کے تعلق سے بے تکلفی کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "مصنف نے بے شمار شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جوش صاحب پر تو انہوں نے صفحوں کے صفحے سیاہ کیے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہوں نے جوش صاحب کے کردار کو بھی سیاہ کر ڈالا ہے۔ جناب مصنف اور حضرت جوش کی عمروں میں دو چار سال کا نہیں ۳۰/۳۵ سال کا فرق تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے کتاب کے ہر چوتھے صفحے پر جوش صاحب کو اس طرح ڈانٹا ہے۔ جیسے کوئی بزرگ کسی خرد کو ڈانٹتا ہے، مثلاً ایک جگہ انہوں نے جوش صاحب کو

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:۳۲۸

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے ''تم بدنصیب ہو۔تم اپنی قدروں کو دوسروں پر مسلط کرنے کی غیر شریفانہ حرکت کے عادی ہو چکے ہو۔شراب نوشی کو تم ایک مجرمانہ فعل بنالیا ہے.....تم اس لائق نہیں،جس دعوت میں گھریلو عورتیں شریک ہوں اس میں تم کو مدعو کرلیا جائے''۔ [1]

کمان اور زخم

''کمان اور زخم''، فضیل جعفری کی تنقیدی کتاب ہے مشفق خواجہ نے کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ اس میں مصنف نے ۱۹۶۰ء کے بعد کی جدید تنقید کا جائزہ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ کتاب کوئی ''تاریخ تنقید''قسم کی چیز نہیں ہے جس میں صرف نقادوں کی مردم شماری کی گئی ہو، بلکہ مصنف نے گزشتہ چوتھائی صدی کے اہم ترین نقادوں کو موضوع بحث بنایا ہے جیسے ابتداء میں جدید تنقید کے پیشروں میں، فراق،کلیم الدین احمد،میراجی اور محمد حسن عسکری۔اس کے بعد باقر مہدی،وارث علوی،سلیم احمد،ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا ہے۔

مشفق خواجہ کے خیال میں اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے ہر طرح کے شخصی اور نظریاتی تعصّبات سے بلند ہو کر غیر جانبداری سے جدید اردو تنقید کے خدوخال کو اجاگر کیا ہے اور ان تمام رجحانات کی نشاندہی کی ہے جو گزشتہ چوتھائی صدی میں ہماری تنقید پر غالب رہے ہیں۔اس کتاب کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کی سب سے پہلی اور بڑی خوبی یہ ہے کہ فضل جعفری نے پہلے سے یہ طے نہیں کیا کہ انہیں کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔انہوں نے ہر طرح کے شخصی اور نظریاتی تعصّبات سے بلند ہو کر جدید اردو تنقید کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔جہاں کوئی معقول اور اچھی بات نظر آتی ہے۔اس کی تعریف کی ہے اور جہاں غلطیاں یا غلط کاریاں نظر آئی ہیں،ان کی مذمت کی ہے۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:۳۲۹

تعریف بھی مدلل ہے اور مذمت بھی مدلل ،لیکن فضیل جعفری کا اصل مقصد تعریف یا مذمت نہیں، بلکہ ان رجحانات کی نشان دہی ہے۔ جوگزشتہ چوتھائی صدی میں ہماری تنقید کے غالب رجحانات رہے ہیں۔ظاہر ہے،اس مقصد کے لیے اہم نقادوں ہی کوموضوع بنا کر بحث کی جاسکتی تھی،سوفصیل جعفری نے یہ کام کیااورنہایت خوش اسلوبی کے ساتھ۔فصیل جعفری کی باخبری کا یہ عالم ہے کہ گزشتہ چوتھائی صدی کی تمام تنقیدی تحریریں،اہم ہوں یا غیراہم،ان کی نظر میں ہیں''۔ [1]

مشفق خواجہ نے جہاں کسی کتاب میں کوئی خوبی دکھائی دی اس کی دل کھول کرستائش کی اور جہاں کوئی خامی دکھائی دی اسے بھی شائستہ انداز میں بھرپورطنز کیا ہے۔غیر جانبداری ان کے تبصروں کی خصوصیت ہے۔

چراغ سے چراغ

یہ شاہد الوری کے قطعات کا مجموعہ ہے مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ شاہد الوری نے اپنے ان قطعات میں غالب کے ایک مصرع پر اپنے تین مصرعے لگا کر قطعات کہے۔شاہد الوری کی اس قطعات گوئی پر''غالبؔ پر بعد از وفات قاتلانہ حملے'' کے عنوان سے کالم لکھ کر مشفق خواجہ نے انہیں ''مصرعوں کا شاعر'' کہا ہے اور فرماتے ہیں کہ یہ غالب کے مصرعوں پر اس طرح مصرعے لگاتے ہیں جس طرح مارش لاء کے زمانے میں کوڑے لگائے جاتے تھے۔چنانچہ شاہد الوریؔ کی اس قطعات گوئی پر یوں تبصرہ کیا ہے،لکھتے ہیں:

''ہم نے شاہد الوری کومصرعوں کا شاعر کہا ہے۔شعروں کا نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ''چراغ سے چراغ'' میں انہوں نے غالبؔ کے مصرعے لگائے ہیں، بالکل اسی طرح ،جس طرح مارشل لاء کے زمانے میں کوڑے لگائے جاتے تھے۔ایک مصرع غالبؔ کا ہےاور تین مصرعے شاہد الوری کے۔پوری کتاب

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:۳۳۸

میں سو قطعے ہیں۔ گویا سو مصرعے غالبؔ کے ہیں اور تین سو شاہد صاحب کے، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب میں شامل ایک چوتھائی کلام نہایت اعلیٰ معیار کا ہے۔ باقی تین چوتھائی کلام کے بارے میں ہمارا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی کیوں کہ یہ کلام شاہد الوری کا طبع زاد ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے اگر دو چار مثالیں پیش کر دی جائیں تو نا مناسب نہ ہوگا۔ غالبؔ کا شعر ہے: ؎

''سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

شاہد الوری فرماتے ہیں:

تحسین کی ہوس نہ تمنا ہے داد کی
''کیا خوب'' اور ''واہ'' کی حسرت نہیں مجھے
میرا یہ شوق کچھ نہیں جز خدمت ادب
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

جناب شاہد الوری نے غالبؔ کے مصرعے کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ غالبؔ شاعری کو اس لیے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں اپنے خاندانی پیشے سپہ گری پر فخر تھا، شاہد الوری کسی خاندانی پیشے پر فخر کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ ادب کی خدمت کے جذبے میں سرشار ہو کر شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے''۔ [1]

اقتباسات قدرے طویل ہو گئے ہیں لیکن مشفق خواجہ کی یہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ اپنی بات مدلل پیش کرتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مثال کو مکمل طور پر دی جائے تا کہ بات پوری طرح سمجھ میں آ سکے۔

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ان قطعات میں غالبؔ کا ایک مصرعہ شاہد الوری کے تین مصروعوں کے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص: ۳۵۳، ۳۵۴

بوجھ تلے دب گیا ہے، کہتے ہیں:

''اس کتاب میں کوئی قطعہ ایسا نہیں، جس میں غالبؔ کا ایک مصرع شاہد الوری کے تین مصرعوں کے بوجھ تلے دب کر نہ رہ گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے مصرعے غالبؔ کے دیوان ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ انہیں دیوان سے الگ کر کے اور ''چراغ سے چراغ'' میں شامل کر کے پڑھا جائے تو غالبؔ کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ شاہد الوری نے اپنی کتاب کا نام ''چراغ سے چراغ'' رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ انہوں نے غالبؔ کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا چراغ تو جلالیا لیکن غالبؔ کا چراغ گل کردیا''۔[1]

مذکورہ اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مشفق خواجہ چوں کہ بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں اس لیے ان کے یہاں تبصرہ میں یہ خوبی نظر آتی ہے۔

غالب کے کرشمے

یہ افتخار احمد عدنی کی تنقیدی کتاب ہے جس کا موضوع غالب کی شاعری ہے مشفق خواجہ نے مصنف اور کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ تصنیف غالبیات میں ایک منفرد اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں غالب کی شاعری پر کوئی روایتی انداز میں تنقید نہیں کی گئی بلکہ مصنف نے اک مدرس نقاد کی طرح طلبہ کی نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر غالب کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ عدنی صاحب کی کتاب غالب کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد اضافہ ہے منفرد ان معنوں میں کہ یہ کوئی روایتی تنقید کی کتاب نہیں ہے جس میں منشیانِ تنقید کی طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے غالب

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص: ۳۵۵

کی شاعری کی خصوصیات نمبروار بیان کی گئی ہوں یا مدرس نقادوں کے انداز میں غالب کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئی ہوں جنہیں پڑھ کر طلبہ کی نصابی ضروریات پوری ہوسکیں۔ بلکہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ غالب کی شاعری ہماری زندگی میں کس کس طرح اور کن کن مرحلوں میں ہمارا ساتھ دیتی ہے.....! اور کتاب کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ غالب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کیا کیا فائدے ہیں۔ غالب روزمرہ زندگی کے عام حالات ہی میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا بلکہ مشکل سے مشکل لمحات میں بھی ثابت قدم رہنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ گویا غالب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے''۔[1]

تیرتوں کی سرزمین

مشفق خواجہ نے ''تیرتوں کی سرزمین'' کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ محسن بھوپالی کا سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے قیام امریکہ کی روداد بیان کی ہے۔ ان کے مطابق محسن بھوپالی نے دیباچہ میں اس سفرنامہ کے تعلق سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''اس سفرنامے کو '' آپ عام سفرناموں سے ہٹ کر پائیں گے۔ اس میں آپ کو نہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ملیں گی، نہ تجارت و معاشیات کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور نہ ہی دوران سفر کسی نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے مکالمے اور بعد میں معاشقے کو داستان نظر آئے گی''، مشفق خواجہ مصنف کی ان تمام باتوں سے اتفاق رکھتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس سفرنامہ میں ایک گورکھ دھندا ضرور ملتا ہے اور وہ ہے مشاعروں کا دھندا۔ چنانچہ اس سفرنامہ میں بیان کردہ مشاعروں کی روداد پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے ہٹ کر ہی نہیں بلکہ بہت پرے ہٹ کر لکھا گیا ہے اس میں واقعی کوئی گورکھ دھندا نہیں ہے۔ لیکن ایک خاص نوعیت کا دھندا

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:۴۶

ضرور ملتا ہے اور وہ ہے مشاعروں کا دھندا، ہر تیسرے صفحے پر کسی مشاعرے یا شعری نشست کی روداد نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں سوائے مشاعرے بازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ اس مشاعرے بازی کے باوجود امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اور ہم نے اپنی ساری طاقت مشاعروں میں ضائع کر دی، بلکہ بہت سے شاعر بھی ضائع کر دیے کہ وہ سال میں آٹھ مہینے امریکہ میں مشاعرے پڑھتے ہیں اور ایسے سخن شناسوں کے مہمان بنتے ہیں جو ہمارے شاعروں کے ناموں سے بھی واقف نہیں'' [1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ اس سفرنامہ میں مشاعروں کے علاوہ مختلف دعوتوں اور انواع اقسام کے کھانوں کا ذکر بھی کثرت سے آیا ہے۔ اور ہر قسم کے کھانے پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''اس سفرنامے کی تعریف کے لیے اگر صرف ایک لفظ استعمال کرنے کی پابندی لگا دی جائے تو وہ سوائے ''لذیذ'' کے کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا۔ دعوتوں اور انواع اقسام کے کھانوں کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ مصنف کے حافظے اور ہاضمے دونوں کی داد دینی پڑتی ہے انہوں نے امریکہ میں قیام کے دوران جس دسترخوان سے جو فیض اٹھایا، اس کی تفصیل کتاب میں موجود ہے۔ جن کھانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر میزبانوں سے پوچھ کر ان کے پکانے کی ترکیبیں بھی لکھ دی جاتیں تو یہ سفرنامہ گھریلو خواتین کے کام بھی آ سکتا تھا''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اس کتاب کی خامیوں پر اظہار خیال کرتے وقت نہ صرف مزاح کی چاشنی سے کام لیا ہے بلکہ طنز کا بھرپور وار بھی کیا ہے ان کا خیال ہے کہ سفرنامہ کی جو خصوصیات ہوتی ہے مصنف کو ان کو ملحوظ رکھنا چاہئے کیوں کہ ہر فن کا اپنا تقاضہ ہوتا ہے اگر وہ فن پارہ اس تقاضے کو پورا نہیں کرتا تو وہ تخلیق کا حق ادا نہیں کر رہا ہے اسی لیے وہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خامیوں کی طرف اشارے کرتے ہیں۔

---

[1] [2] سخن ہائے گسترانہ، ص:۱۷

یادخزانہ

اس تصنیف کے خالق جمیل زبیری ہیں مشفق خواجہ کے مطابق جمیل زبیری نے اس کتاب میں ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی کے ۲۵ برسوں کی یادوں کو قلمبند کیا ہے۔اس کتاب کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مشفق خواجہ کو بتاتے ہیں کہ جمیل زبیری نے اپنے گزرے ہوئے لمحوں کی خوش گوار یادوں سے اپنے حال و مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ مشفق خواجہ کی نظر میں اس کتاب کا سب سے نمایاں وصف خواتین کے ذکر کی بہتات ہے جس کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کا نام ''یادخزانہ'' کے بجائے ''تذکرۃ الخواتین'' بھی ہوسکتا ہے۔فرماتے ہیں:

> ''اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں خواتین کا تذکرہ بڑی کثرت اور فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ ہر دوسرے صفحے پر کوئی نہ کوئی خاتون جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ڈراما آرٹسٹ ''صدا بہار'' نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی گلوکارہ آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ کہیں کوئی شاعرہ شاعری کا موضوع بنی ہوئی ہے اور کہیں کوئی افسانہ نگار حقیقتوں کو افسانہ بنا رہی ہے۔ان سب کے بارے میں جمیل زبیری نے دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہیں اور ان کے فن اور ناک رقشے پر فکر انگیز تبصرے بھی کیے ہیں اس مناسبت سے کتاب کا نام ''یادخزانہ'' کی بجائے ''تذکرۃ الخواتین'' بھی ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں ایسی کتابیں ایسے ہی ناموں سے لکھی جاتی تھیں۔ہم نے یہ بات اعتراضاً نہیں، جذبہ ممنویت کے تحت کہی ہے۔ کیوں کہ کتاب کے مطالعے سے پہلے کئی معروف ''خواتین'' کے بارے میں بہت سی غیر معروف تفصیلات کا ہمیں علم نہ تھا۔ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جناب مصنف کے ماضی کی یادیں، پڑھنے والوں کے مستقبل کو بھی خوش گوار بناتی رہیں گی''۔[1]

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:۱۰۰

اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت بھی مشفق خواجہ نے غیر ضروری تفصیلات کو قلم بند کرنے پر طنز کیا ہے۔

دلی دور نہیں

یہ ڈاکٹر انوار سدید کا سفر نامہ ہے مشفق خواجہ کے مطابق ڈاکٹر انوار سدید کو ۱۹۸۸ء میں دلی میں غالب سمینار کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا چنانچہ انوار سدید نے دلی میں قیام کے چند روز بعد اپنی خوش گوار یادوں کو سفر نامے کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ کسی بھی سفر نامہ کی روداد میں متعلقہ ملک یا شہر کی تاریخ ،ثقافت اور آثار قدیمہ کے علاوہ متعلقہ ملک یا شہر کی متفرق خصوصیات کا ذکر عام بات ہے چنانچہ مشفق خواجہ کو بھی ڈاکٹر انوار سدید کے اس سفر نامہ سے یہی توقع تھی انھیں اس میں وہ خصوصیت نظر نہیں آتی ہے۔ اس سفر نامہ میں ،تاریخ ،ثقافت ،اور دیگر خصوصیات کے سلسلے میں موضوع کی مناسبت سے فقرہ کستے ہوئے لکھتے ہیں اس کتاب میں ''دلی دور دور تک'' بھی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا انوار سدید کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''دلی کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں بہت سے سیاحوں نے اس شہر بے مثال کے سفر نامے لکھے ہیں اور بہت سے محققوں اور مؤرخوں نے دلی کی تاریخ ،ثقافت اور آثار قدیمہ کو موضوع بنا کر داد تحقیق دی ہے لیکن دلی کے بارے میں جیسی کتاب ڈاکٹر انوار سدید نے لکھی ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں دلی دور نہ ہونے کے باوجود دور دور تک نظر نہیں آتی..... ہمیں ان سے توقع تھی کہ وہ یہ بتائیں گے کہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کا کیا حال ہے، یہ تہذیبی مرکز پہلے کی طرح اب بھی آباد ہے یا اجڑ چکا ہے۔ پرانا قلعہ، قطب مینار اور مقبرہ ہمایوں اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں یا ان کی جگہ جدید طرز کی عمارتیں بن چکی ہیں۔ چاندنی

چوک کی چہل پہل ویسی ہی ہے۔جیسی بارگاہ قلی خاں نے اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں دیکھی تھی اور جس کی تفصیل اس کی کتاب ''مرقع دہلی'' میں ملتی ہے،یا اس رونق میں کچھ فرق آ گیا ہے حد تو ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دلی میں رہ کر اردو کے بزرگ شاعر آنند نرائن ملا سے بھی ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی،یہ وہی تاریخی بزرگ ہیں۔جنھوں نے اعلان کیا تھا کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اردو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ڈاکٹر انوار سدید نے دلی میں جن ادیبوں سے ملاقات کی،ان میں سے اکثر وہ تھے جن سے وہ پاکستان میں مل چکے تھے یا پھر وہ ''ادیب'' تھے جن کے دلی میں موجود ہونے کا خود دلی والوں کو بھی علم نہیں تھا''۔ [1]

مشفق خواجہ نے انور سدید کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے سفرنامے لکھنے کے لیے تاریخ ثقافت اور دیگر پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے کو ضروری خیال کیا اور ان کی کتاب میں اس خصوصیت کی عدم موجودگی کی نشاندہی کر کے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ سفرنامہ ایک کامیاب سفرنامہ نہیں ہے۔اس اقتباس سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ کو نہ صرف زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل ہے اور مطالعے کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے انھیں ہر طرح کے موضوعات پر دسترس حاصل ہے۔ان کی نظر گہری ہے وہ ادب اور ادب کی صورتحال پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور جب کسی فن پارے میں انھیں کوئی کمی نظر آتی ہے تو وہ اس کی ضرور نشاندہی کرتے ہیں۔

غرض اردو کی ادبی کتابوں پر اس طرح کے بے شمار تبصرے مشفق خواجہ کے کالموں میں بکھرے پڑے ہیں مذکورہ تمام تبصرے ''عملی تنقید'' کے اعلیٰ نمونے ہیں ان تمام تبصروں کے مطالعہ سے ہماری ملاقات ایک ایسے مبصر اور نقاد سے ہوتی ہے جس کا تنقیدی شعور بہت پختہ اور قومی ہے اور جس کی بالغ نظری اور انصاف پسندی مسلمہ ہے۔مشفق خواجہ ان تمام تبصروں میں اپنے تنقیدی فیصلے اور آراء کو تحقیق کی روشنی میں

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:۱۱۲

پیش کرتے ہیں، سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے تنقید و تحقیق کے اس سنجیدہ عمل کو طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں پیش کیا ہے اور یہی ان کی تبصرہ نگاری کا کمال ہے ان کی ان خصوصیات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہ مشفق خواجہ اپنے عہد کے تبصرہ نگاروں میں منفرد امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

ادبی اجلاس

ادبی اجلاس ہمارے ادب کی سماجی سرگرمیاں کا ایک اہم عنصر ہے ان ادبی اجلاس سے ارباب ادب میں اجتماعیت کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے اور ان اجلاس سے علمی و ادبی قدریں فروغ پاتی ہیں۔ ادبی اجلاس کئی نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے کتاب کی رونمائی، رسائل کی اشاعت، مشاعرے، سیمینار، ادیبوں کے جشن اور ان کی سالگرہ پر منعقد ہونے والی ادبی محفلیں وغیرہ۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں ادیبوں کے جشن اور ان کی سالگرہ پر منعقد ہونے والی محفلوں اور ان نوعیت کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔

کسی ادیب کی سالگرہ منانے کا طریقہ اردو دنیا میں یہ ہو گیا ہے کہ اخبارات اور رسائل میں ان کے گوشے شائع کروائے جاتے ہیں اور ان کے انٹرویو لیے جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ کو اس طرح کی تقاریب اور طریقوں سے اعتراض ہے چنانچہ پاکستان کے ایک نامور ادیب ڈاکٹر انور سدید کی سالگرہ کی سرگرمیوں کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آج کل اخباروں اور رسالوں پر ڈاکٹر انوار سدید اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے وہ سارا سال دبستانِ سرگودھا کے بدخواہوں کے سروں پر آسیب کی طرح کھیلتے رہتے ہیں۔ ہر طرف ان کی ساٹھویں سالگرہ کی دھوم ہے اور اس مناسبت سے ان کے بارے میں مضامین چھپ رہے ہیں۔ خبریں گڑھی جا رہی ہیں اور انٹرویو لیے جا رہے ہیں۔ یہ دھوم دھڑکا صرف کراچی اور لاہور تک محدود نہیں، ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ رسالہ ''کتاب نما'' دہلی کے تازہ شمارے میں ان کے بارے میں ایک گوشہ شائع

ہوا ہے۔فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد ڈاکٹر انور سدید تیسرے ادیب
ہیں جن کی سالگرہ اس بڑے پیمانے پر منائی جا رہی ہے۔[1]

آگے سالگرہ منانے کے فائدے بتاتے ہوئے اس طرح کی سرگرمیوں پر طنز کیا ہے۔مثلاً:

''سالگرہ منانے کے کئی فائدے ہیں۔ایک تو یہی ہے کہ متعلقہ شخص کے پیدا
ہونے میں اگر کوئی شبہ ہو تو رفع ہو جاتا ہے۔''[2]

اردو کی ادبی سرگرمیوں میں ادیبوں کے ''پچاس برس'' پورے ہونے پر ان کا جشن منایا جاتا ہے اور سیمینار کروا کر کتابیں شائع کروائی جاتی ہے۔اس طرح کی سرگرمیاں ہندو پاک دونوں ملکوں میں عام ہے۔ مشفق کے مطابق ہندوستان میں اس طرح کا کام زیادہ ہو رہا ہے اس طرح کی سرگرمیوں کو بھی وہ درست نہیں سمجھتے چنانچہ اس طرح کی سرگرمیوں کو وہ اپنے مزاح کا ہدف بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

بیسویں صدی میں سائنس اور طب کی ترقی کی وجہ سے انسان کی اوسط عمر
بڑھ گئی ہے،اس لئے اب چودھویں سال کی بجائے پچاسواں سال اہمیت اختیار
کر گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جونہی کوئی ادیب پچاس برس پورے کرتا ہے تو اس کا
طلائی جشن منایا جاتا ہے اور اس کی شخصیت اور فن پر ایک عدد کتاب شائع کی جاتی
ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں اس دل خوش کن رسم کا چلن کچھ زیادہ
ہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے ادیب وقت سے پہلے یعنی خاصی کم عمری
ہی میں پچاس برس کے ہو جاتے ہیں۔ہندوستان میں اب تک تین درجن سے
زیادہ زندہ ادیبوں کو ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتابیں شائع کر کے
رسوا کیا جا چکا ہے۔پاکستان ابھی اس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہوا۔اس لیے اس قسم
کی کتابوں کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہیں ہے۔[3]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص ۱۱۳۔
[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص ۱۱۳۔
[3] سخن ہائے ناگفتنی،ص: ۸۶،۸۷

مشفق خواجہ نے ان ادبی اجلاس میں مہمانانِ خصوصی اور صدر جلسہ کی حیثیت سے مدعو کی جانی والی شخصیات کو بھی اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں ادبی اجلاس کے مہمانِ خصوصی اور صدر جلسہ کی حیثیت سے سیاسی لوگوں کو مدعو کیا جارہا ہے چنانچہ ایسے ہی ایک ادبی اجلاس کی روداد بیان کرتے ہوئے انھوں نے طنز کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''کلیات کی اشاعت کی خوشی میں یا کسی فوری اشتعال کے بغیر جنوری کے آخری ہفتے میں لاہور والوں نے حبیب جالب کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا جس میں ان کی ادبی و سیاسی خدمات پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پیپلز پارٹی کے دور کے سابق وزیر اعلیٰ پنجاب ملک معراج خالد نے کی۔ مقررین میں زیادہ تر سیاسی لوگ تھے یا پھر اخباری کالم نگار، اس لیے جلسہ ادبی کم تھا اور سیاسی زیادہ، گویا جلسے میں اور جالب کی شاعری میں خاصی معنوی مطابقت پائی جاتی تھی''۔[1]

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جہاں ادبی اجلاسوں میں غیر ادبی شخصیات کو مدعو کیے جانے پر طنز کیا وہیں وہ ایسے اجلاسوں کو حقارت کی نظر دیکھنے والے ادبی شخصیات کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ ایک مرتبہ زاہدہ حنا نے اپنے ایک انٹرویو میں ادبی اجلاس میں غیر ادبی لوگوں کو مدعو کرنے کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''پاکستان کی موجودہ ادبی صورت حال یہ ہے کہ ہماری علمی و ادبی تقریبات کی مسند نشینی جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں کے حصے میں آئی ہے اور ایسی تقریبات کی اگلی صفوں میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بٹھائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انکم ٹیکس افسر اور اسمگلر بھی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی افسر غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجائے تو ہم اس سے اپنی ادبی محفلوں کی صدارت کراتے ہیں، غرض زاہد حنا کی اس رائے پر مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ یہ سرکاری افسر اپنی مرضی سے ان ادبی اجلاس میں نہیں آتے بلکہ انہیں بلایا جاتا ہے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ۔ص ۱۱۹

اور کوئی افسر غالب کے بیس شعر یاد کرتا ہے تو یہ بڑی بات ہے ورنہ موجودہ دور کے شاعروں کی یہ حالت ہے کہ سوائے اپنے انہیں کسی اور شاعر کے شعر یاد نہیں رہتے۔ لکھتے ہیں:

> محترمہ نے واقعی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ ایسی ہی دردناک تصویر کھینچنے پر علامہ راشد الخیری کو ''مصورِ غم'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ زاہدہ حنا بھی مصورۂ غم کہلانے کی مستحق ہیں۔
>
> انھوں ے جو کچھ فرمایا ہے وہ صد فیصد درست ہے لیکن اس میں جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں وغیرہ کا کوئی قصور نہیں۔ انھیں بلایا جاتا ہے تو وہ ادبی تقریبوں میں آتے ہیں۔ ان سے درخواست کی جاتی ہے تو وہ مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی وزیر یا کمشنر نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد سے زبردستی علمی و ادبی تقاریب کی صدارت کی ہو یا کسی تھانے دار نے سپاہی بھیج کر شاعروں کو تھانے بلایا ہو اور اپنی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا ہو۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری ان ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے ادب کا کاسۂ گدائی بنا رکھا ہے۔ وزیر اور کمشنر بڑی چیز ہیں، ہمارے ادیب تو ٹی وی اسٹیشن کے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے بھی اسی عقیدت سے ملتے ہیں جس عقیدت سے غالب اپنے محبوب کے پاسبان کے قدم لیتا تھا۔

محترمہ نے اس سرکاری افسر کا ذکر بھی بڑی حقارت سے کیا ہے جو غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجاتا ہے اور ادبی تقاریب کی صدارت کرتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ سرکاری افسر ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے غالب کے بیس شعر تو یاد کر لیے، اس کے برعکس ہمارے شاعروں کا یہ حال ہے کہ انھیں سوائے اپنے شعروں کے کسی دوسرے کا کوئی شعر یاد نہیں ہوتا۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی شاعر سے غالب کے صرف پانچ شعر سنانے کی فرمائش کر کے دیکھ لیجئے۔ وہ اپنے ہی

پانچ شعر غالب کے نام سے سنا دے گا۔سرکاری افسر غالب کو بے آبرو نہیں
کرتا۔اس کے نام سے اسی کے شعر سناتا ہے۔''[1]

مشفق خواجہ نے ادبی اجلاس کے دعوت نامہ کی تقسیم کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے مطابق موجودہ دور میں ادبی اجلاس کے دعوت نامے کی تقسیم میں بھی یہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا کہ دعوت نامے سے صرف ادب سے تعلق رکھنے والوں کو دیئے جانے چاہئے۔ایک واقعہ کے حوالے سے ایسے لوگوں کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

اس موقع پر ہمیں اکیڈیمی کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسیح الدین صدیقی
صاحب بے اختیار یاد آرہے ہیں۔خدا انھیں خوش رکھے، کیا وضع دار آدمی تھے۔
اہل قلم کانفرنس کے دعوت نامے اس طرح تقسیم کرتے تھے جس طرح عبدالعزیز
خالد اپنی تصانیف تقسیم کرتے ہیں۔یعنی جو شخص بھی نظر آیا، اسے دعوت نامہ پیش
کر دیا۔یہ نہ دیکھا کہ وہ دعوت نامہ کی عبارت پڑھ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ایک
مرتبہ صدیقی صاحب نے ازراہِ کرم ہمیں بھی مدعو کیا تھا۔ہم نے ادب سے کوئی
تعلق نہ ہونے کا عذر پیش کیا تو انھوں نے فرمایا
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔آپ صورت سے تو ادیب نظر آتے ہیں''۔
ہم نے پوچھا ''وہ کیسے''
تو انھوں نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا:
''پچھلی مرتبہ جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی اس کے مقابلہ میں اب آپ
کی صورت خاصی مسخ ہو چکی ہے''۔[2]

ادبی رسائل کی صورتِ حال

ہماری ادبی سرگرمیوں میں ادبی رسائل کی اشاعت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ان کے

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی ''ص:۱۱۵

[2] سخن ہائے گسترانہ''۔ص:۲۴۰

ذریعہ ہی ہم ایک عام قاری کو جو ادب سے دلچسپی رکھتا ہو، اس کو ادبی صورتِ حال سے واقف کرا سکتے ہیں۔ کچھ ادبی رسائل ماہوار ہوتے ہیں تو کچھ سہ ماہی اور کچھ ششماہی ہوتے ہیں۔ ہر ادبی رسالہ کی اپنی ایک نوعیت ہوتی ہے اس کا ایک مخصوص نظر فکر ہوتا ہے اور اس کا اپنا معیار ہوتا ہے اور اسی سے اس رسالہ کی پہچان ہوتی ہے۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں ادبی رسالوں کی صورت حال ناگفتنی ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک مواد سے زیادہ ابی معیار کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ادبی رسائل کے موجودہ معیار سے ناخوش ہیں اور اس صورتحال پر طنز کرتے ہوئے انھوں نے باقاعدگی سے نا چھپنے کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے اور ایسے رسائل جو اپنی مرضی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں انھیں فقیر کے کشکول سے تشبیہ دے کر موجودہ رسائل کی صورت حال پر سخت چوٹ کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک زمانہ تھا کہ ادبی رسالے باقاعدگی سے ہر مہینے شائع ہوتے تھے۔ ساقی، نگار، ادب لطیف، ادبی دنیا، نیرنگ خیال۔ نہ جانے کتنے رسالے تھے، جن سے ادبی دنیا میں چہل پہل رہتی تھی۔ ہر رسالے کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ بہترین تخلیقات شائع کرے۔ لکھنے والوں کو معلوم تھا کہ کمتر درجے کی کوئی چیز شائع نہیں ہو سکے گی، اس لیے وہ جی لگا کر لکھتے تھے۔ ان رسالوں کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ سالانہ خریداروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اس وجہ سے مالی حالات اتنے اچھے تھے کہ کاتبوں، جلد سازوں اور پریس والوں ہی کو نہیں، ادیبوں کو بھی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اور اب یہ حال ہے کہ ماہانہ رسالوں کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ لے دے کر ایک ''افکار'' نے جو صہبا لکھنوی کی مسیحا نفسی کی بدولت باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔ باقی تمام رسالے ''مرضی وار'' نکلتے ہیں۔ کوئی سال میں دو مرتبہ اور کوئی سال میں ایک مرتبہ۔ رسالے کیا ہیں، فقیر کا کشکول ہیں کسی نے سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیا، کسی نے باسی کڑھی انڈیل دی، کسی نے دیوانی ہانڈی سے کچھ تبرکنکال کر دے دیا۔ ادیبوں کی بارگاہ سے جو

کچھ اور جتنا کچھ مل جاتا ہے۔مدیرانِ کرام صبر شکر سے اسے چھاپ دیتے ہیں۔ اسی لیے تو مرضی وار رسالے عموماً بدہضمی کا شکار ہوتے ہیں۔یعنی ضخامت اتنی زیادہ ہوتی ہے جیسے کلیاتِ عبدالعزیز خالد ہو۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ رسالے محدود تر تعداد میں چھپتے ہیں اور قیمت کی زیادتی کی وجہ سے محدود تر تعداد میں فروخت ہوتے ہیں''۔[1]

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ نے ان ''مرضی وار'' شائع ہونے والے رسائل کے فروخت کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مشفق خواجہ کے خیال میں ادبی رسائل با قاعدگی سے شائع نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام قاری کے پڑھنے کا رجحان اب ان ادبی رسائل کے بجائے مقبول عام ڈائجسٹوں اور فیشن زدہ رسالوں کی طرف ہوگیا ہے۔ایسی صورت حال میں رسالوں کی فروخت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے رسائل معاشی پریشانی کا شکار ہوجاتے ہیں اور مقبول عام ڈائجسٹوں اور فیشن زدہ رسالوں کی طرح ان ابی رسالوں کو اشتہارات بھی نہیں ملتے ہیں۔اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے انھوں نے بعض اہم مشورے بھی دیئے ہیں تا کہ اس صورتحال کو بہتر کیا جا سکے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

افکار، کے علاوہ جتنے رسالے ہیں، وہ سب مرضی وار شائع ہوئے۔ادیب لطیف، فنون، اوراق، تخلیق، نیا دور، محراب اور معاصر ہمارے بہترین رسالے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی با قاعدگی سے شائع نہیں ہوتا۔سبب یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذوق اور قوتِ خرید پر مقبول عام ڈائجسٹوں اور فیشن زدہ رسالوں کا قبضہ ہے۔ادبی رسالوں کو کوئی نہیں پوچھتا اگر ملک کی تمام لائبریریوں کو ادبی رسالوں کا خریدار بنا دیا جائے اور سرکاری مشتہرین کو اس کا پابند کر دیا جائے کہ وہ اپنے صرف ایک فیصد اشتہارات ہی ادبی رسالوں کو دیں تو ادبی رسالوں کی حالت سدھر سکتی ہے۔''[2]

---

[1] سخن ہائے گسترانہ'' ص:۲۶۴ [2] سخن ہائے گسترانہ۔ص:۲۰۳

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ اخبارات کے ادبی صفحات کی وجہ سے بھی ادبی رسالوں کی حالت خراب ہے اور ادبی رسالے کی فروخت کے لیے خریداروں کا گھیراؤ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی صورتحال پر طنز کرتے ہوئے رسالے افکار کے حوالے سے مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''جب سے اخبارات کے ادبی صفحوں اور ڈائجسٹوں کا بول بالا ہوا ہے۔ ادبی رسالوں کی دال خراب ہے۔ خصوصاً ماہ وار رسالے تو دم توڑ رہے ہیں۔ چشم بد دور ایک ''افکار'' ہے جو باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے اسے بھی ادب کے پیر مغان جناب صہبا لکھنوی کی جواں ہمتی کا معجزہ سمجھنا چاہیے ورنہ صہبا صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ادب کا غیر منافع بخش کاروبار بند کر کے کوئی مفید کام کرتا۔ مثلاً افکار کا دفتر جس علاقے میں ہے وہ نہاری کی دکان کے لیے مشہور ہے۔ صہبا صاحب اگر نہاری کی دکان ہی کھول لیتے تو انھیں خریداروں کا گھیراؤ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، خود خریداران کا گھیراؤ کرتے۔''[1]

ہمارے ادبی رسائل کی ایک اہم سرگرمی ''سالانہ ادبی جائزہ'' شائع کرنا بھی ہے۔ اب تو ''سالانہ ادبی جائزے'' شائع کرنے کی ایک روایت بن گئی ہے۔ مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ یہ سالانہ جائزے صرف جمع وخرچ کے گوشوارے ہوتے ہیں۔ الفاظ کی الٹ پھیر سے بڑی خوبصورتی سے انھوں نے اس مسئلہ پر چوٹ کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''کالم نگار کو اس ساری محنت کا صلہ یہ ملتا ہے کہ کسی ادبی تاریخ میں تو کیا، سالانہ ادبی جائزوں میں بھی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ سہی، تفریح طبع کے لیے بھی دو لفظ نہیں لکھے جاتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قسم کے سالانہ جائزے بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''ناجائزے'' کہلانے کے مستحق ہیں اور یہ تیسری بات ہے کہ سالانہ جائزے لکھنے کی روایت خود ڈاکٹر سلیم اختر کی قائم کردہ ہے۔

---

[1] سخن ہائے گستراخانہ''۔ ص:۲۰۲

یہ سالانہ جائزے کیا ہوتے ہیں۔جمع وخرچ کے گوشوارے ہوتے ہیں۔کتابوں
اور مصنفوں کے نام جمع کیے جاتے ہیں اور جائزے لکھنے والے اسی تگ ودو میں
خرچ ہو جاتے ہیں۔''[1]

ہمارے ادبی رسائل کی دنیا میں ماہنامہ، سہ ماہی اور ششماہی رسالوں کے علاوہ ''کتابی سلسلہ'' کی اشاعت کی روایت بھی عام ہو چکی ہے۔مشفق ''کتابی سلسلہ'' کی روایت عام ہونے کی وجہ سے وہ یہ بتاتے ہیں کہ جن تخلیقات کو شائع کرنے کی گنجائش عام رسائل میں نہیں ہوتی ہے۔وہ ان میں شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ ''اظہار'' کے کتابی سلسلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس صورت حال پر طنز کرتے ہیں:

''اظہار'' دراصل ایک رسالہ ہے، جسے کتاب کے نام سے باقر مہدی شائع
کرتے ہیں۔پاکستان میں کتابی سلسلے اس لیے شائع ہوتے ہیں کہ رسالوں کے
لیے ڈیکلریشن حاصل کرنا جوے شیر لانے کے مترادف ہے۔
معلوم نہیں ہندوستان والوں کو کیا مشکل درپیش ہے کہ انھوں نے بھی کتابی
سلسلوں کے نام پر رسالے جاری کر رکھے ہیں۔شاید اس کا سبب یہ ہے کہ
جن تحریروں کے لیے رسالوں میں گنجائش نہیں نکل سکتی ان کے لیے کتابی سلسلے
موزوں رہتے ہیں۔''اظہار'' کو دیکھ کر اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔اس
میں محقق رشید حسن خان اور شاعرہ کشور ناہید پر سو سو صفحات کے سیکشن ہیں۔
ظاہر ہے کہ بیک وقت اتنی تحقیق اور اتنی شاعری کے لیے کسی معقول رسالے
میں جگہ نہیں نکل سکتی اور اگر نکل بھی آئے تو رسالے کا مستقبل خطرے میں پڑ
سکتا ہے''۔[2]

مشفق خواجہ نے ان ادبی رسائل میں کتابوں پر شائع ہونے والے تبصروں کو بھی اپنے طنز ومزاح کا

---

[1] سخن ہائے گسترانہ''۔ص:۲۶۸

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ص:۳۷

نشانہ بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ ان تبصروں میں کتاب و مصنف کے نام کے ساتھ صفحات اور قیمت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے رسالہ ''روایت'' میں شائع ہونے والے تبصروں کی خوبی کو سراہتے ہوئے وہ موجودہ دور کے دیگر رسائل میں شائع ہونے والے تبصروں پر اس طرح چوٹ کرتے ہیں:

> ''روایت میں کتابوں پر تبصرے روایتی انداز کے نہیں ہیں۔ یعنی ویسے نہیں، جیسے عام طور پر رسالوں میں ہوتے ہیں کہ کتاب و مصنف کے نام، صفحات کی تعداد اور قیمت کے سوا کوئی بات تبصرہ نگار کے مطالعے کا نتیجہ نہیں ہوتی''۔[1]

ادبی رسائل میں مختلف اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ دراصل یہ اشتہارات رسالے میں ایک ضمنی چیز ہونا چاہئے لیکن موجودہ دور میں ان اشتہارات کو بھی تخلیقات کی طرح بہت سلیقے سے شائع کیا جارہا ہے۔ چنانچہ مشفق خواجہ ادب لطیف کے حوالے سے اس طرح کے رسائل کی صورت حال پر طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ ہفتے ''ادب لطیف کا خاص نمبر شائع ہوا ہے جو خاص ان معنوں میں ہے کہ تخلیقات کے درمیان اشتہارات اس سلیقے سے شائع کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا یہ فیصلہ نہیں کرپاتا کہ کسے تخلیق سمجھے اور کسے اشتہار۔ سچ یہ ہے کہ بعض اشتہارات، تخلیقات کے مقابلے پر زیادہ ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور انھیں کے مطالعے کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ادب لطیف کا یہ سالنامہ ایک اہم ادبی دستاویز ہے''۔[2]

اس طرح آگے ایک جگہ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے اشتہارات کی بھرمار کو بھی اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے مزاحیہ انداز میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم نے گزشتہ پچیس برسوں میں اردو ڈائجسٹ سے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص: ۲۴۷

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص: ۵۷

بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ہم نہ صرف نزلے اور کھانسی کی دواؤں کا انتخاب اس
جریدے میں چھپنے والے اشتہاروں کو دیکھ کر کرتے ہیں بلکہ سیاسی اتار چڑھاؤ کا
اندازہ کرنے کے لیے بھی قریشی صاحب کے ادارے اور تجزیے پڑھتے ہیں''۔[1]

مشفق خواجہ جہاں ان ادبی رسائل کی ناہموار صورتِ حال کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہیں ان ادبی رسالوں کے مدیروں پر بھی طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ بعض مدیر مصنفین کی بھیجی ہوئی تخلیقات کو پڑھتے بھی نہیں اور شائع کر دیتے ہیں ۔رسالہ روایت کی انفرادیت کو سراہتے ہوئے ادبی رسالوں کے مدیروں پر اس طرح بڑے سخت لہجے میں چوٹ کی ہے:

''روایت محض ایک رسالہ نہیں،ایک دبستانِ فکر ہے۔حیات وکائنات کے
اہم اور بنیادی مسائل کو سمجھنے سمجھانے کا وسیلہ ہے۔اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا
اور منفرد رسالہ ہے جس میں شامل بیشتر تحریروں کا باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت
منتخب کی جاتی ہیں۔عام رسالوں جیسا حال نہیں کہ فقیر کے کشکول کی طرح تازہ،
باسی،مرغن روکھا سوکھا ہر طرح کا مال موجود ہے۔ہمارا ایک قول برحق ہے کہ آج
کے ایڈیٹر پوسٹ مین کا درجہ رکھتے ہیں۔جو مصنفین کے بند لفافے قارئین تک
پہنچا دیتے ہیں۔یعنی جو کچھ چھاپتے ہیں اسے خود بھی نہیں پڑھتے''۔[2]

غرض ادبی رسائل کی سرگرمیوں اور اس کی موجودہ صورتحال سے مشفق خواجہ مطمئن نہیں ہے کیوں کہ ان کے نزدیک ادبی معیار اور مقصد کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے مدیروں کو جو معیار کو ملحوظ نہیں رکھتے اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔

صحافت

مشفق خواجہ نے دورِ حاضر کی صحافت کو بھی اپنے کالموں میں زیر بحث لایا ہے۔ان کے مطابق یہ

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔۲۷۸

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ص:۲۴۴

صحافت شرافت کے معیاروں پر پورا ہی نہیں اترتی۔ان کے نزدیک عصر حاضر میں صحافت ایک تجارت بن کر رہ گئی ہے۔اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ اخبارات کو رنگین تصویروں سے سجایا جارہا ہے تا کہ اس کے فروخت میں اضافہ ہوسکے۔سرکار سے رشوت کے طور پر اشتہارات وصول کیے جارہے ہیں اور آج کے اخبارات کسی واضح پالیسی کے تحت شائع نہیں ہوتے۔اگر ان اخبارات کی کوئی پالیسی ہوتی بھی ہے تو وہ مصلحت اور منفعت سے عبارت ہوتی ہے چنانچہ مشفق خواجہ دورِ حاضر کی صحافت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایسے صحافیوں پر بھرپور طنز کرتے ہیں:

> ''صحافت کو کسی زمانے میں شریفانہ پیشہ کہا جاتا تھا۔پیشہ تو یہ اب بھی شریفانہ ہے لیکن شرافت وہ نہیں رہی جو اگلے زمانے میں تھی۔جس طرح گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں روپے کی قیمت گری ہے۔اسی طرح شرافت کے معیار میں بھی خاصی تبدیلی آئی ہے پہلے کوئے صحافت میں وہی آتے تھے جنھیں جان و دل عزیز نہیں ہوتے تھے،اب جان و دل کی جگہ ایمان نے لے لی ہے۔''[1]

صحافت کی حیثیت کسی زمانے میں ایک خاص مشن کی ہوتی تھی،لیکن مشفق خواجہ کے خیال کے مطابق صحافت دورِ حاضر میں جنس کی تجارت بن گئی ہے،اگر اخباروں میں پری رخوں کی رنگین تصویریں نہ ہو تو وہ اخبار دوسرے دن ردی میں بھی فروخت نہیں ہوگا۔غرض صحافت کی اس کی خراب صورتِ حال پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''صحافت مشن نہیں رہی،جنس تجارت بن گئی ہے۔اخبار خبروں اور اداریوں سے نہیں،تصویروں اور اشتہاروں سے چلتے ہیں۔پری رُخوں کی تصویریں نہ ہوں تو دوسرے دن ردی کا بھاؤ بھی گر جاتا ہے۔حکومت اشتہاروں سے ہاتھ کھینچ لے مالکوں کو دن میں تارے اور راتوں کو ڈراونے خواب دکھائی دیتے ہیں۔حکومت اشتہارات کو بطور رشوت تقسیم کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سچ سننے اور

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ۔ص ۲۷۷

سچ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی''۔[1]

مشفق خواجہ کو دورِ حاضر کے رسائل کی طرح اخبارات سے بھی یہ شکایت ہے کہ ان اخبارات کی اب کوئی پالیسی نہیں رہی اخبار میں اب صرف ایک چوتھائی خبر ہوتی باقی تمام اخبار میں رنگین اشتہارات ہوتے ہیں۔ ان اخبارات کی ظاہری چمک دمک اور مختلف رنگوں کی تصویروں کی بھرمار کو وہ قوس قزح کے رنگوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اخبارات کی اس صورتِ حال پر طنز کرتے ہوئے مشفق خواجہ کہتے ہیں:

''وہ دن گئے جب اخبارات کی کوئی پالیسی ہوتی تھی۔ اب ان کے پاس صرف نیوز پرنٹ کوٹا ہوتا ہے۔ ایک چوتھائی پر اخبار چھپتا ہے اور باقی تین چوتھائی پر کرنسی نوٹ چھپتے ہیں۔ یعنی زائد نیوز پرنٹ پبلک میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ گویا اخبار چھاپنے میں بھی فائدہ ہے اور نہ چھاپنے میں بھی۔

کسی پالیسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اخبارات کا باطن تو دھندلایا رہتا ہے لیکن ظاہری چمک دمک دیدنی ہوتی ہے۔ اخباری صفحات پر قوس قزح کے ساتوں رنگ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے اخبارات، بقول شخصے، مطبع میں نہیں رنگ ریز کی دکان میں چھپتے ہیں''۔[2]

مشفق خواجہ نے صحافت اور اخبارات کے ساتھ صحافی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے ان کا کہنا ہے کہ صحافی بھی پولیس والوں کی طرح عوام پر اپنا رعب و دبدبہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے مطابق بعض صحافی صحافت کے پردے میں بادشاہی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے صحافیوں پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''پاکستان میں صحافت اور پولیس دو شعبے ایسے ہیں جو اپنی خوشی عنوانوں کی وجہ سے خاصا رعب اور دبدبہ رکھتے ہیں صحافت کو البتہ پولیس پر اس اعتبار سے

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص۔ 277

[2] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص: 277

فوقیت حاصل ہے کہ پولیس والوں سے عام شہری ڈرتے ہیں اور صحافیوں کے سامنے پولیس والے بھی کچ پیندیے بن جاتے ہیں پولیس پر اس پیشہ ورانہ برتری کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض صحافی صحافت کے پردے میں بادشاہی کرتے ہیں''۔[1]

ادب اور صحافت

ادب اور صحافت کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ایک ادیب صحافت کے لیے سود مند ثابت ہوسکتا ہے لیکن صحافت ایک ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کر دیتی ہے، لکھتے ہیں:

''صحافت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادب کے تخلیقی جوہر کے لیے زہر ہلاہل کا کام کرتی ہے صحافی بن کر کیسے کیسے ادیب ادبی دنیا میں نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئے''۔[2]

اخبارات کے ادبی صفحات نے ادب کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان اس مسئلہ کو لے کر مشفق خواجہ نے اپنے مزاحیہ کردار لاغر مرادآبادی سے ہم کلام ہوکر دلچسپ بحث کی ہے۔ مثلاً مکالماتی انداز میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم: ''قبلہ یہ فرمایئے کہ اخبارات کے ادبی صفحات سے ادب کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ؟

وہ: ادبی صفحات ہی سے نہیں، اخبارات کے تمام صفحات سے صرف مالکان کو فائدہ پہنچا ہے۔ باقی سب نقصان میں رہے ہیں۔

ہم: ادب کو کس طرح کا نقصان پہنچا ہے؟

وہ: ہر طرح کا، مثلاً یہ کہ ادب اور صحافت میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اب ان

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی۔ 77

[2] سخن ہائے ناگفتنی۔ 76۔

لوگوں کا شمار بھی ادیبوں میں ہونے لگا ہے۔ جو ادبی جلسوں کی رپورٹیں لکھتے ہیں۔غضب تو یہ کہ وہ لوگ بھی ادیب کہلانے لگے ہیں۔جن کے نام ادبی رپورٹوں میں حاضرین جلسہ کے طور پر درج ہوتے ہیں۔

ہم:ادبی رپورٹیں لکھنا بھی تخلیقی کام ہے؟

وہ:تو پھر جلسوں میں شریک ہونا بھی تخلیقی کام ہوا۔''[1]

ان کے استاد لاغر مراد آبادی کا کہنا ہے کہ ان ادبی صفحات سے مالکوں کے علاوہ صفحات کے نگران کو بھی فائدہ ہے کیونکہ یہ لوگ اس صفحات کے ذریعہ سے اپنی پبلسٹی کرتے ہیں وہ کیسے؟اقتباس دیکھئے:

''ہم: یہ فرمایئے کہ اخبار کے ادبی صفحات سے مالکوں کے علاوہ بھی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے؟

وہ:ہاں وہ لوگ جو اِن صفحات کے انچارج یا نگران ہوتے ہیں۔

ہم: وہ کیسے؟

وہ: یہ لوگ اپنی پبلسٹی زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔اپنی تعریف میں مضامین لکھ کر فرضی ناموں سے شائع کرتے ہیں۔خبروں میں بھی اپنا ذکر بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں اور تصویریں تو صرف وہی چھپتی ہیں جن میں یہ خود موجود ہوتے ہیں کسی بھی اخبار کا ادبی صفحہ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔اس کے ہر کالم میں نگران کی شخصیت کا عکس نظر آئے گا۔وہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ایک اخبار کے ادبی صفحے کے نگران نے ۸۳ء میں انتقال کرنے والوں کی فہرست مرتب کر کے کاتب کے حوالے کی۔کاتب نے نگران کا نام بھی شامل فہرست کر دیا۔فہرست چھپی تو کاتب سے جواب طلبی کی گئی۔اس نے کہا''ادبی صفحے پر جتنی خبریں چھپتی ہیں۔اس میں نگران صاحب اپنے نام کا اضافہ کر دیا کرتے ہیں میں یہ سمجھا کہ اس فہرست میں وہ اضافہ کرنا بھول گئے ہیں،لہٰذا یہ کام میں نے کر دیا۔''[2]

---

[1] [2] سخن ہائے گسترانہ،۔62

استاد لاغر مرادآبادی کو اس ادبی صفحات میں شائع ہونی والی ادبی خبروں سے بھی شکایت ہے۔

استاد لاغر مرادآبادی مشفق خواجہ سے ہم کلام ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''وہ: یہی نہیں، ادبی صفحات پر مضحکہ خیز خبریں بھی چھپتی ہیں۔اس قسم کی خبریں تو آپ نے دیکھی ہوں گی کہ فلاں مشہور شاعر کے ماموں زاد بھائی کے نواسے نے بھی کلام سنایا۔
>
> ہم: اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔اصل چیز مشاعرہ ہے اور خبر اسی کے بارے میں ہے۔
>
> وہ: جی نہیں۔اصل چیز فلاں مشہور شاعر ہے۔جس کے ماموں زاد بھائی کے نواسے کی سالگرہ تھی۔''[1]

مذکورہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ نے طنز ومزاحیہ انداز میں ادب اور صحافت کے ایک اہم مسئلے پر اہلِ ادب اور اہل صحافت دونوں کو دعوتِ فکر دیا ہے۔

سرکاری علمی وادبی ادارے

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں ادب کے نام پر قائم کیے گئے سرکاری اداروں کی ناکارکردگی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ دراصل ان علمی وادبی اداروں کے قیام کا مقصد علم وادب کے فروغ اور ادیبوں کی فلاح وبہبود ہونا چاہئے۔ یہ ادارے اس معاملے میں کوئی خدمات انجام نہیں دے رہے ہیں بلکہ ادب کے نام پر اپنی پسندیدہ شخصیات کو روزگار فراہم کررہے ہیں۔مشفق خواجہ کو اس بات پر اعتراض ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے ملک میں علم وادب کے فروغ اور ادیبوں کی فلاح وبہبود کے لیے جو سرکاری ادارے موجود ہیں، ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ عموماً یہ ادارے

---

[1] [2] سخن ہائے گستراخہ، 63

قائم تو اعلیٰ مقاصد کے لیے کئے جاتے ہیں لیکن عملاً ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ
بعض پسندیدہ شخصیتوں کو روزگار فراہم کر دیا جائے''۔[1]

اسی طرح آگے ایک جگہ اردو اداروں کی صورتِ حال پر ''مجلس دفتر زبان'' کے حوالے سے اس طرح طنز کرتے ہیں:

''مجلس دفتر زبان تو شاید اب موجود نہیں لیکن کروڑوں روپے کی سرکاری
امداد حاصل کرنے والے کئی اردو اداروں میں آج بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو کبھی
مجلس دفتری زبان میں ہوتا تھا۔ اردو کا تو کوئی کام نہیں ہوتا بہت سے ''اردو
دوستوں'' کو ادھر ادھر کی ہانکنے اور دفتر میں میزوں کے اوپر اور نیچے بھی تان کر
سونے کا موقع ملتا رہتا ہے''۔[2]

مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ پہلے تو اردو اداروں میں اردو کے نام پر کچھ نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی ہے تو کام کوئی اور کرتا ہے نام کسی اور کا ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ نے ان علمی اداروں کی زیرِ سرپرستی ہونے والے ادبی اجلاسوں کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے۔ ان کے مطابق ان علمی اداروں میں کبھی کبھار بے مقصد و بے معنی سرگرمیاں ہوتی ہیں جیسے ''ادارۂ مقتدرہ قومی زبان اردو'' کی سرپرستی میں ''املا'' پر ہونے والے سیمینار پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مقتدرہ کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ املا اور رموز اوقاف کے
جھگڑوں میں الجھی ہوئی ہے۔ حالاں کہ یہ جھگڑے محکمہ اوقاف سے تعلق رکھتے
ہیں۔ پچھلے دنوں مقتدرہ نے املا پر ایک سیمینار کیا تھا جس میں نامی گرامی دانش
وروں کو بلایا گیا تھا جو نامی زیادہ اور گرامی برائے نام۔ افسوس کہ ہمیں نہیں بلایا
گیا اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارا املا درست ہے۔ معلوم نہیں اس سیمینار میں

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، 307۔
[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ۲۱۱۔

شرکت سے مذکورہ بالا نامیوں گرامیوں کو کیا فائدہ پہنچا ہمیں شرکت نہ کرنے سے البتہ یہ فائدہ ہوا کہ ہم بچوں کی غلطیاں کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔"[1]

مشفق خواجہ کے خیال کے مطابق عہد حاضر میں بعض ادب کے سرکاری ادارے ادب سے زیادہ ادیب کی خدمت انجام دیتے ہیں اور یہ خدمت بھی عموماً ان ادیبوں کی کی جاتی ہے جو اس کے مستحق نہیں ہوتے چنانچہ علمی اداروں کی اس ناقص کارکردگی کو ادارۂ اکادمی ادبیات کے حوالے سے یوں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ ایسے ادبی اداروں کی صورت حال کا مذاق اڑاتے ہوئے ہندوستان کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی کتابیں پاکستان میں چھپوائیں۔ دونوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہیں جو زرِ مبادلہ ملا ہے وہ اتنا نہیں کہ کتابیں چھپوائی جا سکیں۔

اکادمی ادبیات سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ اکادمی صرف معذور ادیبوں کی مدد کرتی ہے۔ ایسے ادیبوں کی مدد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو معذور بھی نہ ہوں اور پھر پاکستانی نہ ہوں۔ اگر یہ دونوں پاکستانی ہوتے تو انہیں بہت سے صحت مند پاکستانی ادیبوں کی طرح معذور ادیبوں کے فنڈ سے مدد دی جا سکتی تھی۔ واضح رہے کہ اکادمی کے پاس معذور ادیبوں کی مدد کے لیے جو فنڈ ہے اس کا بڑا حصہ صحت مند ادیبوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ادیب معیاری ادب تخلیق نہ کر سکیں انہیں بھی معذور ادیب تصور کیا جاتا ہے۔"[2]

اکادمی ادبیات کی طرح، انجمن ترقی اردو پاکستان کا بھی یہی حال ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان،

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ۔ص:302

[2] خامہ بگوش کے قلم سے ص:143

میں ادیبوں کی خدمات کا اعتراف ان کی تخلیقات کے معیار سے نہیں بلکہ ان کی عمر کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ اس بات کا مشفق خواجہ کو افسوس ہے ان کے مطابق عمر کو نہیں ادبی تخلیقات کے معیار کو اہمیت دینی چاہئے چنانچہ سخت لہجے میں اپنے اس اعتراض کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''انجمن نے بزرگ ادیبوں کی خدمات کا برسر عام اعتراف کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ستّر برس کی جو قید لگائی ہے، وہ نامناسب ہے کیوں کہ ادبی خدمات کو جانچنے کا معیار عمر نہیں، ادبی تخلیقات ہیں۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ ہر لکھنے والے کے نزدیک اس کی ادبی تخلیقات کا معیار نہایت بلند ہوتا ہے۔ اگر انجمن ادبی تخلیقات کے چکر میں پڑ گئی تو پھر یہ انجمن ترقی اردو نہ رہے گی۔ انجمن ترقی نا قصانِ ادب ہو جائے گی۔''[1]

مشفق خواجہ نے پاکستان کے کئی علمی و ادبی اداروں کی ناقص کارکردگی کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بنایا ہے جن میں سے ایک ''اکیڈیمی آف لیٹرز'' ہے ایک جگہ انہوں نے اس ادارے کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اکیڈیمی آف لیٹرز کی سالانہ اہل قلم کانفرنس سے چند روز پہلے پروفیسر ابوالخیر کشفی اکیڈیمی کی مجلس نظما سے استعفیٰ دیتے ہوئے اکیڈیمی پر چند سنگین الزامات لگائے تھے۔ جیسے،ا۔ اکیڈیمی کی مجلس نظما ایک غیر موثر ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔

۲۔ اکیڈیمی اپنا علمی مجلّہ شائع نہیں کر سکی۔ جس کا فیصلہ کئی برس پہلے کیا گیا ہے۔

۳۔ اکیڈیمی کے خبر نامے کا معیار انتہائی پست ہے۔

۴۔ اکیڈیمی ادیبوں کے لیے کسی قسم کی سہولتیں حاصل نہیں کر سکی یہاں تک کہ ریل اور جہاز کے کرایوں میں بھی ادیبوں کو رعایت نہیں مل سکی۔

۵۔ اکیڈیمی کی مجموعی کارگردایسی نہیں۔ جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے، وغیرہ۔ غرض ابوالخیر کشفی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے ۔ص:268

کے ان تمام الزامات کی تردید کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے ''اکیڈیمی آف لیٹرز'' کی جملہ کارکردگیوں کا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے فرماتے ہیں:

''کشفی صاحب ''سوئے اتفاق'' سے اصول پسند ادیب ہیں، اس لیے بعض لوگوں کو ان کے استعفیٰ پر اتنا تعجب نہیں ہوا۔ جتنا اس بات پر کہ انہوں نے کئی سال اکیڈیمی کی مجلس نظما کے رکن کی حیثیت سے کس طرح گزار لیے۔ بہر کیف صورتِ حال کچھ بھی ہو۔ ہمیں کشفی صاحب کے الزامات پسند نہیں آئے۔ اکیڈیمی کے ایک ادنیٰ خیر خواہ اور دعا گو کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ان الزامات کو رد کیا جائے، لہٰذا یہ نکتہ بہ نکتہ عرض ہے کہ:

۱) اکیڈیمی کی مجلس نظمی پر غیر مؤثر ہونے کا الزام بے بنیاد ہے۔ کشفی صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے ''مجلس نظما'' کو انتظامی امور سے متعلق ادارہ سمجھا، حالاں کہ ''مجلس نظما'' کا لغوی مفہوم ''نظمیں لکھنے والوں کی مجلس'' ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر علم ہے کہ اکیڈیمی کی مجلس نظما میں کئی نظم گو شاعر شامل ہیں اور بڑی با قاعدگی سے ایسی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ جو خاصی مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ اگر کشفی صاحب اکیڈیمی کی کارکردگی کو شعر و شاعری کے معیار سے جانچتے تو انہیں ایک بے بنیاد الزام عائد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

۲) یہ صحیح ہے کہ اکیڈیمی نے کئی برس پہلے ایک علمی مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن کوئی فیصلہ کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس پر عمل بھی کیا جائے گا اور جب فیصلہ غلط ہو تو اس پر عمل نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اصولی بات یہ کہ اکیڈیمی ایک ادبی ادارہ ہے، اس کا علم سے کیا تعلق، جو علمی جریدہ شائع کیا جاتا۔ ملک میں پہلے ہی درجنوں علمی جریدے شائع ہوتے۔ اکیڈیمی کے وابستگان اور پسماندگان نے ان ہیں سے کب استفادہ کیا ہے۔ جو ان کی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے ایک نیا علمی جریدہ شائع کیا جاتا۔

۳)۔ یہ بھی غلط ہے کہ اکیڈیمی کے خبر نامے کا معیار پست ہے۔ کشفی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس خبر نامے کا سرے سے کوئی معیار ہی نہیں لہٰذا بلندی یا پستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴)۔ یہ الزام بھی غلط ہے کہ اکیڈیمی ادیبوں کے لیے کسی قسم کی سہولتیں حاصل نہیں کر سکی۔ ہمارے خیال میں اکیڈیمی کے قیام کے بعد سب سے بڑی سہولت تو یہ حاصل ہوئی کہ جس کا جی چاہے، ادیب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اہل قلم کی جو پانچ کانفرنس ہو چکی ہیں، اگر ان کے مندوبین کی فہرستیں شائع کی جاتیں تو کم از کم پچاس فیصد ایسے لوگوں کے نام ملیں گے، جنہیں ادب تخلیق کرنے کا تو کیا، پڑھنے کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہے۔

اکیڈیمی کی طرف سے ادیبوں کو یہ سہولت بھی دی گئی ہے کہ ان کے انتقال فرما جانے کی صورت میں اکیڈیمی کفن و دفن کی ذمہ داری سنبھال لیتی ہے اور ہر مرحوم ادیب کے پسماندگان کو چار پانچ ہزار روپے کی رقم کا چیک بھیج دیتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات چیک مرنے والے کے نام کا ہوتا ہے، صرف دوسری دنیا ہی میں کیش ہو سکتا ہے۔

۵)۔ کشفی صاحب فرماتے ہیں کہ اکیڈیمی کی مجموعی کارکردگی ایسی نہیں ہے کہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ اطمینان کا اظہار کرنے کے لیے کیا اکیڈیمی کی کارکردگی ہی رہ گئی ہے؟ اطمینان کا اظہار کرنا ہی تھا تو اس پر کیا ہوتا کہ اکیڈیمی کے قیام کے بعد ہمارے ادیبوں کی مجموعی کارکردگی اچھی ہے کہ وہ اسلام آباد جا کر مزے لے لے کر سرکاری نمک کھاتے ہیں اور اعلیٰ ادب تخلیق کرتے ہیں۔''[1]

مذکورہ اقتباس خاصہ طویل ہو گیا ہے لیکن چوں کہ اس عہد کی ادبی صورتحال اور ادبی کی کارکردگی کی

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:240-241

تفصیلات کو جاننے کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمام تفصیلات دی جائے تا کہ بات واضح ہو جائے اور مشفق خواجہ کا مقصد بھی وضاحت ہو جائے۔

مشفق خواجہ نے پاکستان کے علمی ادارہ ''رائٹرز گلڈ'' کی بدعنوانیوں کو بھی اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے ایک جگہ منیر نیازی کے حوالے سے رائٹرز گلڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''منیر نیازی کا پسندیدہ کھلونا رائٹر گلڈ کا ادبی انعام ہے، ان کے جتنے انٹرویو بھی چھپے ہیں میں وہ رائٹرز گلڈ کے انعامات کی تقسیم میں بدعنوانیوں کا ذکر ضرور کرتے ہیں حالاں کہ ان زمانہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ خود رائٹرز گلڈ کا شمار بھی بد عنوانیوں میں ہوتا ہے''۔ [1]

علمی و ادبی ادارے ادبی سرگرمیوں کے نام پر میں لاکھوں روپے غیر ضروری اور بے مقصد خرچ کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے ان اداروں میں بے مقصد خرچ کرنے کا ایک طریقہ اشتہار بازی ہے اداروں کے اس غیر ذمہ دارانہ فعل پر ادارہ نیشنل بک کونسل کے حوالے سے طنز کیا ہے:

> ''افسوس کہ نیشنل بک کونسل نے لاکھوں روپے اشتہار بازی پر صرف کر دیے۔ اتنی رقم سے تو درجنوں کتابوں کی اشاعت عمل میں آسکتی ہے۔ [2]

ترقی پسند ادب اور ادیب

ترقی پسند تحریک بیسویں صدی میں اردو ادب کی ایک اہم تحریک تھی اس تحریک کی بنیاد کارل مارکس ، کے نظریات پر رکھی گئی اس کے منشور کے مطابق پیاس غربت ، افلاس اور سماجی پستی کے خاتمے کی کوشش اس تحریک کے مقاصد تھے۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس میں ان تمام مقاصد کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ادب برائے زندگی کے نظریہ کے تحت ادب تخلیق ہونے لگا۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص: 100

[2] سخن ہائے گستر انہ۔ ص 309

جابجا ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ ان ناقدین میں سے ہیں جنہیں ترقی پسند نظریہ ادب سے سخت اختلاف رہا ہے۔ایک جگہ ترقی پسند ادیبوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''روس والے جب ادب پیدا نہ کر سکے تو انہوں نے پڑھنے والے پیدا کر لیے لیکن ہمارے ترقی پسند تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کہ ادب پیدا کر سکے نہ پڑھنے والے۔''[1]

مشفق خواجہ کو دراصل اس تحریک سے اختلاف اس وجہ سے ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے تخلیق ادب میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا ان کی زیادہ توجہ سماجی اور سیاسی محاذ پر رہی ان کے مطابق اس تحریک کے زیر اثر ادب تخلیق تو ہوا لیکن اعلیٰ اور معیاری ادب کا میدان خالی ہی رہا۔ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے اپنی زیادہ تر توانائی صرف نظریے کی تشہیر اور تبلیغ میں صرف کی اور ان کے ادب میں تحریر سے زیادہ تقریری بیانات پائے جاتے ہیں ان کے ہاں قلم کی زبان خاموش ہے لیکن اہل قلم کی زبان ہمہ وقت مصروف کلام دکھائی دیتی ہے اور گفتگو کا موضوع ہمیشہ ''ترقی پسندی کے فائدے'' میں رہا۔چنانچہ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں مشفق خواجہ مزاحیہ انداز میں ترقی پسندوں پر اعتراض کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''زبانی جمع خرچ سے ترقی پسندوں کو کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ ایک عرصہ سے انہوں نے لکھنے لکھانے کا کام شروع کرنے سے پہلے ہی چھوڑ رکھا ہے ''گفتگو تحریر کا نعم البدل بن چکی ہے۔حد تو یہ ہے کہ ''گفتگو'' کے نام سے کتاب بھی چھپ گئی ہے۔اس کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے ''ترقی پسند تحریک'' کے نظری مسائل، اثرات اور مخالفین کے اعتراضات پر مشاہرین ادب سے بات چیت''۔

لفظ ''مشاہرین'' کا استعمال قابل غور ہے۔ہم سے یہ معمہ حل نہ ہوا تو استاد

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ص60

لاغر مرادآبادی کو زحمت فکر دی گئی۔انہوں نے فرمایا: ''مشاہرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو مشاہرہ لے کر.....۔''ہم نے استاد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا ''مشاہرین'' کا ''مشاہرے'' سے کیا رشتہ جوڑنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ہم نے عرض کیا ''اس میں کچھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے'استاد نے فرمایا: ''ہاں اس کا بھی امکان ہے۔آخر خود ترقی پسند تحریک بھی تو ہماری تاریخ ادب میں کتابت کی ایک غلطی ہی تو ہے''۔[1]

مشفق خواجہ ترقی پسند شاعری کے مزاج شناس ہیں اور ترقی پسند شاعری کے کمزور پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہیں اور اپنے کالموں میں جابجا ان کمزوریوں پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند شاعری تنگ دامانی کا شکار ہے اور یہ تنگ دامانی موضوعات اور لفظیات دونوں سطح پر دیکھی جاسکتی ہے چنانچہ ترقی پسند شاعری کی تنگ دامانی پر جوش اور فیض کی نظموں کے عنوانات کی یکسانیت کے حوالے سے طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زنجیر، رقص، دار و رسن مقتل، تیرگی اور روشنی جیسے پچیس تیس لفظوں کے استعمال سے آفاقی شاعری کی ہے..... ۔محدود تعداد میں الفاظ استعمال کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی بھی موضوع کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوسکتی ایک ہی جیسے الفاظ کے استعمال سے برابر کا سلوک ہوتا ہے۔اپنی اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کریں گے۔''امکان'' (ترقی پسند شاعر مسلم شمیم کا شعری مجموعہ) میں جوشؔ اور فیضؔ پر دو الگ الگ نظمیں شامل ہیں۔اگر ان نظموں کے عنوانات باہمی طور پر تبدیل کردئے جائیں تو جوشؔ و فیضؔ کو پیش کردہ خراج عقیدت کی معنویت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔جوشؔ کے بارے میں جو آزاد نظم ہے۔اُس

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔272۔

کے چند مصرعے یہ ہیں،۱۔متاع عظمت انسانیت،۲۔سفیر صبح تمنا،۳۔رقیب تیرہ شبی ،۴۔وہ انقلاب جہاں کا نقیب خوش آہنگ۔۵۔ وہ صلح کل کا پیمبر،۶۔دیار حسن کی تنویر،عشق کی تصویر۔فیض سے متعلق نظم میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ یہ ہیں ۔۱۔متاع دیات ۔۲۔نئی سحر کا نقیب،۳۔تیرگی کا رقیب۔۴۔انقلاب کا مطرب،۵۔صلح کل کا سمندر،۶۔دیار حسن کا محرم،ہم نے نمبر شمار اس لیے درج کیے ہیں کہ دونوں نظموں کی یکسانیت کا نمبر وار مطالعہ کیا جا سکے''۔[1]

ایک جگہ رفیق چوہدری صاحب کی آپ بیتی ''میری دنیا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں اور ان کے مقاصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''چودھری صاحب مشاق افسانہ نگار ہیں،انہیں بات کہنے ہی کا نہیں بات بنانے کا بھی فن آیا ہے۔ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر انہوں نے تفصیل سے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کا سب سے بڑا کام جلسے کرنا اور جلوس نکالنا تھا۔ان لوگوں نے کئی کامیاب کانفرنسیں کیں اور کئی کئی میل لمبے جلوس نکالے۔بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ترقی پسندوں نے ادب کی تخلیق میں بھی حصہ لیا ہے یا نہیں۔ہمارے خیال میں یہ اعتراض کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ادب تخلیق کرنا ترقی پسندوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں ادب تخلیق ہو سکے۔افسوس کہ اب تک ایسے حالات بھی پیدا نہیں ہوئے۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک ادب کی بجائے حالات کا شکار ہوگئی''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں ترقی پسند تحریک کے موضوعات کی یکسانیت اور تکرار اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی خامیوں کو سخت طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس موضوع پر سبھی براہِ راست اظہار خیال

---

[1] سخن در سخن، ۔ص 141

[2] خامہ بگوش کے قلم سے۔ص: 199

کرتے ہیں تو کبھی بالواسطہ۔ بالواسطہ اظہار کے لیے وہ کسی ادیب یا شاعر کے ایسے انٹرویو کو اپنے کالم کا موضوع بناتے ہیں جس میں ترقی پسند ادب اور ادیب کو زیر بحث لایا گیا ہو۔ اس طرح ان انٹرویوز کے حوالے سے وہ اپنی بات کو کامیابی سے پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً مجروح سلطان پوری اپنے ایک انٹرویو میں ترقی پسند شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ پہلے شاعری ہونی چاہیے، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا سوال بعد میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مجروح سلطان پوری کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے مزاحیہ انداز میں ترقی پسندوں کو یوں طنز کا نشانا بنایا ہے:

> ''پچھلے دنوں وہ (مجروح سلطان پوری) پاکستان تشریف لائے تھے تو ان کا ایک طویل انٹرویو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا..... وہ فرماتے ہیں: ''پہلے شاعری ہونی چاہیے، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا سوال بعد میں ہونا چاہیے''۔ خدا جانے مجروح صاحب کس قبیل کے ترقی پسند ہیں جو شاعری کو ترقی پسندی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو ترقی پسندی ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ باقی ساری چیزوں کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے جب سے ترقی پسند تحریک کی پچاس سالہ برسی یعنی جوبلی منائی گئی ہے تب سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ادیب کو لکھنے پڑھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اُس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے ترقی پسند ہونے کا اعلان کر دے''۔[1]

ایک جگہ اختر الایمان نے اپنے ایک انٹرویو میں ترقی پسند شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ ''اکثر ترقی پسند احباب کی شاعری کلامِ موزوں سے آگے نہیں جاتی، مجاز، فیض، مخدوم اور فراق وغیرہ ایک حد تک ٹھیک ہیں''۔ اختر الایمان کی اس رائے سے مشفق خواجہ کو اتفاق نہیں ہے وہ چوں کہ ادب میں اعتدال کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے وہ اس طرح کی رائے کو ذاتی مانتے ہیں اور اس طرح رائے پر اعتراض کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ص 312

''اس وقت ہمارے سامنے اختر صاحب کی وہ طویل گفتگو ہے جو رسالہ'' طلوع افکار'' کراچی کے دسمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔اختر صاحب نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو کچھ کہا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے صرف بڑے شاعر ہی نہیں،اکیلے شاعر بھی ہیں۔یعنی ان کے علاوہ کوئی قابل ذکر شاعر موجود نہیں ہے۔ترقی پسند شاعروں کو انہوں نے یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ : '' اکثر ترقی پسند احباب کی شاعری VERCIFCATION یعنی کلام موزوں سے آگے نہیں جاتی''۔مجاز،فیض ،مخدوم اور فراق کو تو وہ کسی حد تک شاعر مان لیتے ہیں لیکن باقی سب کی شاعری انہیں تخلیقی شاعری سے باہر کی چیز نظر آتی ہے''

انہوں نے دو نمائندہ ترقی پسند شاعروں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام لے کر ایسی باتیں کہی ہیں جن کی توقع کسی بھی با مروت شخص سے نہیں کی جاسکتی۔سردار جعفری کو شاعر نہیں ''موزوں طبع'' قرار دیا ہے۔اور کیفی اعظمی کے بارے میں فرمایا ہے:''ایک اور شاعر ہیں کیفی اعظمی،بڑا نام ہے،آئے دن ان کے جشن ہوتے رہتے ہیں ترقی پسندوں کے مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ہماری بھی دوستی ہے لیکن شاعری کے معاملے میں انہیں Genuin شاعر نہیں سمجھا ان کے ہاں Vercification کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔اب آپ اپنی کوشش اور اپنے گروپ کی کوشش سے تو شاعر نہیں بن سکتے۔یہ تو خداداد معاملہ ہے۔تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ایسے بے شمار لوگ ہیں جو پروپیگنڈے کے زور پر راتوں رات شہرت حاصل کرلیتے ہیں لیکن ایسی شہرت کس کام کی اور وہ کتنے دن چل سکے گی''۔ترقی پسندوں سے ہمیں بھی بہت سی شکایات ہیں۔مثلاً ایک شکایت یہ ہے کہ جب شعر و شاعری کے بغیر بھی آدمی ترقی پسند بن سکتا ہے تو پھر شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔لیکن اختر صاحب کی ناراضی کچھ ذاتی قسم کی معلوم ہوتی

ہے۔"[1]

مذکورہ اقتباس میں مشفق خواجہ بظاہر بعض اہم ترقی پسند شاعروں کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں لیکن بین السطور ترقی پسند شاعری کے مجموعی معیار اور مزاج کے بارے میں اپنے خیالات اور شکایات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے بارے سبھی واقف ہیں کہ یہ تحریک سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اور محنت کش غریب طبقہ کی حمایت میں شروع ہوئی تھی، لیکن مشفق خواجہ کے مطابق ہے جس اعلیٰ پیمانہ پر بڑے بڑے ہوٹلوں میں اس تحریک کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اس تحریک سے جڑے ہوئے لوگ بھی کسی سرمایہ دار سے کم نہیں ہے چنانچہ نہایت سخت لہجے میں وہ ان کے شاہانہ وضع وقطع اور طور طریقوں پر اعتراض کرتے ہیں:

> "ترقی پسند کون سے ایسے غریب الغربا ہیں کہ انہیں سرمایہ داروں سے کمتر سمجھا جائے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اجلاس منعقد فرمایا وہیں مندوبین کے قیام کا انتظام کرنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ترقی پسند غریبوں کے ہمدرد ضرور ہیں، لیکن اتنے بھی عاقبت نا اندیش کہ اس مقصد کی خاطر اپنی شاہانہ وضع چھوڑ دیں"۔[2]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ پہلے تو ترقی پسند مصنفین لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے لیکن موجودہ دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں ادیب کوئی نہیں رہا بلکہ سرکاری مخبر رہ گئے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس صورتِ حال افسوس کرتے ہوئے وہ لاغر مرادآبادی کے حوالے سے طنز کرتے نظر آتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> "پرانے ترقی پسندوں میں کم از کم یہ خوبی تھی کہ وہ سرکاری مخبروں سے ہاتھا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص ۲۴۷۔

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص 294۔

پائی کرتے کرتے پانی کے میں غریق رحمت ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے، اوراب یہ حال ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں سرکاری مخبر ہی باقی رہ گئے ہیں، اصلی ترقی پسند دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لیے تو استاد لاغر مرادآبادی نے پچھلے دنوں یہ تجویز پیش کی تھی کہ انجمن میں جہاں بہت اسی تبدیلیاں آئی ہیں وہاں نام کی تبدیلی بھی عمل میں آنی چاہیے۔ نیا نام انجمن ترقی پسند مخبرین ہونا چاہیے ہمیں اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ نام میں کچھ نہیں رکھا۔ اصل چیز کام ہے اور کام جاری رہنا چاہیے۔''[1]

غرض ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں کی صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جگہ جگہ انھوں نے ان کی خامیوں اور کمیوں کے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔

مشاعرے

ہماری ادبی سرگرمیوں میں ایک اہم سرگرمی مشاعرے منعقد کرنا بھی ہے مشاعرے منعقد کرنے کی روایت ہمارے ادب میں زمانے قدیم سے چلی آرہی ہے مشاعرہ دراصل ایک ایسی سرگرمی ہے جس میں ادب اور شعر گوئی سے معمولی دلچسپی رکھنے والا شخص بھی اس میں شرکت کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور ان مشاعروں سے متاثر ہوکر وہ اپنی ذوق شعر گوئی کو اور تقویت دیتا ہے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں مشاعرے بہت متاثر کن ہوتے تھے اور ہر مشاعرے میں کچھ شعرا ایسے ضرور ہوتے جو بعد میں سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہ جاتے تھے، ان کے مطابق موجودہ دور میں مشاعرے کی صورتِ اس کے برعکس ہوگئی ہے آج کے مشاعرے میں ایسے ایسے اشعار پڑھے جارہے ہیں جس کا یاد رکھنا تو کیا سننا بھی اخلاق و شائستگی کے باہر ہوتا ہے چنانچہ موجودہ دور کے مشاعروں کی اس ناگفتہ صورتِ حال پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔201

''ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں ایسے شعر پڑھے جاتے تھے جنہیں سن کر چھتیں اڑ جاتی تھیں مگر اب یہ حال ہے کہ مشاعرہ سنتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں زمین شق نہ ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے زمانے کے مشاعروں میں صرف شاعر کلام سناتے تھے اور ہر مشاعرے کا حاصل دو چار شعرا ضرور ہوتے تھے جو سننے والوں کو یاد رہ جاتے تھے۔ مگر اب یہ حال ہے کہ مشاعروں میں اور سب کچھ مل جاتا ہے، اچھے شعر ہی دستیاب نہیں ہوتے۔ ایسے شعر پڑھے جاتے ہیں جنہیں یاد رکھنا تو کیا سننا بھی شائستگی کے منافی ہوتا ہے''۔[1]

مشفق خواجہ نے مشاعرے میں مدعو کیے جانے والے شعرا کو بھی طنز کا نشانہ بنا ہے ان کے مطابق کراچی کے مشاعروں میں ایسے شعراء کو بلانے کا رجحان عام ہو رہا ہے جن کا مقصد صرف مشاعرے میں شرکت کرنے کا ہوتا ہے اور کچھ نہیں وہ لکھتے ہیں:

''کراچی کے مشاعروں میں صرف وہی شاعر چلائے جاتے ہیں۔ جن کے پیش نظر مشاعروں میں شمولیت کے سوائے کوئی مقصد نہیں ہوتا''۔ [2]

موجودہ زمانے میں مشاعروں میں مدعو کیے جانے والے کچھ شعرا ایسے ہوتے ہیں جو پہلی اور آخری مرتبہ انہیں مشاعروں میں بحیثیت شاعر متعارف ہوتے ہیں اس کے بعد ادب اور شعر و شاعری کے کسی صفحے پر نظر نہیں آتے اس صورت حال کو بھی مشفق خواجہ ''سادات امروہہ کے مشاعروں کے حوالے سے یوں گرفت میں لیتے ہیں:

''ویسے تو کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے لیکن یہاں سنجیدہ ادبی تقریبیں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔ سال بھر رونمائی کے جلسے ہوتے ہیں یا سال میں ایک مرتبہ ساداتِ امروہہ والے ایک عدد مشاعرہ کر ڈالتے ہیں۔ مشاعرہ کیا یہ بھی ایک طرح کی تقریب رونمائی ہوتی ہے ایسے ایسے شعرا کو پڑھوایا جاتا ہے

---

[1] سخن در سخن۔ ص: 145

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص: 343

جن کے نام اور کلام سے پہلی اور آخری مرتبہ یہیں تعارف ہوتا ہے''۔[1]

مشفق خواجہ کے مطابق موجودہ دور کے مشاعرے ریڈیو کے پروگراموں کی طرح لمحاتی ہیں یعنی لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں اس کے علاوہ مشاعروں میں شعراء کے درمیان ہونے والی باہمی چپقلشیں کسی فساد سے کم نہیں ہوتیں چنانچہ انہوں نے سادات امروہی کے مشاعرے کے حوالے سے ایسے شاعروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جو باہمی چپقلشوں سے فساد برپا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ساداتِ امروہہ کے مشاعرے میں پڑھا جانے والا کلام ہو ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام ان کی اہمیت لمحاتی ہوتی ہے۔ لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ چند روز بعد کسی کو یاد نہیں رہتا کہ ریڈیو سے منی بیگم نے ناصر زیدی کی غزل گائی تھی یا ناصر زیدی نے منی بیگم کا کلام سنایا تھا۔ مشاعروں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مشاعرہ سادات کا تھا یا فسادات کا کیوں کہ مشاعروں میں شاعروں کی باہمی چپقلش خاصی فساد انگیز ہوتی ہے''۔ [2]

مشاعروں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اکثر شعراء اپنا کلام سناتے وقت کبھی کبھی اعلان کر دیتے ہیں کہ ''یہ شعر مجھے خود بھی بہت پسند ہے''۔ مجروح سلطان پوری سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے ایسے شعرا کو انھوں نے احمق کہا تھا۔ مجروح سلطان پوری کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مشفق خواجہ مشاعروں میں پیش کیے جانے والے اشعار اور شاعری کے معیار پر طنز کیا ہے وہ واقعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مجروح صاحب سے پوچھا گیا کہ اُن شاعروں کے بارے میں آپ کی کیا

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص۔268۔

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص :219

رائے ہے جومشاعرے میں کلام سناتے وقت یہ کہتے ہیں کہ اپنا یہ شعر مجھے خود بھی بہت پسند ہے۔ مجروح صاحب نے فرمایا: ''جوشعرا ایسا کہتے ہیں وہ نہایت احمق ہوتے ہیں'' اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اگر کسی شاعر کو اپنا کوئی شعر پسند ہے تو مشاعرے میں اس کا اعلان کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس طرح یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس شعر کو کم از کم ایک شخص نے پسند کیا ہے۔ اگر مشہور شاعر بشیر بدر کی نظر سے ہمارا یہ کالم گزرے تو ان سے گزارش ہے کہ وہ مجروح صاحب کی بات کا برا نہ مانیں۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ کیا جانیں کہ مشاعرے میں شاعر وہی شعر سناتا ہے اسے پسند ہوں ناپسندیدہ شعر تو دیوان کی صورت میں چھپوا دیے جاتے ہیں مشاعرے میں نہیں سنائے جاتے''۔[1]

قاری

مشفق خواجہ نے جہاں ادب کے دیگر کئی مسائل کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے وہیں قاری پر بھی طنز کی ضرب لگائی ہے۔ موجودہ دور میں ایک طرف قاری کم سخن فہمی کا شکار ہے تو دوسری طرف معاشی بد حالی اور بے حسی۔ دونوں صورتوں میں قاری ذوق مطالعہ سے دور ہیں۔ ایک جگہ قاری کی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جناب عالم تاب تشنہ کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کے دو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں بہت ایسے شعر ہیں جو دل اور دماغ پر بیک وقت اثر کرتے ہیں، بشرط یہ کہ قاری کے پاس یہ دونوں چیزیں ہوں''۔[2]

اسی طرح آگے قاری کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ۔313۔

[2] سخن ہائے گسترانہ ،ص:341

''انیس ناگی ادب کے جس مقام پر فائز ہیں، وہاں وہ تنہا ہیں، اُن کا کوئی حریف نہیں۔حریف تو کیا قاری بھی کوئی نہیں کیوں کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔آج کے قاری کے پاس کتاب خریدنے کے لیے تو پیسے ہوتے نہیں علم حاصل کرنے کے وسائل کہاں ہوسکتے ہیں؟''[1]

موجودہ دور کے قاری کی کم سخن فہمی کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف اخباری زبان سمجھتا ہے تہذیبی و ادبی زبان سے اس کا رشتہ بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے سلیس و عام فہم زبان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بھی موجودہ دور کے قاری کو شرح کی ضرورت ہوتی ہے۔چنانچہ قاری کی اس کم فہمی پر طنز کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''جوش کے کلام سے براہ راست استفادہ کوئی نہیں کرتا، ان کے بارے میں چھپنے والی کتابیں استادے کا ذریعہ بنتی ہیں۔جوش کا براہ راست مطالعہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت سے بے گانہ ہوگئے ہیں۔تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا مظہر زبان ہوتی ہے۔زبان سے اب ہمارا تعلق اتنا ہی رہ گیا ہے کہ ہم اخباری زبان سمجھ لیتے ہیں۔آج کا قاری جوش کی شعری فرہنگ سے یکسر نا بلد ہے۔اگر یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب جوش کو بھی غالب کی طرح شارحین کی مدد سے پڑھا جائے گا''[2]

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں ادبی معاشرے کی منفی روایات اور سطحی اقدار کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے کالموں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صحت مند ادبی معاشرے کی تشکیل کے آرزو مند ہیں جس کی بنیادیں شائستگی، سنجیدگی اور آگہی سے مضبوط ہوتی ہیں۔ان کے مطابق ایک تخلیق کار کو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہیں کرنی چاہیے شہرت اور مفادات سے بے نیاز ہوکر ہی فن کار صحیح معنوں میں شعر و ادب کی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن موجودہ دور میں صورت اس کے برعکس ہے۔ بیشتر ادیب مادی

---

[1] سخن در سخن۔ص 132

[2] سخن در سخن، ص 165۔

صورتوں میں اپنی تخلیق کے انعام کے طلب گار ہیں اس اعتبار سے بھی ہمارا ادبی کلچر زوال اور اغلاط کا شکار ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں اس زوال کے اسباب اور عوامل کو مدلل و مفصل اور مضحکہ خیز انداز میں بیان کیا ہے۔

مشفق خواجہ کے ان کالموں سے ہمارے ادبی معاشرے کے مزاج کی عکاسی ہوتی ہے مشفق خواجہ نے جن ادبی موضوعات کو طنز و مزاح کا نشانا بنایا ہے۔ ان میں چند موضوعات ادب کی دنیا میں مستقل اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جسے کتابوں کی اشاعت، اجراء کی تقاریبیں، اپنے بارے میں تعریفی و توصیفی مضامین لکھوانا، ستائش کی تمنا، ادب کے نام پر ایسی محفلیں آراستہ کرنا جس سے غیر ادبی ماحول پیدا ہو جائے وغیرہ۔

انھوں نے نہ صرف ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی ان خامیوں اور غیر شریفانہ صفات پر غم و غصہ کے اظہار کیا بلکہ اصناف ادب کی خامیوں اور ادبی اداروں کے معیارات اور ان کی ناگوار صورت حال پر اعتراض کیا ہے۔ ایسے موضوعات پر لکھتے وقت وہ اکثر جگہوں پر ان کے یہاں غصے کی اور تیز ہو جاتی ہے۔ جھلاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ توازن نہیں گنواتے شائستگی کا دامن تار تار نہیں کرتے بلکہ بڑے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ ادب کی اس ناہموار صورتحال پر بڑے سخت لہجے میں طنز کرتے ہیں دراصل ادب اور اس کے معیار کا خاص خیال رہتا ہے۔ انہیں ادب اور ادیبوں سے ہمدردی ہے اور وہ ان کی خامیوں اور کمیوں کو بے نقاب کر کے اس کی تبدیلی کے خواہاں ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس صورتحال کو یکسر بدل دینا چاہتے تا کہ ادب کا معیار بہتر ہو جائے اور ہمارے تخلیق کاروں کی حالت سدھر جائے اور وہ اپنے مالی منفعت کے لیے بلکہ خلوص دل سے ادب ترقی کے لیے کار بند رہے اور یہی مشفق خواجہ کا بھی مقصد رہا ہے کہ وہ ادب کو ہر حال میں بہتر دیکھنا چاہا ہے۔

(ب) اسلوب اور تکنیک

اُسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ،طریقہ ،راستہ روش کے ہوتے ہیں،ادب میں اسلوب سے مراد کسی شاعر یا ادیب کے ادائے مطلب کا وہ انداز اور جذبات وخیالات کے اظہار و بیان کا وہ طریقہ ہے جو مصنف کی انفرادی خصوصیات سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مصنف کی یہ انفرادی خصوصیات جہاں اس کے انتخاب و استعمال الفاظ اور جملوں کی ساخت وترتیب سے ظاہر ہوتی ہے وہیں یہ مصنف کے مزاج کردار ماحول، مطالعہ، مشاہدہ اور اندازِ فکر جیسے عوامل سے بھی تشکیل پاتی ہیں غرض انفرادی خصوصیات کی اس رنگارنگی سے ہی مختلف اسالیب وجود میں آتے ہیں جیسے تعقیدی اسلوب، مقفّٰی و مسجع ،اسلوب، سپاٹ وسادہ اسلوب، بیانیہ توضیحی اسلوب، شگفتہ اور تاثراتی اسلوب، خطیبانہ اسلوب، ظریفانہ اور طنز آمیز اسلوب وغیرہ۔

مشفق خواجہ کے کالموں کا اسلوب ظریفانہ اور طنزیہ اسلوب ہے۔ اپنے کالموں کے اسلوب کی بدولت ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ابھر کر آتے ہیں۔ ان کے کالموں میں طنز ومزاح کا ایک دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔

مزاح اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی اور ماحول کی ناہمواریوں اور بے ربطیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مزاح نگار گرد پیش کے ماحول کی ناہمواریوں اور بے قاعدگیوں کو دریافت کرتا ہے اور انہیں ہمدردانہ شعوار کے ساتھ فنکارانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری خندۂ زیرلب کی کیفیت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ بقول اسٹیفن لی کاک کے:

> ''مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے
> جس کا فنکارانہ اظہار ہوجائے''۔ [1]

مزاح نگار مختلف حربوں سے کام لیتے ہوئے، تبسم، شگفتگی اور تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے اور طنزیہ و

---

[1] بحوالہ، وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، ص: 47

مزاحیہ ادب میں وہی حربے تکنیک کہلاتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیقی مزاح کے پانچ بنیادی حربے بیان کیے ہیں۔جیسے : ۱)۔موازنہ،۲)۔لفظی بازیگری،۳)۔مزاحیہ صورت واقعہ،۴)۔مزاحیہ کردار، اور ۵)۔تحریف۔

اسی طرح طنز سے مراد زندگی کے تضاد، اس کی زیادتیوں اور بے انصافیوں پر غم وغصہ کا اظہار کرنا ہے۔وزیر آغا طنز کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور حساس اور دردمند انسان کے ذہنی رد عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہو''۔ [1]

[1]۔وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، ص: 56

خواجہ عبدالغفور طنز کی تعریف کرتے ہوئے اس کی کئی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طنز تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دُشنام یار ہے، تبصرہ ہے، تازیانہ ہے، اس کا مقصد اصلاح ہے، پگڑی اچھالنا ہے۔احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے، بے ہودہ اشیاء اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے''۔ [1]

طنز دراصل اپنے معاشرے اور ماحول سے بے اطمینانی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔طنز نگار اپنی ناپسندیدہ اشیاء کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی نفرت یا ناپسندیدگی کا اظہار براہ راست نہیں کرتا بلکہ اس کی زبان سے ایسے جملے ادا ہوتے ہیں جو تلخی کے باوجود لطافت کی چاشنی لیے ہوتے ہیں، بقول وزیر آغا:

''طنز کے لیے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔دوسرے پردہ دری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فن کارانہ پیرایۂ اظہار اختیار کرے، تیسرے کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ دری کو

---

[1]۔ بحوالہ خواجہ عبدالغفور، ''طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ، ص ۷۹

زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنائے"۔ [1]

غرض طنز میں زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو لطیف پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے کہ ہم ان کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی بات بری بھی نہ لگے۔

مزاح کی طرح طنز میں بھی موازنہ، مبالغہ لفظی بازی گری اور تحریف، اور رمز جیسے حربے استعمال ہوتے ہیں لیکن مزاح کے برعکس طنز میں نشتریت کا پہلو زیادہ غالب رہتا ہے اور اپنے نشانہ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں طنز و مزاح کی یہ بنیادی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں انہوں نے اپنے ظریفانہ کالموں میں طنز و مزاح کی مذکورہ تمام خصوصیات کے علاوہ دیگر کئی اجزاء کا استعمال کیا ہے۔ جیسے لطیفہ گوئی، چٹکلہ بازی، خود برداشتہ مزاح، بذلہ سنجی، محاوروں کا استعمال اور ان کی تحریف، ضرب المثال اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کے علاوہ تراکیب، تجنیس، تکرار، تضاد، تشبیہ، استعارہ، اشعار اور مصرعوں کا استعمال اور ان کی تحریف اور تلمیحات وغیرہ، اہمیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں انہیں حربوں کا جائزہ لیتے ہوئے مشفق خواجہ کے اسلوب اور اس کی تکنیک کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے:

موازنہ:

موازنہ طنز و مزاح کی تخلیق کا ایک اہم حربہ ہے جس میں کسی غیر معروف ہستی کا، کسی نامی گرامی ہستی سے مقابلہ کر کے ہنسی اُڑائی جاتی ہے اس کے علاوہ موازنہ دو اشیا کے مابین وہ تقابلی صورت ہے جو بیک وقت مشابہت اور تضاد کو نمایاں کرتی ہے۔ اور اس عمل سے ناہموار صورت حال پیدا ہوتی ہے جو ہنسی کا باعث بنتی ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جا بجا اس حربے کا استعمال کر کے طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔

مثلاً مشفق خواجہ کے نزدیک کسی شاعر کے اوصاف میں سب سے پہلا وصف اس کا صاحبِ کتاب ہونا ہوتا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں کسی شاعر کے مجموعہ کا شائع نہ ہونا اس کی شاعری کی خوبی سمجھی

---

[1] بحوالہ، وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص: 58

جارہی ہے کیونکہ پہلے زمانے میں مجموعہ کلام کی اشاعت سے شاعر کے کلام کی خوبی معلوم ہوتی تھی اب خامیاں سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعروں کی اس صورتِ حال کو ماضی اور حال کے موازنے کے ذریعہ یوں طنز کرتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا کہ جب کسی شاعر کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے تو سب سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کسی شاعر کا مجموعہ شائع نہ ہوا ہو تو اُسے شاعر کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں شاعر کے مجموعے سے اس کے کلام کی خوبیوں کا انداز ہوتا تھا۔ اب خامیاں سامنے آجاتی ہیں''۔ [1]

مشفق خواجہ نے بعض کتابوں اور آدمیوں میں مماثلت بھی تلاش کی ہے بعض آدمیوں کی خرابیوں کے پیش نظر جس طرح ہم ان سے دور بھاگتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اسی طرح ہم بعض کتابوں کی خامیوں کی بدولت اس کے قریب نہیں جاتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے موازانہ کے ذریعہ ان آدمی اور کتاب کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

''آدمیوں اور کتابوں میں کچھ اور مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض کتابیں دور سے اچھی لگتی ہیں۔ ان کے قریب جانے سے خوف آتا ہے یا ان کے حسن کے زائل ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ بعض کتابوں کی رفاقت چند لمحوں کے لیے تو ٹھیک ہوتی ہے کہ ادھر اُدھر سے ورق گردانی کر لی۔ انہیں شروع سے آخر تک لکھنا تو کارِ ثواب ہو سکتا ہے، لیکن پڑھنا کارِ عذاب ہوتا ہے۔ جس طرح بعض آدمی رونق محفل بڑھاتے ہیں، اُسی طرح بعض کتابوں کی ضخامت سے یا سرورق کے رنگوں کے دھنک سے بک شیلف کے وقار یا حسن میں اضافہ ہوتا ہے، جس طرح بعض آدمیوں سے زندگی بھر کی ملاقات کے باوجود تعلقات سلام

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 256

> دعا کی حد سے آگے نہیں بڑھتے، اسی طرح بعض کتابوں سے بھی واقفیت صرف اتنی ہی رہتی ہے کہ ان کا اور ان کے مصنف کا نام یاد رہ جاتا ہے، اس سے آگے حافظہ کام نہیں کرتا، جس طرح اکثر آدمیوں کی صورت سے سیرت کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح فلیپ پر درج عبارتوں سے کتابوں کی اصلیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اکثر اوقات یہ عبارتیں قاری اور مصنف دونوں کو گمراہ کرتی ہیں''[1]

مشفق خواجہ جس طرح ہمارے ادب کی موجودہ صورت حال پر کبھی ماضی اور حال کے موازنے کے ذریعے تو کبھی آدمی اور کتابوں کی خصوصیات کے ذریعہ موازنہ کر کے ان کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے اسی طرح انھوں نے بعض کٹر پسند ناقدین کو نادر شاہ جیسے ظالم اور بے درد حملہ آور اور محمود غزنوی جیسے جابر حکمراں وحملہ آور سے موازانہ کر کے ان کی تنقید کو نشانہ طنز بنایا ہے اور یہی ان کے طنز کی اہم خصوصیت ہے۔

مشفق کے مطابق شمیم احمد ایسے نقاد ہیں جو اپنی ذہانت سے آلہ حرب وضرب کا کام لیتے ہیں۔ یعنی وہ جب کسی شاعر یا نقاد کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو محمود غزنوی کا ہندوستان پر حملہ اور نادر شاہ کا قتل عام یاد آتا ہے چنانچہ شمیم احمد کی تنقید کو محمود غزنوی اور نادر شاہ کے حملوں سے موازنہ کرتے ہوئے اس طرح مزاح پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> ''شمیم احمد کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ ہمارے ان ذہین ترین نقادوں میں سے ہیں، جو اپنی ذہانت سے آلہ حرب وضرب کا کام لیتے ہیں یعنی جب وہ کسی شاعر یا ہم پیشہ نقاد کے بخیے ادھیڑنے پر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے محمود غزنوی کی فوج ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ لیکن شمیم احمد ایک ہی سانس میں سترہ سے کہیں زیادہ حملے کر ڈالتے ہیں۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ شمیم احمد قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں اور نادر شاہ کی طرح ہمیشہ قتل عام پر کمر

---

[1] سخن ہائے گسترانہ۔ ص: 217

باندھے رہتے ہیں۔ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔شمیم احمد قلم سے تلوار کا نہیں،
تلوار سے قلم کا کام لیتے ہیں، اسی لیے جوان کی زد میں آتا ہے، پانی بھی نہیں
مانگتا"۔ ۱

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ شاعر منظر علی خان کے مجموعہ کلام کے دیباچہ نگار نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ شاعری کے بجائے نثر کی طرف توجہ دیں تو زیادہ کامیاب رہیں گے منظر علی خان نے دیباچہ نگار کے اس مشورہ پر عمل کیا اور مشہور مزاح نگار اور انشائیہ نگار بن گئے اور ان کے مضامین رسالوں میں اس کثرت سے چھپنے لگے ہیں جیسے اخبار میں اشتہار چھپتے ہیں گویا مشفق خواجہ نے منظر علی خاں کے مضامین کو رنگ گورا کرنے والی کریم کے اشتہار سے موازنہ کرتے ہوئے طنز کیا ہے وہ لکھے ہیں:

"منظر علی خان کے مجموعہ کلام کے دیباچہ نگار نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ
شاعری کی بجائے نثر کی طرف توجہ کریں تو زیادہ کامیاب رہیں گے۔منظر
صاحب نے اس مشورہ پر عمل کیا اور آج ان کا شمار ملک کے مشہور مزاح نگاروں
اور انشائیہ نویسیوں میں ہوتا ہے۔ان کے مضامین رسالوں میں اس کثرت سے
چھپتے ہیں کہ اتنی کثرت سے تو رنگ گورا کرنے والی کریم کے اشتہار بھی نہیں
چھپتے"۔ ۲

آغا اشرف اپنی آپ بیتی "ایک دِل ہزار داستان" میں اپنے عشق کی کئی داستانوں کو نہایت جرأت اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔مشفق خواجہ نے آغا اشرف کی اس بے باکی کو سردار دیوان سنگھ مفتوں کی بے باکی سے موازنہ کر کے مزاح پیدا کیا ہے فرماتے ہیں:

"انہوں نے اپنے عشق کی بہت سی داستانوں سے کتاب کے صفحات رنگین
کیے ہیں۔ایک محتاط انداز کے مطابق اوسطاً فی صفحہ دو معاشقے بیان کیے گئے

۱۔سخن ہائے گسترانہ۔ص:203
۲۔سخن ہائے گسترانہ۔ص:72

ہیں۔مصنف نے نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنا کچا چٹھا اسی طرح
پیش کیا ہے جس طرح کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتوں دوستوں کا کچا چٹھا
پیش کیا کرتے تھے"۔ [1]

مشفق خواجہ نے نہ صرف ناقدین کے کٹر پن اور شدت پسندانہ رویے پر طنز کیا ہے بلکہ موازانہ جیسے حربے کا استعمال کر کے صنف غزل کے ساتھ ناانصافی برتنے والے شاعروں کو چنگیز وہلاکو جیسے ظالم وستم ڈھانے والے حملہ آور حکمرانوں کے مماثل قرار دے کر ان کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ غزل ایک مظلوم صنفِ سخن ہے کیوں کہ جو شخص بھی شاعری
کی طرف رخ کرتا ہے۔سب سے پہلے اسی کو تختہ مشق بناتا ہے اس صنف پر
شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں۔اگر انہیں بیان کیا جائے تو اُن کے سامنے
چنگیز وہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے، چنگیز وہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی
کبھار تھک بھی جاتے تھے،غزل کو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں"۔ [2]

مشفق خواجہ کے مطابق ندا فاضلی کراچی آئے اور چلے بھی گئے لیکن اخبارات میں ان کا ذکر تسلسل وتواتر سے ہو رہا تھا جیسے کسی بڑی یا عظیم شخصیت کا ہوتا ہے۔اسی لیے انھوں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ندا فاضلی کی شخصیت کا جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کی شخصیت سے موازنہ کرتے ہوئے یوں طنز کیا ہے:

"بھارتی شاعر ندا فاضلی یہاں آ کے واپس بھی چلے گئے لیکن کراچی کے
اخبارات میں ان کا ذکر اس تسلسل وتواتر کے ساتھ ہو رہا ہے جیسے جرنیل سنگھ
بھنڈراں والا کے بعد بھارت کی دوسری اہم شخصیت وہی ہیں"۔ [3]

۱۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:331
۲۔سخن ہائے ناگفتنی،ص:159
۳۔خامہ بگوش کے قلم سے،۔ص:180

لفظی بازیگری

لفظی بازیگری ظرافت کا ایک کارآمد حربہ ہے اس کی ایک معروف صورت رعایت لفظی ہے۔ رعایت لفظی سے مراد الفاظ کے اُلٹ پھیر سے اور ذو معنویت کا سہارا لے کر مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جو تلفظ میں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن معنی میں بالکل مختلف ہوتے ہیں جو ایک خاص مزہ دے جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں رعایت لفظی کا اظہار متعدد بار ہوا ہے یہ اظہار عام طور پر بے تصنع اور بے ساختہ ہوتا ہے اور اس میں برجستگی کا حسن پایا جاتا ہے۔ رعایت لفظی کی یہ خصوصیت مشفق خواجہ کے کالموں میں بھی نظر آتی ہے۔

ایک مرتبہ پروین شاکر نے اپنے ایک انٹرویو میں نہایت تلخ کلامی سے کام لیا ہے۔ ان کے اس انٹرویو پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی اس تلخ کلامی کو رعایت لفظی کے ذریعہ کتنی خوبصورتی سے طنز کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:

> ''حال ہی میں ایک اخبار میں پروین شاکر کا ایک دلچسپ انٹرویو چھپا ہے۔ اتنا دلچسپ کہ اس کے سامنے شاعرہ کا تازہ مجموعہ ''خود کلامی'' اچھی خاصی ''تلخ کلامی'' نظر آتا ہے''۔ [1]

''ادب لطیف'' کا شمار اردو ادب کے چند اہم رسائل میں ہوتا ہے کسی زمانے میں اس رسالہ کو ترقی پسند تحریک کا ترجمان کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے رعایت لفظی کے ذریعہ رسالہ ''ادب لطیف'' کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے مثلاً:

> ''کسی زمانے میں رسالہ ''ادب لطیف'' ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ یہ تحریک اپنی بہار جانفزا دکھلا کر رخصت ہو چکی ہے اس لیے اب ''ادب لطیف'' کا دارومدار ترجمانی پر نہیں ترجمے پر ہے''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 219

[2] سخن ہائے گستراخہ۔ ص: 57

پاکستان کے مشہور شاعر جون ایلیا کا دوبئ میں جشن منایا گیا تھا اور اس موقع پر اُن کا ایک مجموعہ کلام ''شاید'' شائع ہوا اور ساتھ ہی ان کی شخصیت اور فن پر ایک ضخیم مجلّہ بھی شائع کیا گیا جس میں ساٹھ، ستر ہم عصروں نے انہیں ''خراج تحسین پیش کیا ہے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بڑی ہی عمدگی سے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''دوبئ میں ان (جون ایلیا) کا جشن منایا گیا۔ اس موقع پر اُن کا مجموعہ ''شاید'' شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضخیم مجلّہ بھی منظر عام پر آیا جس میں ساٹھ ستر ہم عصروں نے انہیں ''خراج تحسین'' پیش کیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس خراج تحسین کے ڈانڈے ''تحسین ناشناس'' سے جا ملتے ہیں''۔ [1]

شاہد الوری کے ایک قطعات کے مجموعے کا نام ''چراغ سے چراغ'' ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق شاہد الوری نے ان قطعات میں غالبؔ کے مصرعوں پر مصرے لگائے یعنی تمام قطعات میں ایک مصرع غالبؔ کا اور تین مصرعے شاہد الوری کے ہیں چنانچہ مشفق خواجہ نے شاہد الوریٰ کی اس قطعات نگاری کی روِش پر اظہار خیال کرتے ہوئے لفظی بازی گری کے سہارے انہیں اس طرح نشانہ تمسخر بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''شاہد الوری نے اپنی کتاب کا نام ''چراغ سے چراغ'' رکھا ہے مطلب یہ کہ انہوں نے غالبؔ کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا چراغ تو جلالیا۔ لیکن، غالبؔ کا چراغ گل کر دیا''۔ [2]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو زبان و ادب کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند نے عطا کی ہے۔ مشفق خواجہ ان کی اس مہارت کو اس طرح رعایت لفظی کا ہدف بنایا ہے کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نارنگ لسانیات ہی کے نہیں لَسّانیات کے بھی ماہر ہیں کہ وہ کہیں اور

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص: 257

[2] سخن ہائے گسترانہ 356

سنا کرے کوئی"۔ [1]

فیض احمد فیض بلاشبہ اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں مشفق خواجہ کے مطابق محترمہ سرفراز اقبال نے اپنے نام فیض کے خطوط کو "دامن یوسف" کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ان خطوط میں فیض کا ایک خط اس طرح ہے کہ "کراچی سے روانگی سے پہلے تمہاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔تمہارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا، ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں۔لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تا کہ سند رہے۔اور تم بھاگ نہ سکو (ص:114)اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے رعایت لفظی کے ذریعہ یوں مزاح پیدا کیا ہے، لکھتے ہیں:

> "افسوس کہ فیض نے نہ جانے کن اندیشہ ہائے دور راز کی وجہ سے محترمہ کے سارے خطوط ضائع کر دیے اور ایک خط جو بطور سند کے یا محترمہ کو "بھاگنے" سے روکنے کے لیے محفوظ رکھا تھا، وہ بھی معلوم نہیں اب کہاں ہے۔کاش محترمہ اپنے خطوں کی نقلیں اپنے پاس رکھ لیتیں تو اُن کی شمولیت سے کتاب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی۔سہ آتشہ اس لیے کہ ایک آگ پڑھنے والے کے دل میں بھی تو بھڑک اٹھتی!"۔ [2]

اسی طرح ایک اور جگہ قمر جمیل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے اس طرح مزاح پیدا کرتے ہیں فرماتے ہیں:

> "ممکن ہے بعض حسد پیشہ کوتاہ اندیش اس بلب کو زیرو پاور کا بلب قرار دے دیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر جمیل ہزار کینڈل پاور سے کم نہیں ہیں۔وہ ایک ایسا چراغ انجمن افروز ہیں جس سے لوگوں کے ذہن کسبِ نور کرتے اور پھر بھی ماؤف نہیں ہوتے"۔ [3]

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:55

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:61

[3] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:90

مشفق خواجہ کے مطابق اختر الایمان خوش گو شاعر ہی نہیں خوش گفتار آدمی بھی ہیں وہ گفتگو بہت اچھی کرتے ہیں بعض اوقات گفتگو سننے والا شخص یہ سوچ میں پڑتا ہے کہ ان کی شاعری فکر انگیز ہے یا ان کی گفتگو غرض ان کی گفتگو کے لب ولہجہ کو سراہتے ہوئے رعایت لفظی کا بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے فرماتے ہیں:

> ''اختر صاحب خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار آدمی بھی ہیں گفتگو وہ بہت اچھی کرتے ہیں اتنی اچھی کہ بعض اوقات سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری زیادہ فکر انگیز ہے یا ان کی گفتگو..... بہت سے اخباروں رسالوں میں ان کے انٹرویو شائع ہوئے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ان ساری گفتگوؤں کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا جائے اختر صاحب کی شاعری کی کلیات ''سروسامان'' کے نام سے چھپی ہے۔ ان کی گفتگوؤں کا مجموعہ ''بے سروساماں'' کے نام سے چھاپا جا سکتا ہے۔ یہ نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ اختر صاحب نے اپنے انٹرویوز میں اپنے معاصرین کو شاعری کے اعتبار سے بے سروسامان ثابت کیا ہے''۔ [1]

اس طرح مذکورہ مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں لفظی بازی گری کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

مزاحیہ صورت واقعہ

مزاحیہ صورتِ واقعہ طنز ومزاح کا ایک اہم حربہ ہے اس میں کسی واقعہ کے ذریعہ مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ مزاحیہ صورت واقعہ کسی شعوری کاوش کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات، واقعات یا کردار کی مخصوص

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:246

ناہمواریوں سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔اس میں غلطی ، غلط فہمی، اور اتفاقِ وقت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔مزاحیہ صورتِ واقعہ کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''مزاحیہ صورتِ واقعہ کی کامیابی اس بات میں ہے کہ یہ کسی شعوری کاوش کی رہین منت نہ ہو بلکہ از خود حالات وواقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہوتی چلی جائے ۔چنانچہ صورت واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاقِ وقت (COINCIDENE) کو عام طور سے بروئے کار لاتا ہے''۔ [1]

مزاحیہ صورتِ واقعہ کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں حالات و واقعات ایک فطری بہاؤ کے تحت کسی ناہمواری کو جنم دیں، اس میں کسی شعور کاوش کو دخل نہ ہو اور مزاح نگار غلطی ،غلط فہمی اور اتفاق وقت کو بروئے کار لا کر مزاحیہ صورتِ واقعہ کی تخلیق کریں۔لہٰذا مشفق خواجہ کے یہاں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم ملتی ہے۔وہ ایک ماہر مزاح نگار کی حیثیت سے مزاحیہ صورتِ واقعہ کے ان تینوں عناصر سے مدد لے کر اپنی تحریروں میں شوخی و شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں مزاحیہ صورتِ واقع دو طرح کے ملتے ہیں جیسے طبع زاد و خود ساختہ، اور دوسروں کو پیش آنے والے واقعات ہوتے ہیں جن سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اپنی تحریروں میں مزاح پیدا کرتے ہیں ذیل میں ایک طبع زاد و خود ساختہ مضحک واقعہ، مشفق خواجہ زبانی ملاحظہ کیجیے:

> ''حضرت تابش دہلوی کا شمار بھی اساتذہ فن میں ہوتا ہے ..... بلا شبہ وہ ہمارے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ ہمارے دِل میں ان کا بے حد احترام ہے۔اسی لیے ہم نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کو ادباً دور ہی سے دیکھا ہے۔ان کے نئے مجموعے کو قریب سے دیکھنے کی اتفاقی صورت یوں پیدا ہوگئی ہے کہ پچھلے دنوں ہم حیدر آباد سندھ جا رہے تھے، بس میں ہمارے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے

---

[1] وزیر آغا، اردو ادب میں طنز مزاح ،ص:55

اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اُن صاحب کی بد ذوقی پر حیرت ہوئی کہ بس کے تمام مسافر تو ڈرائیور کے ذاتی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے نازیہ اور زہیب کے نئے گانوں سے محظوظ ہو رہے ہیں اور یہ صاحب کتاب پڑھ رہے ہیں۔اسی دوران میں بلا ارادہ ہماری نظر اُس صفحے پر پڑی جو موصوف کے سامنے کھلا تھا۔اس پر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج تھا۔''شان الحق کی شادی پر غالب سے معذرت کے ساتھ''۔ ہم شان صاحب کے پرانے نیازمند ہیں۔اس لیے اس عنوان پر ہمیں بے حد تعجب ہوا۔شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہ آئی۔شان صاحب غالب کے دِیوان کی شرح لکھتے یا تضمین کرتے تو معذرت کی گنجایش تھی،مگر شادی تو بالکل ایک مختلف کام ہے۔اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم نے اپنے ہم سفر سے کتاب دیکھنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے فوراً اسے ہمارے حوالے کر دیا جیسے وہ اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی ان سے کتاب لے لے اس کے بعد وہ تو گانے سننے میں اور ہم کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے اور یوں ہم نے جناب شان الحق حقی سے نیازمندی کا رشتہ رکھنے کی پاداش میں حضرت تابش دہلوی کے چوتھے مجموعہ کلام ''غبارِ انجم'' سے استفادہ کیا۔اسے ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔تابش صاحب کو شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انھوں نے شان صاحب کا سہرا غالب کی زمیں میں لکھا ہے۔گویا شادی تو شان صاحب کی ہوئی اور زمین غالب کی پامالی ہوئی۔''

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جابجا مزاحیہ صورت واقعہ سے کام لیا ہے انھوں نے ایک واقعہ کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔مثلاً ایک مرتبہ وہ ڈاکٹر انعام احسن کے پاس اپنی

ا۔خامہ بگوش کے قلم سے۔ص:84-283

آنکھوں کے معاینے کی غرض سے گئے جو ایک ادیب ہیں انہوں نے دور کی نظر کے ٹسٹ کے لیے دیوار میں آویزاں اپنی ایک نظم پڑھائی اور نزدیک کی نظر کے ٹسٹ کے لیے اپنا مطبوعہ دیوان ان کے سامنے رکھا۔ اس واقعہ کو مشفق خواجہ نے مزاحیہ صورت میں اس طرح رقم کیا ہے، لکھتے ہیں:

''یہ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر انعام احسن) وہی ہیں جن کا تخلص ''حریف'' ہے اور جو مولانا احسن مارہروی کے فرزند ارجمند ہیں۔ شاعری میں مزاح سے اور آنکھوں کے علاج میں سنجیدگی سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی ضرورت شعری کے تحت اس کے برعکس بھی عمل کرتے ہیں جس کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے ایک مرتبہ ہم انہیں آنکھیں دکھانے گئے۔ محاورتاً نہیں ضرورتاً ڈاکٹر صاحب نے دور کی نظر کے معاینے کے لیے دیوار پر آویزاں ایک نظم پڑھوائی جو اُن کی اپنی تصنیف تھی۔ قریب کی نظر کے ٹسٹ کے لیے اپنا مطبوعہ دیوان ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے عرض کیا، ''اس طرح تو ہماری نظر اور کمزور ہو جائے گی''۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، ''فکر کی کوئی بات نہیں دماغ کو فائدہ پہنچے گا''۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم آنکھوں کے علاج کے لیے گئے تھے اور دماغ کا علاج کرا کے آئے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے مطابق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوپی چند نارنگ مشاعروں میں بیٹھ کر شعر نہیں سنتے بلکہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور عالم بے خیالی میں کھو جاتے ہیں ایک مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے تھے اور گوپی چند نارنگ آنکھیں موندے عالم بے خیالی میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس واقعہ کو مشفق خواجہ مزاح کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں، ان کا مشاعروں سے کیا تعلق اطلاعاً عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب مشاعروں میں شعر سنانے نہیں جاتے، مہمان خصوصی بن کر جاتے ہیں بعض لوگوں کا خیال

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے۔ص:285

ہے کہ مشاعروں میں بیٹھ کر وہ شعر سنتے بھی نہیں۔ بس آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور پھر انہیں یاد نہیں رہتا کہ وہ کہاں ہیں۔ پچھلے سال ایک مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے تھے اور ڈاکٹر نارنگ مسندِ صدارت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے۔ آنکھیں موندے کسی اور عالم میں پہنچے ہوئے تھے۔ آزاد نے یہ حالت دیکھی تو انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرے شعر سن کر تو مردے بھی جاگ پڑتے ہیں اور آپ ہیں کہ مسلسل سوئے جا رہے ہیں''۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، ''تو پھر آپ اپنے شعر انہیں سنایا کیجیے، زندوں کی نیند کیوں خراب کرتے ہو''۔ [1]

مشفق خواجہ نے نہ صرف طبع زاد اور خود ساختہ واقعات کے ذریعہ بلکہ دوسروں کو پیش آنے والے واقعات سے بھی استفادہ کر کے اپنی تحریروں کو شگفتہ بنایا ہے۔ یہ دوسروں کے واقعات محض قصہ گوئی کے شوق میں نقل نہیں کرتے بلکہ صورتِ حال کے مطابق ان کا اطلاق بھی کرتے ہیں چنانچہ ان کے ہر دوسرے کالم میں کوئی نہ کوئی قصہ یا روایت ضرور پڑھنے کو ملتی ہے۔

مشفق خواجہ کے مطابق نظیر صدیقی نے اپنی کتاب جدید اردو غزل: ایک مطالعہ میں قارئین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ غزل کے موجودہ سرمائے میں کوئی قابل قدر اضافہ میری طرف سے بھی ہو سکا ہے یا نہیں''۔ مشفق خواجہ نے نظیر صدیقی کے اس بیان پر کھل کر تبصرہ تو نہیں کیا لیکن اشارتاً ایک واقعہ کے ذریعہ یوں طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

''نظیر صدیقی نے اپنے کلام کے حوالے سے سوچنے کی جو دعوت دی ہے اس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، وہ سن لیجئے کہ ایک صاحب مشاعرے میں کلام سنا رہے تھے۔ ایک شعر کے بعد فرمایا ''ذرا سوچیے تو میں نے کیا بات کہی ہے''۔ دوسری طرف سے جواب آیا ''جب شعر کہنے سے

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص: 51

پہلے آپ نہیں سوچتے تو سننے کے بعد ہم کیوں سوچیں.....؟''۔[1]

یہ اور اس طرح کے کئی واقعات ہیں جس سے وہ خالص مزاح پیدا کرتے ہیں۔ایک اور مثال ان کے کالموں سے ملاحظہ کیجیے جس میں وہ ایک واقعہ کے ذریعہ سفارش کرنے والے ہمارے شاعروں پر طنز کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کا شکوہ سن کر انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا'' آپ نے اپنے آنے والی نسل کے لیے کیا کیا ہے؟''موصوف نے جواب دیا''میں نے ہر نئی آواز کو متعارف کرانے میں حصہ لیا ہے۔حیدرآباد دکن کے شاعر علی کی نظمیں، میں اپنے نوٹ کے ساتھ شاعر بمبئی میں شائع کرائی تھیں''۔

شاید اسی نوٹ کا اثر ہے کہ اس نئے شاعر کا نام اور کلام پھر کبھی کسی رسالے میں نظر نہیں آیا۔اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا ۔ایک نئے شاعر نے ایک پرانے شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ اپنی غزل شاہد احمد دہلوی مرحوم کو رسالہ ''ساقی''میں اشاعت کے لیے بھیجی ۔شاہد صاحب نے اس کے جواب میں شاعر کو لکھا'' آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے آپ نے سفارش خط لکھوایا ہے،ان کے بارے میں رائے اچھی نہیں ہے۔لہٰذا غزل واپس بھیج رہا ہوں''۔ [2]

مشفق خواجہ نے اس طرح کے بے شمار مزاحیہ واقعات نقل کیے ہیں۔اور اگر کوئی واقعہ انہیں میسر نہ ہوتا تو وہ خود کوئی واقعہ تخلیق کر لیتے ہیں اور اس طرح کے طبع زاد واقعات میں وہ اپنے فرضی کردار اُستاد لاغر مرادآبادی کے ذریعے اپنی بات کو پیش کرتے ہیں۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ،ص:120

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:183

لطیفہ گوئی

لطیفہ واقعے کی لطیف ترین صورت ہوتی ہے۔مزاح نگار اپنی تحریر کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کے لیے لطائف وظرائف کی بھی مدد لیتا ہے۔لطیفہ سے مراد یہ ایک چھوٹی حکایت یا روایت ہوتی ہے اس کی کہانی میں انوکھاپن ہوتا ہے اس میں کچھ تعجب انگیز باتیں ہوتی ہیں اور ایسے موڑ بھی آتے ہیں جس سے سنسناہٹ سی پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے چٹکی لی ہو اور گدگداہٹ سارے جسم میں پھیل گئی ہو۔اس میں کہیں طنز ہوتا ہے تو کہیں رمز و کنایا، بدیہہ گوئی یا پھر، حاضر جوابی ہوتی ہے۔لطیفے میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ شئے لطیف کو چھو کر ایسا احساس پیدا کرتا ہے جو سارے جسم میں تازگی اور شعور میں فرحت بخشتا ہے، اور مسکراہٹیں کھل اُٹھتی ہیں اور دیر تک کھلی رہتی ہیں۔مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جا بجا لطائف کا استعمال کیا ہے اور ان لطائف کے ذریعہ وہ کبھی مزاح پیدا کرتے ہیں تو کبھی طنز کرتے ہیں۔وہ لطائف کو بر وقت اور برمحل استعمال کرنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

مشفق خواجہ کے مطابق انیس ناگی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی ہے اور فرانسیسی شاعر نرودا کی نظموں کا ترجمہ اردو میں کر رہے ہیں جو پہلے ہی ہسپانوی سے فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

مشفق خواجہ نے دراصل انیس ناگی کی ترجمہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک لطیفہ کے ذریعہ یوں طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''انیس ناگی مژدہ سنایا ہے کہ انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی ہے اور اب وہ نرودا کی نظموں کا ترجمہ کر رہے ہیں، جو ہسپانوی سے فرانسیسی میں منتقل ہو چکی ہیں، ہسپانوی زبان کی نظموں کو فرانسیسی کے توسط سے اردو میں منتقل کرنے کا خیال بہت عمدہ ہے براہ راست ترجمہ بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا ہے ترجمہ در ترجمہ کا فائدہ یہ ہے کہ غلطی محسوس نہیں ہوتی، کیوں کہ تیسری زبان میں ترجمہ

تخلیق کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

یہاں ہمیں ایک لطیفہ یاد آرہا ہے، جس کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ چوں کہ لطیفہ یاد آ گیا۔اس لیے سنا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ایک ادیب نے دوسرے سے کہا:

''میں نے تھوڑی بہت جرمن زبان سیکھ لی ہے۔اب میں گوئٹے کا ترجمہ کروں گا''۔

دوسرے ادیب نے کہا:

''بڑا مبارک خیال ہے، لیکن پہلے وہ زبان بھی تھوڑی بہت سیکھ لو جس میں ترجمہ کرنے کا خیال ہے''۔ [1]

پروین شاکر نے اپنے ایک انٹرویو میں عطاء الحق قاسمی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے اپنی بہت سی تخلیقات رد کی ہیں انہیں ''خوشبو'' میں شامل نہیں کیا۔ پروین شاکر کے اس بیان پر مشفق خواجہ ایک لطیفے کے ذریعہ یوں طنز کرتے ہیں:

''یہاں بھی ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام ایک نقاد کی خدمات میں پیش کرتے ہوئے کہا ''میں نے اپنا آدھا کلام رد کردیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا ہے''۔نقاد نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا: ''یہ آپ نے بہت اچھا کیا پڑھنے والوں کو اس سے بڑی سہولت ہوگی کہ انہیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی رد کرنا پڑے گا''۔ [2]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ صادق الخیر کو یادنگاری میں جو کمال حاصل ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، شخصی خاکے ہوں یا آپ بیتی، وہ ایسا جادو جگاتے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، کی کیفیت رہتی ان کی اس نوعیت کی کتابیں ''آسماں کیسے کیسے''، ''مری زندگی افسانہ'' اور ''نایاب ہیں ہم'' بے حد مقبول ہیں، لیکن مشفق

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:275

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص :221

خواجہ کا خیال ہے کہ ان کی تصنیف ''گنجینۂ گوہر کھلا'' میں وہ بات نہیں ہے چنانچہ اس تصنیف پر ایک لطیفے کے ذریعہ یوں مذاق اڑایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''لیکن جناب صادق الخیری کی تازہ ترین کتاب ''گنجینۂ گوہر کھلا'' پڑھ کر کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا کیوں؟ پہلے آپ ایک مشہور لطیفہ سن لیجیے۔ایک سردار جی نے اپنے باغ میں تین تالاب بنوائے، ایک گرمیوں میں نہانے کے لیے اور دوسرا سردیوں میں نہانے کے لیے۔سردار جی سے پوچھا گیا کہ یہ تیسرا تالاب آپ نے کیوں بنوایا ہے تو انہوں نے فرمایا ''کبھی کبھی نہانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ تالاب اسی مقصد کے لیے ہے''۔
>
> زیرِنظر کتاب بھی سردار جی کے تیسرے تالاب کی قسم کی چیز ہے کیوں کہ کبھی کبھی صادق الخیری صاحب کا جی بھی تو چاہتا ہوگا کہ کتاب نہ لکھی جائے۔سو اسی خواہش کے نتیجے میں یہ کتاب وجود میں آگئی''۔ [1]

ان کے کالموں میں اس طرح کے لطیفے جگہ جگہ ملتے ہیں۔مثلاً ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک انٹرویو میں پروین شاکر سے سوال کیا کہ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ آپ کالج کی لڑکیوں کی شاعرہ ہیں، اس سے آپ کس قدر متفق ہیں؟ جواب میں پروین شاکر نے کہا کہ ''خوشبو'' میں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو نوجوان نسل کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن جو اس کے بعد کی نسل کے لوگ ہیں ان کو بھی میں نے کبھی اپنی شاعری سے بددل نہیں دیکھا چنانچہ پروین شاکر کے اس جواب پر مشفق خواجہ ایک لطیفہ یوں سناتے ہیں:

> ''اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔بلا تشبیہ عرض ہے کہ ایک شاعر نے ایک محفل میں اپنا کلام سنایا سامعین میں سے کوئی دِل گرفتہ رونے لگا، شاعر نے اس سے کہا: ''کیا آپ میری شاعری سے بددل ہوگئے ہیں؟'' اس شخص نے جواب دیا ''آپ کی شاعری سے نہیں، میں زندگی سے بددل ہوگیا ہوں کہ کیسا کلام سننا

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:208

پڑتا ہے"۔ [1]

غرض مشفق خواجہ اس طرح کے بے شمار لطائف کو بر وقت اور بر محل استعمال کر کے نہ صرف اپنی تحریروں کی شگفتگی کو دوبالا کر دیا ہے بلکہ عصری ادب کا مذاق اڑایا ہے۔

چٹکلہ بازی

چٹکلہ سے مراد باتوں باتوں میں چبھتا ہوا اور دلچسپ جملہ یا فقرہ کس دینا جس میں کچھ معنی پنہاں ہوں اور سرسری بات سے ہٹ کر مطلب نکلتا ہو اور اُس کی ضرب کاری فوراً اثر انداز ہو تو وہ چٹکلہ کہلاتا ہے یا پھر کسی حکایت یا روایت کے اختتام پر ایسی بات کہہ دی جائے جس سے بالکل جداگانہ مفہوم پیدا ہو اور بات کچھ کی کچھ ہو جائے اور سننے والا لاجواب ہو جائے تو ایسی تمام روداد کو بھی چٹکلہ کہا جاتا ہے جو لطیفے سے کچھ زیادہ ہی مؤثر ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں ہر دوسری سطر میں کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا جملہ یا فقرہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات کے اختتام پر چبھتے ہوئے جملوں و فقروں سے کبھی طنز کرتے ہیں تو کبھی مزاح پیدا کرتے ہیں ان کی اس چٹکلہ بازی کی چند مثالیں ان کے کالموں سے یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً:

مثلاً مشفق خواجہ کے مطابق پاکستان کے مصنف محمد حسن نے اپنی کتاب "کرشن بھی مر گیا" میں بے شمار شخصیات کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں بعض شخصیات پر انہوں نے کئی صفحات لکھے ہیں ان میں ایک جوش بھی ہیں۔ محمد حسن کی تنقید پر ایک چٹکلے کے ذریعہ یوں طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

> "مصنف نے بے شمار شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جوش پر تو انہوں نے صفحوں کے صفحے سیاہ کیے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہوں نے جوش صاحب کے کردار کو بھی سیاہ کر ڈالا ہے"۔ [2]

مشفق خواجہ نے محمد حسن کی تنقید کے علاوہ عصر حاضر کے مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کی علم عروض

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 221

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص: 329

سے دلچسپی کو بھی اپنے چبھتے ہوئے جملوں سے یوں نشانائے طنز بنایا ہے کہتے ہیں:

''فاروقی نئی نسل کے ذہین نقاد ہیں۔قدیم ادب بھی پڑھا ہے اور جدید ادب بھی، عروض سے بھی گہری دلچسپی ہے، اس وجہ سے وہ ساقط المعنی مصرعوں کو تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن ساقط الوزن مصرعے ان کی برداشت سے باہر ہوتے ہیں۔اس کی بہترین مثال ان کی اپنی شاعری ہے، جس میں عروض کی اتنی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ کہیں کوئی حروف دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔یہ دوسری بات ہے کہ عروض کے بوجھ تلے معانی دب جاتے ہیں''۔[1]

ایک مرتبہ جگن ناتھ آزاد نے فراق پر تیس (۳۰) صفحے کا مضمون لکھ کر انہیں تنقید کا نشانہ بنایا تھا لیکن مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ وہ ایک اچھے نظم نگار ہیں یہ کام وہ نثر کی بجائے نظم سے بھی بخوبی انجام دے سکتے تھے لیکن انہوں نے بلاوجہ بے شمار صفحے بے کار کیے ہیں۔غرض جگن ناتھ آزاد کے اس مضمون پر روشنی ڈالتے ہوئے جملہ بازی کے ذریعہ یوں طنز کرتے ہیں:

''فاروقی کے بعد جگن آزاد نے فراق صاحب کو نثر میں اپنی شعلہ نوائی کا ہدف بنایا، حالاں کہ وہ چاہتے تو فراق کے بارے میں ایک آدھ نظم لکھ کر دل کا غبار نکال سکتے تھے، کیوں کہ خدا نے انہیں یہ کمال عطا کیا ہے کہ وہ جس موضوع پر نظم لکھ دیں، پھر وہ موضوع کسی کام کا نہیں رہتا، لیکن آزاد نے فراق کے خلاف نظم لکھنے کی بجائے پورے تیس صفحوں کا مضمون لکھا، جس میں صرف دل کا غبار ہی نہیں ملتا، اچھی خاصی گرد بھی اڑائی گئی ہے''۔ [2]

دراصل مشفق خواجہ نے ایسے ناقدین کو جو حد سے زیادہ خامیوں پر نگاہ رکھتے ہیں ان پر اعتراض کیا ہے اور ایسے ہی ناقدین پر طنز کرتے ہوئے جملہ بازی سے کام لیا ہے۔

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص:129

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص:133

ایک مرتبہ بشیر بدر نے اپنے مجموعہ کلام ''آمد'' پر دیباچہ لکھتے ہوئے اپنی غزل گوئی کے تعلق سے کہا تھا کہ'' آج غزل کے کروڑوں عاشقوں کا خیال ہے کہ میری ناچیز غزل اردو غزل کے کئی سو سالہ سفر میں نیا موڑ ہے چنانچہ بشیر بدر کی اس تعلّی کو فراق گورکھ پوری کے حوالے سے مشفق خواجہ نے یوں چٹکلہ بازی کا نشانہ بنایا ہے،فرماتے ہیں:

> ''اردو غزل کو نیا موڑ دینے والی بات پر ہمیں فراق گورکھپوری کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ایک نئے شاعر نے ان سے کہا''میں نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ہے''فراق صاحب نے فرمایا'' جی ہاں اسی لیے تو نئی اردو شاعری خاصی مڑی تڑی نظر آتی ہے''۔ [1]

اسی طرح ایک مرتبہ نظیر صدیقی سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا تھا کہ آپ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ نے غالبؔ،اقبالؔ،فراقؔ، یگانہ،فیضؔ،اور دوسرے کئی بڑے شعرا پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں، جو دس بارہ صفحوں سے زیادہ کے نہیں ہیں لیکن پروین شاکر پر آپ کا مضمون پچاس صفحات کا ہے۔کیا پروین شاکر کا مرتبہ غالب،اور اقبال وغیرہ سے زیادہ ہے جو آپ نے ان پر اتنے صفحات ضائع کیے۔بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ نے انہیں میرؔ و غالبؔ سے بڑھا دیا ہے''۔اس سوال کے جواب میں نظیر صدیقی فرمایا کہ''اگر ایسا ہے تو اس کے ذمہ دار میرؔ و غالب ہیں میں نہیں ہوں۔لہٰذا نظیر صدیقی کے اس جواب پر مشفق خواجہ نے اپنے کردار استاد لاغر مرادآبادی کے ذریعہ اس طرح طنز یہ کیا ہے:

> ''یہ ایسا مسکت جواب تھا کہ ہم خاموش ہو گئے۔حاضرین محفل میں سے ایک صاحب نے کہا''غالبؔ خوش قسمت تھا کہ اسے عبدالرحمن بجنوری جیسا نقاد ملا۔پروین شاکر خوش قسمت کہ اسے نظیر صدیقی جیسا سخن فہم ملا۔محفل میں استاد لاغر مرادآبادی بھی موجود تھے۔انہوں نے کہا:''اور ہم بھی خوش قسمت ہیں کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود زندہ ہیں''۔ [2]

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے،ص:21 [2] سخن ہائے گسترانہ،ص:327

چنانچہ مشفق خواجہ اپنی تحریروں میں اس طرح کے چبھتے ہوئے جملوں سے اپنے طنز کو مزید تیکھا بنا دیتے ہیں۔ یہ خوبی ان کے کالموں میں جگہ جگہ ملتی ہے، دراصل مشفق خواجہ کا اعتراض ایسے ادیبوں اور ناقدین پر ہوتا ہے جو غیر ضروری تعریف وتنقید میں وقت اور صفحات برباد کرتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں پر لکھتے وقت وہ چبھتے ہوئے جملوں اور چٹکلوں کے ذریعہ طنز کرتے ہیں۔

خود برداشتہ مزاح

طنز ومزاح کے جتنے بھی حربے ہیں ان تمام میں بالعموم کسی اور کو نشانہ ملامت بنایا جاتا ہے لیکن خود برداشتہ مزاح وہ حربہ ہے جس میں ایک مزاح نگار خود کو نشانۂ تمسخر بنا کر خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنسنے پر آمادہ کرتا ہے دراصل خود پر داشتہ مزاح اپنے آپ کو کسی اور کی زد سے محفوظ پا کر طمانیت اور خوشی محسوس کرنے کا نام ہے۔ خود بر دشتہ مزاح بلند پایہ وصاف ستھرا ہوتا ہے جس سے ایک مزاح نگار کی دماغی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سہی ہے کہ ایک مزاح نگار خود کو نشانۂ تمسخر بنا کر دوسروں کو خوشی ومسرت بخشتا ہے لیکن وہ اپنی باتوں میں کہیں نہ کہیں غیر محسوس طریقے سے دوسروں کو بھی نشانہ تمسخر ضرور بناتا ہے اسی لیے مارک ٹوین کا کہنا ہے:

''خود برداشتہ مزاح دوسروں کو روشنی دینے والی بجلی کی طرح ہے''۔[1]

مارک ٹوین کے اس خیال کے مطابق خود برداشتہ مزاح وہ بجلی ہے جس سے دوسروں کو روشنی ضرور ملتی ہے لیکن اگر وہی بجلی کسی پر گر جائے تو وہ اس کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ لہٰذا خود برداشتہ مزاح میں مزاح نگار رمز وکنایہ کا سہارا لیتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے دوسروں کو بھی طنز ومزاح کا ہدف بناتا ہے۔

مشفق خواجہ کے کالموں میں خود برداشتہ مزاح کے نمونے جا بجا ملتے ہیں وہ جہاں دوسروں کو طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہیں وہیں خود کو بھی نشانۂ تمسخر بنانے سے باز نہیں آتے چند مثالیں ان کے کالموں سے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

---

[1] بحوالہ عبدالغفور، طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ، ص: 38

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نام اردو ادب کی تاریخ میں اہم نام ہے لسانیات کے سلسلے میں آپ نے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ مشفق خواجہ کو ان کی تصانیف کی اہمیت کا اعتراف ضرور ہے لیکن ان کے خشک موضوعات کو انہوں نے اپنے مذاق کا نشانہ بنایا ہے اور مذاق انہوں نے خود کے حوالے سے کہا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر مسعود خان ہمارے اُن اہل علم میں سے ہیں جن کے علمی کام اردو زبان کا سرمایہ افتخار ہیں۔ ہم نے ان کی تقریباً سبھی کتابیں پڑھی ہیں حالاں کہ اِس قدر خشک ہیں کہ اُن کو پڑھنا تو کیا دور سے دیکھنا بھی عام قاری کی صحت کو متاثر کر سکتا ہے۔ ہمیں چوں کہ اپنی صحت کی زیادہ فکر نہیں ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی، البتہ ہم نے ہر کتاب قسطوں میں پڑھی ہے۔ دو چار صفحے پڑھے اور پھر دو چار دن آرام کیا، آرام کے یہ دن بھی بے آرامی میں گزرتے تھے کیوں کہ مزید دو چار صفحے پڑھنے کا خوف ذہن پر طاری رہتا تھا۔ بہر حال ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ ہم نے ان کتابوں کے مطالعے سے خوف اور بے آرامی کے علاوہ علم بھی حاصل کیا۔ گویا علم اب تک ہماری کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہوا لیکن یہ فخر کیا کم ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے خوانِ علم کے ریزہ چیں ہیں''۔ [1]

ایک مرتبہ جمیلہ ہاشمی کا ناول ''دشتِ سوس'' اور ممتاز مفتی کا سفر نامہ ''لبیک'' دونوں انعامی مقابلہ میں شامل تھے اور انعام ''لبیک'' کو ملا اس پر جمیلہ ہاشمی اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے ممتاز مفتی سے بہتر لکھا ہے، چنانچہ جمیلہ ہاشمی کے اس دعویٰ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے خود کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے فرماتے ہیں:

> ''محترمہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ''میں نے ممتاز مفتی سے زیادہ اور بہتر لکھا ہے''

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:161

بہتر والے معاملے میں تو ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہم میں اچھے بُرے
کی تمیز نہیں ہے"۔ [1]

مشفق خواجہ کو مطالعہ کا بہت شوق ہے ان کے مطابق "اردو ڈائجسٹ" کو تو وہ بہت زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں لیکن اپنی اس مطالعے کی عادت کو وہ اپنی برائیوں میں شامل کر کے خود کو مزاح کا ہدف بنایا ہے کہتے ہیں:

"بُری عادتیں تو ہم میں اور بھی ہیں، لیکن اردو ڈائجسٹ پڑھنے کی عادت
سب پر بازی لے گئی ہے۔ خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو ڈائجسٹ
کا پڑھنا کوئی بُری بات ہے بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ موجودہ زمانے میں لکھنے
والوں کے لیے پڑھنا معیوب سمجھا جاتا ہے چونکہ ہمارا تعلق لکھنے والوں کے گروہ
سے ہے اس لیے ہم مطالعے کی عادت کو اپنی برائیوں میں شمار کرتے ہیں"۔ [2]

مشفق خواجہ کا کالم "تکبیر" میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے وہ چھپ نہیں پایا جس کی وجہ سے "ادارہ" نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اسی بات کو لے کر مشفق خواجہ اپنے کردار لاغر مرادآبادی کے حوالے سے خود کو نشانہ تمسخر بنایا ہے لکھتے ہیں:

"پچھلے ہفتے ہم کالم نہیں لکھ سکے تو ادارہ "تکبیر" نے افسوس کا اظہار کرتے
ہوئے ہماری ناسازی طبع کو غیر حاضری کا سبب بتایا اور قارئین کرام سے صحت
یابی کی دعا کے لیے درخواست کی۔ درخواست کا انداز کچھ ایسا مخلصانہ، بلکہ
والہانہ تھا کہ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے تو مغفرت کی دعا کی تیاریاں بھی
کرلیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہماری سخت جانی آڑے آئی، حضرت لاغر
مرادآبادی کا ردعمل ذرا مختلف تھا۔ وہ عیادت کے لیے خوشی خوشی تشریف لائے تو
ہمیں ٹھیک ٹھیک دیکھ کر افسردہ سے ہوگئے، فرمایا: "ادارہ تکبیر نے آپ کالم کے

---

[1] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے۔ ص: 192

[2] ۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 278

نہ چھپنے پر افسوس کیا، حالاں کہ افسوس چھپنے پر کرنا چاہیے کہ آپ کا ہر کالم آپ کی
ناسازی طبع کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ہفتے آپ کالم نہ لکھیں تو اسے آپ کی صحت
مندی کی دلیل سمجھنا چاہیے"۔ [1]

مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں اس طرح کے خود برداشتہ مزاح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں انہیں جب کسی ناہموار صورتِ حال پر طنز کرنے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ملتا فوری برجستگی کے ساتھ خود کو طنز کا نشانہ بنا کر اپنے دِل کا غبار نکال لیتے ہیں۔

بذلہ سنجی

بذلہ سنجی مزاح کا خاص روپ ہوتا ہے جس میں کسی خاص واقعے کو ایسے زاویے سے پیش کیا جاتا ہے جس میں کہ پڑھنے والا ہنسنے پر مجبور ہو جائے اس میں خوش طبعی، حاضر جوابی شیرینی زبان اور لطافت کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال، موضوع کی نزاکت اور زبان کی چاشنی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس میں موضوع کو بڑی چابکدستی سے بدلا جاتا ہے اور غیر متوقع طور پر خیال کو سرے سے بدل کر ایک ایسا نکتہ پیدا کیا جاتا ہے جس سے مزاح کی پھلجھڑیاں جھڑتی ہیں۔

مشفق خواجہ ایک سنجیدہ محقق ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بذلہ سنج بھی واقع ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کے ظریفانہ کالم ہیں ان کالموں کی ہر سطر کے ہر جملے سے ان کی بذلہ سنجی جھلکتی ہے وہ برجستگی، اختصار اور فی البدیہہ کے ساتھ ساتھ موضوع کے پس منظر، واقعات کی تفصیل اور زبان کی لچک کے ذریعہ اپنی تحریروں کو نہایت ہی بذلہ سنج بنا دیتے ہیں۔ ذیل میں ان کی بذلہ سنجی کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

مشفق خواجہ کے مطابق عبدالعزیز خالد علم و فضل کے اعتبار سے ایک قد آور شخصیت ہے اور ایسے قادر الکلام ہیں کہ ذرا سی بات کو پھیلا کر کتاب بنا سکتے ہیں اور کسی کتاب کے تمام مطالب کو ایک مصرعے میں سمیٹ سکتے ہیں چنانچہ ان کی علمیت پر اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

---

[1] سخن ہائے گسترانہ، ص: 194

''عبدالعزیز خالد ایک غیر معمولی ادبی شخصیت ہیں علم وفضل کے اعتبار سے وہ ایسے قدر آور ہیں کہ ان کی طرف دیکھنے والوں کی ٹوپی گر جاتی ہے اور اُن کا علم وفضل اتنا وزنی ہے کہ اس کی زد میں آ کر ٹوپی کے ساتھ اس کا پہننے والا بھی گر جاتا ہے۔ قادرالکلام وہ ایسے ہیں کہ ذرا سی بات کو پھیلا کر کتاب بنا سکتے ہیں اور کتاب کے تمام مطالب کو ایک مصرعے میں سمیٹ سکتے ہیں گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا اور کوزے کے پانی کو سمندر میں تبدیل کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دائیں ہاتھ کا کھیل یہ ہے کہ وہ خالد کے خیالات عالیہ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور صفحۂ قرطاس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سارے بوجھ کو بخوبی سہار لیتا ہے، اسی لیے تو خالد کی کتابوں میں نہایت دبیز اور مضبوط کاغذ استعمال کیا جاتا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ وہ جن دو چار لکھنے والوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اُن میں سے ایک انیس ناگی بھی ہیں ان پر اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ یوں طنز کیا ہے

''جن دو چار لکھنے والوں کے بارے میں ہم بادل ناخواستہ اچھی رائے رکھتے ہیں ان میں انیس ناگی بھی شامل ہیں۔ بادلِ ناخواستہ اس لیے کہ جب کبھی ہم کسی لکھنے والے کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو ہمارے پڑھنے والوں کی رائے ہمارے بارے میں مزید خراب ہو جاتی ہے، لہٰذا ہم عام طور پر احتیاط سے کام لیتے ہیں ہمارے محتاط ہونے کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہم نے آج تک میر و غالب کی تعریف سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا''۔ [2]

مشفق خواجہ انور سدید کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں چنانچہ ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ کتنی خوبصورتی سے طنز کیا ہے دیکھیے:

۱۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:9

۲۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ص:212

''ڈاکٹر صاحب (انوار سدید) کی تصانیف پڑھنے کا کام خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خطرناک بھی ہے۔اس کی وجہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اب پھر عرض کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔مگر مصیبت یہ ہے کہ علم کے ساتھ بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ذریعہ حاصل کردہ علم تو بے ضرر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے اور قارئین میں تقسیم کر دیتے ہیں لیکن بلڈ پریشر کے نقصانات سے بچنا ممکن نہیں ہے''۔ [1]

قمر علی عباسی کے دو سفرنامے ایک ''برطانیہ چلیں'' دوسرا ''نیل کے ساحل'' کے بارے میں مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ان دونوں سفرناموں کے نام اتنے خوبصورت ہیں کہ سفرنامے پڑھے بغیر ہی اُن کے مطالب کی عمدگی کی داد دی جاسکتی ہے ان کے مطابق ان سفرناموں میں شروع سے آخر تک کئی حسین لڑکیوں کا ذکر آیا ہے جو قارئین کے لیے توجہ کا مرکز ہو سکتی ہے جو کہ سفرنامہ کی خوبی نہیں ہونی چاہیے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قمر علی عباسی اس خامی کو بے نقاب کر کے ان پر اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

''جیسا کہ ان ناموں سے ظاہر ہے، پہلا سفرنامہ انگلستان کا ہے اور دوسرا مصر کا۔یہ نام اتنے خوبصورت ہیں کہ سفرنامے پڑھے بغیر اُن کے مطالب کی عمدگی کی داد دی جاسکتی ہے لیکن ہم چوں کہ خوداد کے طالب ہیں، اس لیے ہم نے ان سفرناموں کو شروع سے آخر تک پڑھا اور بے حد محظوظ ہوئے اور خدا کا شکر ہے کہ محفوظ بھی رہے۔ان سفرناموں کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے دوران کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔جب واقعات دلچسپ ہوں اور جا بجا ان پری وشوں کا ذکر ہو جن کی بری نظریں قاری کے جان و ایمان کی دشمن ہوں تو قدم قدم پر سلامتی کی دُعا مانگنی پڑتی ہے۔ہم تو خیر سخت جان ہیں اور یہ کالم لکھنے

---

[1] سخن ہائے گفتنی، ص:109-115

کے لیے بچ گئے، لیکن کمزور دل قارئین کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ مطالعے سے
پہلے زندگی کا بیمہ کرالیں تا کہ ان کتابوں کا مطالعہ اُن کے لیے نہ سہی ان کے پس
ماندگان کے لیے مفید ثابت ہو''۔ [1]

''زمین اور فلک اور'' انتظار حسین کا سفر نامہ ہے جس میں چار مرتبہ ہندوستان جانے کی الگ الگ روداد بیان کی گئی ہے مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ اس میں انتظار حسین کا چار مرتبہ ہندوستان جانے کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن واپس آنے کا ذکر صرف ایک مرتبہ کیا گیا ہے لہٰذا ان کے سفر نامہ کی اس خامی پر روشنی ڈالتے ہوئے بذلہ سنجی کے ذریعہ طنز کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''زمین اور فلک اور'' میں چار سفر نامے ہیں اور چار مرتبہ ہندوستان جانے کا
ذکر ملتا ہے لیکن واپس آنے کا ذکر صرف ایک مرتبہ کیا گیا ہے یہ معلوم نہیں ہوتا
کہ باقی تین مرتبہ انتظار حسین کی واپسی ہوئی یا نہیں۔ ابہام کا یہ انداز افسانوں
میں تو ٹھیک ہے، سفر ناموں میں غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے''۔ [2]

ایک مرتبہ افتخار عارف نے اپنے ایک انٹرویو میں ہمیشہ کی طرح ساقی فاروقی کو بہترین نظم نگار کہہ کر اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا اس پر مشفق خواجہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔

''وہ ہمیشہ ساقی فاروقی کو بہترین نظم نگاروں میں شمار کرتے رہے۔ زیر نظر
انٹرویو میں بھی انہوں نے ساقی کو بہ حیثیت نظم نگار اتنے اونچے مقام پر پہنچا دیا
ہے کہ اگر خدانخواستہ اُن کا (افتخار عارف کا نہیں ساقی کا) پاؤں پھسل گیا تو اردو
نظم کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے''۔ [3]

اس طرح کی بذلہ سنجی کی کئی مثالیں مشفق خواجہ کے کالموں میں بکھری پڑی ہیں۔

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:155

[2] سخن ہائے گسترانہ، ص:53

[3] سخن در سخن۔ ص:55

مزاحیہ کردار

مزاحیہ کردار مزاح نگاری کا ایک خاص حربہ ہے مزاحیہ کردار سے مراد کسی مزاح نگار کا وہ فرضی کردار ہے جس کے مختلف اجزاء یا عناصر کو مزاح نگار اس طرح نمایاں کرتا ہے جس سے ناہمواری کا احساس ہوتا ہے، یہ مزاحیہ کردار ایک نارمل انسان کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کرتا اور قدم قدم پر ایسے انوکھے واقعات کا سامنا کرتا ہے جس سے خود بہ خود مزاحیہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا مزاحیہ کردار کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مزاحیہ کردار میں ایک عام انسان کی سی لچک کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ ایک عام انسان قدم قدم پر اپنے ماحول کے نت نئے تقاضوں کے ساتھ ''سمجھوتے'' کرتا ہے اور اپنی حرکات کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر کے زندگی کے توازن کو برقرار رکھتا ہے لیکن مزاحیہ کردار ایک سیدھی لکیر پر بے دھڑک بڑھے چلا جاتا ہے اور ماحول کی طرف سے اپنے کان اور آنکھیں بالکل بند کر لیتا ہے''۔ [1]

ایک کامیاب مزاح نگار اپنے مزاحیہ کردار کی پیش کش میں دو باتوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ پہلے تو وہ مزاحیہ کردار کی تعمیر میں مبالغے سے کام لے کر اس کی معمولی سے معمولی ناہمواری کو بھی واضح انداز میں بیان کرتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھتا ہے کہ کسی ناہمواری میں مبالغہ اس قدر نہ ہو جائے کہ سچائی کا دامن بالکل ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اگر کوئی مزاح نگار اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتا تو مزاحیہ کردار زندگی سے دور ہٹ جائے گا۔ مزاحیہ کردار کی پیش کش میں دوسری اہم بات یہ ہوتی ہے کہ مزاحیہ کردار فطری انداز سے مضحکہ خیز واقعات میں گھرا ہوا ہونا چاہیے اور اس کی ناہمواریوں کو سطح پر آنے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے۔ اس کے علاوہ کسی واقعے سے متعلق جتنا غیر متوقع ردعمل مزاحیہ کردار کا ہوگا اتنا ہی یہ مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگی۔

اردو کے مزاحیہ ادب میں چند مزاحیہ کردار بہت مشہور ہوئے ہیں جیسے رتن ناتھ سرشار کا کردار

---

[1] بحوالہ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص: 258

''خوجی''، منشی سجاد حسین کا ''حاجی بغلول''، امتیاز علی تاج کا ''چچا چھکن''، مشتاق احمد یوسفی کا ''مرزا عبدالودود بیگ، وغیرہ۔ مشفق خواجہ نے بھی اپنے ظریفانہ کالموں میں ''اُستاد لاغر مرادآبادی'' کے نام سے ایک کردار وضع کر رکھا ہے۔ اس کردار کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کردار ادبی دنیا کا ایک فرد ہے۔ ادبی کردار کی ضرورت اس لیے تھی کہ مشفق خواجہ کے کالموں کے موضوعات، علم و ادب سے متعلق ہیں۔ اُستاد لاغر مرادآبادی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا کردار ہے جو ادب کے جملہ مسائل کا شعور رکھتا ہے اور ان پر اپنی گراں قدر رائے بھرپور انداز میں پیش کرنا اپنا حق تصور کرتا ہے۔ یہ اردو کے دیگر مزاحیہ کرداروں کی طرح احمق نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر ایک طناز کی خصوصیت رکھتا ہے اور ادبی معاشرے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ایک سخت گیر نقاد کی طرح تبصرہ کرتا ہے۔ لاغر مرادآبادی کی طنزیہ گفتگو خاصی حکمت افروز ہوتی ہے۔ دراصل ان ظریفانہ کالموں میں استاد لاغر مرادآبادی خامہ بگوش کا ہمزاد ہے جس طرح مشفق خواجہ نے اپنے چہرے پر خامہ بگوش کا نقاب اوڑھ رکھا ہے، بالکل اسی طرح خامہ بگوش نے لاغر مرادآبادی کا لبادہ پہن رکھا ہے۔ جس بات کو مشفق خواجہ (خامہ بگوش) اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتے، اسی کو لاغر مرادآبادی کی زبان سے ادا کر دیتے ہیں۔ اس کردار کے نمایاں اوصاف، حاضر جوابی، بے ساختگی اور زبان و بیان کی شگفتگی ہے ذیل میں استاد لاغر مرادآبادی کی حاضر جوابی، بے ساختگی اور تنقید کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ترقی پسند مصنفین، ڈاکٹر نارنگ سے اتنا ہی پرہیز کرتے ہیں جتنا خالص ادب سے، لیکن ڈاکٹر نارنگ کی فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ وہ ترقی پسندوں سے ایسی محبت سے ملتے ہیں جیسے ساتھ کھیلے ہوں یہاں تک کہ ترقی پسند ادیب پروفیسر ممتاز حسین کو اپنا معنوی استاد بھی کہہ دیا ہے چنانچہ ڈاکٹر نارنگ کی اس فراخ دلی پر استاد لاغر مرادآبادی کی حاضر جوابی ملاحظہ کیجیے:

> ''ایک محفل میں انہوں (ڈاکٹر نارنگ) نے پروفیسر ممتاز حسین کو اپنا معنوی استاد بھی کہہ دیا۔ اس پر استاد لاغر مرادآبادی نے فرمایا ''ساختیات کے ماہر ہیں، ساختیات میں لفظوں سے بحث ہوتی ہے، معنوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اس

لیے معنوی استاد کا مطلب ہے لفظی استاد''۔ [1]

مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جگن ناتھ آزاد کراچی تشریف لانے سے کچھ دن پہلے ان کا نیا مجموعہ کلام ''بوئے رسیدہ'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا یہ ان کا ساتواں مجموعہ کلام تھا جو پہلی مرتبہ پاکستان سے شائع ہوا تھا۔لہٰذا آزاد کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ناشر نے ''بوئے رسیدہ'' کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا تقریباً سبھی مشہور نقادوں نے مقالے پڑھے۔لیکن آزاد صاحب کو دو باتوں کی شکایتیں رہی پہلی یہ کہ تمام مقالہ نگاروں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ دوسری شکایت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اس مجموعہ کلام کا نام ''بوئے رمیدہ'' رکھا تھا،لیکن ناشر نے اس کو'' بوئے رسیدہ'' کر دیا۔انہوں نے ناشر سے کہا کہ ''بوئے رسیدہ'' بے معنی ترکیب ہے لہٰذا اس کو بدل دو لیکن ناشر اس پر آمادہ نہ ہوا کیوں کہ اس نے سرورق کی خوبصورتی کے لیے خاصی رقم صرف کر دی تھی۔ چنانچہ'' آزاد نے محفل میں ''بوئے رسیدہ'' کی بے معنویت کا ذکر کئی مرتبہ کیا چنانچہ جگن ناتھ کی اس شکایت پر استاد لاغر مرادآبادی کی حاضر جوابی دیکھئے کہتے ہیں:

> ''آزاد صاحب نے ''بوئے رسیدہ'' کی بے معنویت کا ذکر کئی مرتبہ کیا۔ ایک محفل میں استاد لاغر مرادآبادی بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا ''بوئے رسیدہ '' بے معنی ترکیب نہیں ہے، چوں کہ اس مجموعے میں آپ کا ادھیڑ عمری کے زمانے کا کلام شامل ہے''اس لیے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات آتی ہے کہ ''بوئے رسیدہ'' سے مراد ''بوئے عمر رسیدہ'' ہے''۔ [2]

سحر انصاری پاکستانی ادیبوں میں شہرت رکھتے ہیں۔اور کسی بھی کتاب کی رسم اجرائی کے سلسلے میں لوگ اکثر انہیں مدعو کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ رسم اجرائی عمل میں آتی ہے اس پر مشفق خواجہ نے اپنے کردار استاد لاغر مرادآبادی کے ذریعہ طنز کیا ہے دراصل ان کا یہ کردار اپنی گفتگو سے تحریر کی شگفتگی اور معنویت میں

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے۔ص:230

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:300

اضافہ بھی کر دیتا ہے چنانچہ استاد لاغر مرادآبادی کی شگفتہ گفتگو کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''سحر انصاری کو خدا نے جو مقبولیت بخشی ہے وہ کم ادیبوں کے حصے میں آتی ہے۔وہ نوجوانوں ہی میں اس بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد لاغر مرادآبادی نے وصیت کر رکھی ہے کہ ان کی نماز جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔ہم نے اس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا''میں اپنی کسی کتاب کی رونمائی کا اور اپنے ساتھ شام منانے کا قائل نہیں ہوں شام غریباں کو تو آنا ہی ہے۔اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ شام سحر انصاری کی امامت میں منائی جائے''۔ ہم نے عرض کیا ''انصاری صاحب صرف زندہ ادیبوں کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں'' فرمایا ''پھر تو انہیں میری تقریب میں ضرور آنا چاہیے کیوں کہ مرنے کے بعد میرا شمار بھی زندۂ جاوید ادیبوں میں ہوگا''۔ [1]

استاد لاغر مرادآبادی کی حاضر جوابی بے ساختگی اور شگفتگی میں نشریت کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ نے ایک جگہ ترقی پسند تحریک کے تعلق سے کہا کہ ترقی پسندوں کو صرف زبانی جمع خرچ سے دلچسپی ہے گویا گفتگو تحریر کا نعم البدل بن چکی ہے۔حد تو یہ ہے کہ گفتگو کے نام سے کتاب بھی چھپ گئی ہے۔اس کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے''ترقی پسند تحریک کے نظری مسائل، اثرات اور مخالفین کے اعتراضات پر مشاہرین ادب سے بات چیت''لہٰذا مشفق خواجہ لفظ ''مشاہرین'' کے استعمال کا معمہ حل کرنے کے لیے استاد لاغر مرادآبادی سے رجوع ہوتے ہیں اور لاغر مرادآبادی ''لفظ مشاہرین پر تبصرہ کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک پر اپنی حاضر جوابی اور بے ساختگی کے ذریعہ طنز کے نشتر چلائے ہیں ایک اقتباس دیکھئے:

''انہوں نے فرمایا۔''مشاہرین سے مراد وہ لوگ جو مشاہرہ لے کر.....''

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:38

ہم نے استاد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا کہ ''مشاہرین'' کا مشاہرے سے رشتہ جوڑنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے، ہم نے عرض کیا، اس میں کچھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے'' استاد نے فرمایا'' ہاں اس کا بھی امکان ہے۔ آخر خود ترقی پسند تحریک بھی تو ہماری تاریخ ادب میں کتابت کی ایک غلطی ہی تو ہے''۔ [1]

الغرض سادہ لوحی، حاضر جوابی بے ساختگی اور شگفتگی و لطافت استاد لاغر مرادآبادی کے کردار کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مشفق خواجہ اپنے اس کردار کے ذریعہ ادبی معاشرے کی ناہموار صورت حال پر کبھی طنز کے تیر چلائے ہیں تو کبھی مزاح کا نشانہ بناتے ہیں بلاشبہ استاد لاغر مرادآبادی اردو ظرافت کا ایک قابل ذکر کردار ہے۔

تحریف (Parody)

تحریف (Parody) ظرافت نگاری کا ایک معروف حربہ ہے۔ تحریف یا (Parody) یونانی لفظ ہے جس کا مفہوم الٹا نغمہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی تحریر کے الفاظ کے الٹ پھر سے نئے معنی و مطالب نکالے جاتے ہیں جو مضحک اور ظریفانہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحریف کسی سنجیدہ کلام کی غیر سنجیدہ نقالی کا نام بھی ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریف کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تحریف یا پیروڈی کسی تصنیف کی اس نقل کو کہتے ہیں جس کی ہیئت تو اصل کے مطابق ہو لیکن جس میں الفاظ کی تبدیلی سے ایسے نئے معنی پیدا کیے جائیں کہ وہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر جائے''۔ [2]

گویا صفِ اول کے تمام مزاح نگاروں نے کسی نہ کسی سطح پر تحریف کا حربہ استعمال کیا ہے۔ نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے زیادہ مشکل اور دشوار ہوتی ہے اسی لیے نثر میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جب

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:183

[2] وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ص:245

کہ نظم میں یہ بہت زیادہ مقبول ہے اور قدرے آسان بھی، پطرس کا ''لاہور کا جغرافیہ'' اردو کی آخری کتاب'' وغیرہ نثری پیروڈی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مشفق خواجہ کے ظریفانہ کالموں میں تحریف کے نمونے بہت کم ملتے ہیں یہاں ان کی تحریف کا ایک نمونہ دیکھیے جس کو ہم بلاشبہ اردو ادب کی چند یادگار تحریفات میں رکھ سکتے ہیں یعنی انہوں نے ایک کالم ''ایک اور غالب شکن'' لکھنے کے لیے غالب کی مکتوب نگاری کے اسلوب کی نقالی کی ہے۔ اس کالم میں انہوں نے غالب کے انداز نگارش کی نقل اس خوبی سے کی ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے دراصل یہ کالم منفرد طنز و مزاح نگار محمد خالد اختر کی تصنیف ''مکاتیب خضر'' پر تبصرہ ہے مشفق خواجہ کے مطابق محمد خالد اختر نے غالب کے انداز میں خطوط نگاری کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں خضر مکتوب نگار کا قلمی نام تھا، چنانچہ اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے انہوں نے غالب کی مکتوب نگاری کے اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ غالب کے اسلوب میں لکھے گئے اس خط کا آغاز کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''سعادت و اقبال نشان، اختر فلک معنی و بیان، محمد خالد المتخلص بہ اختر کو
> غالب خستہ کا سلام پہنچے تمہاری کتاب ''مکاتیب خضر'' بہ سبیل ڈاک آئی، تمہارا
> نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں
> شایان لطف گردانا۔ یہاں بہت سوں سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی
> آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو، ظرافت
> میں ید طولیٰ رکھتے ہو، یعنی عجیب و غریب ہو''۔ [1]

سارا کالم غالب کے انداز میں بہ زبانی غالب ہی لکھا گیا ہے لیکن مشفق خواجہ کی خوبی یہ ہے کہ زبان و بیان پر بھرپور قدرت ہے الفاظ کے استعمال کا انہیں بھرپور سلیقہ ہے، چنانچہ اسی انداز تحریف کے ذریعہ انہوں نے محمد خالد اختر کی مکتوب نگاری پر طنز کیا ہے جنہوں نے خطوط نگاری کے لیے غالب کا اسلوب اختیار کیا تھا ہے یہ مشفق خواجہ کا کمال فن ہے کہ انہوں نے بھی اسی انداز کو اختیار کر کے ان کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے اس کالم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو، جس میں انہوں نے الگ راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے لکھتے ہیں

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:24

''اچھا اب اجازت دو کوئی بات بری لگے تو معاف کر دینا مگر خدا کے لیے انتقام کے خیال سے میرے انداز تحریر میں کوئی اور کتاب نہ لکھ دینا۔ میری جان! اپنا راستہ الگ نکالو تا کہ تمہارے لکھے کو دیکھ کر لوگ یہ کہیں کہ ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہاری تحریر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ یہ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ اپنے کرم فرماؤں سے نجات کا طالب۔ غالب''۔[1]

محاورے اور ضرب الامثال

محاورے وضرب الامثال سے مراش وہ جملے ہیں جو زبان زد عام ہو جاتے ہیں اور ایک خاص طرح کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ان میں ردو بدل کر کے یا ان کو توڑ مروڑ کر یا ان کی ترکیب کو بدل کر مختلف معنوں کا اظہار کرنا بھی ایک طرح کی ظرافت ہے۔ ایک کامیاب مزاح نگار محاوروں میں تحریف کر کے نئے معنی پیدا کرتا ہے یا ان میں چند الفاظ کا اضافہ کر کے کچھ کا کچھ مطلب نکال کر حسب منشا یا موقع کے لحاظ سے استعمال کر کے کبھی طنز کرتا ہے تو کبھی مزاح پیدا کرتا ہے۔

مشفق خواجہ نے بھی اپنی تحریروں میں محاوروں اور ضرب الامثال کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے انہوں نے ان محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ اپنے کالموں میں طنز ومزاح پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے، مثلاً: ''گھر کی مرغی دال برابر، ایک ٹوپی دوسرے کے سر، جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا، اینٹ سے اینٹ بجانا، باسی کڑھی میں ابال، قبر میں ٹانگیں لٹکانا، اندھیرے کمرے میں کالی بلی ڈھونڈنا، سانپ سونگھنا، پانی پانی ہونا، بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں، گیہوں کے ساتھ گھن، مردوے پر مٹی ڈالنا، سر آنکھوں پر بٹھانا، ہاتھوں ہاتھ لینا، ڈنکا بجنا، لکیر کے فقیر، وغیرہ۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 27

مشفق خواجہ کے مطابق منیر نیازی نے ایک انٹرویو میں اپنے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے مطالعے کا شوق نہیں ہے۔ جب کسی ادیب کی کوئی کتاب مشہور ہو جاتی ہے تو وجہ شہرت جاننے کے لیے اسے پڑھ لیتا ہوں۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ یہ بات منیر نیازی کی علم دوستی کی دلیل ہے کہ وہ ان کتابوں کو ضرور پڑھتے ہیں جو مشہور ہو جاتی ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں میں جو کتابیں مشہور ہوئی ہیں، خوش قسمتی سے وہ منیر نیازی کی تصانیف ہیں۔ مشفق خواجہ کو ان سے امید ہے کہ انہیں انھوں نے ضرور پڑھا ہوگا، چنانچہ منیر نیازی کو ان کی مشہور کتابوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہوئے محاورے کا خوبصورت استعمال کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:

> ''یہ بات منیز نیازی کی علم دوستی کی دلیل ہے کہ وہ ان کتابوں کو ضرور پڑھتے ہیں جو مشہور رہو جاتی ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں میں جو کتابیں مشہور رہوئی ہیں خوش قسمتی سے وہ منیر نیازی ہی کی تصنیف ہیں امید ہے منیر نیازی نے انہیں ضرور پڑھا ہوگا۔ اگر نہیں تو اب پڑھ لیں، گھر کی مرغی دال برابر' سمجھ نظر انداز نہ کریں''۔[1]

عصر حاضر میں نقادوں کا یہ رجحان عام ہو گیا ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کی فنی خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد اس کا مقابلہ کسی بڑے شاعر سے کر کے اس شاعر کو اس بڑے شاعر کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے مطابق شمس الرحمٰن فاروقی نے منیر نیازی کی نظم 'آغاز زمستان میں دوبارہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پائے کی کوئی نظم فیض نے نہیں لکھی، چنانچہ انھوں نے نقادوں کی اس قدر مبالغہ آرائی پر اظہار کرتے ہوئے، 'ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر' محاورے کا استعمال کرتے ہوئے نقادوں پر یوں طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''شعبدہ باز ٹوپی سے کبوتر کر نکال سکتے ہیں تو نقادوں کے لیے ہاتھ کی صفائی دکھانا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ بھی 'ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر' پر رکھ سکتے ہیں''۔[2]

---

[1] سخن در سخن، مرتب، ص: 184 [2] سخن در سخن، ص: 185

مشفق خواجہ کے مطابق ''فنون، اور اوراق'' رسالے نہیں ادبی دبستان ہیں ہماری ادبی دنیا کی ساری رونق انہیں دبستانوں کی وجہ سے ہے دونوں میں روز اول ہی سے جنگ جاری ہے، ''فنون'' کے حامی سلیم اختر ہیں، تو ''اوراق'' کے حامی انور سدید ہیں۔ لہٰذا ان دونوں میں ہمیشہ قلمی معرکہ آرائیاں خوب چلتی رہتی ہیں مشفق خواجہ نے سلیم اختر کی اس معرکہ آرائی کو محاورے 'اینٹ سے اینٹ بجانے' سے تشبیہہ دی ہے لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ سال ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی دبستان اوراق کی 'اینٹ سے اینٹ بجانے' میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید لکھنے اور 'اینٹ سے اینٹ بجانے' میں کوئی خاص فرق نہیں ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کے بیان کے مطابق ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''انشائیہ اردو ادب میں'' میں انشائیے اور کالم کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کالم دن غروب ہونے سے قبل ہی مرجھا جاتے ہیں اور کبھی کتابی صورت میں چھپ جائیں تو باسی پھولوں کی طرح ان سے خوشبو نہیں اٹھتی۔ انور سدید کی اس رائے سے مشفق خواجہ کو اختلاف ہے، اس کے برعکس وہ انشائیہ کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''انشائیوں کے بعض ایسے مجموعے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں، جو باسی پھول تو واقعی نہیں ہوتے، لیکن انہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے 'باسی کڑھی میں ابال' آرہا ہو''۔ [2]

مشفق خواجہ کے خیال میں پاکستان کی سول سروس میں ابتدا ہی سے اوسط درجے کی صلاحیت، معمولی ذہن رکھنے والے لوگ ہی اس نظام کا جز بنتے چلے گئے۔ ان لوگوں نے ملک کی خدمات کی بجائے خود اپنی خدمت کے اصول پر عمل کیا۔ اس کے علاوہ یہاں کے سول سروس والے کبھی ریٹائر ہونا نہیں چاہتے، چنانچہ پاکستانی سول سروس افسروں کو طنز کا ہدف بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ سخن ہائے گسترانہ، ص: 155 ۲۔ سخن ہائے گسترانہ، ص: 178

''سول سروس والوں کی ایک خوبی اور بھی ہے کہ کوئی شخص ریٹائر نہیں ہونا چاہتا، وہ قبر میں ٹانگیں لٹکانے کی عمر میں بھی کرسی پر ٹانگیں لٹکائے رکھنا پسند کرتے ہیں''۔ [1]

پاکستان کے اہم ادبی جرائد میں ایک جریدہ ''اردو ڈائجسٹ'' بھی ہے مشفق خواجہ کے مطابق'' اردو ڈائجسٹ کی سلور جوبلی کی تقریب پہلے لاہور میں منائی گئی تھی جس کے مہمان خصوصی وزیر اعظم پاکستان تھے، ان کا کہنا ہے کہ یہ تقریب نہایت ہی صاف ستھری تھی اور سامعین نے بڑے انہماک کے ساتھ پانچ گھنٹوں تک مسلسل مقررین کو سنا، چنانچہ سامعین کی اس انہما کی کو مشفق خواجہ نے محاورے کے ذریعہ یوں بیان کیا ہے۔

''ایسی صاف ستھری تقاریب ہم نے کم ہی دیکھی ہیں۔تقریباً پانچ گھنٹوں تک مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سامعین سکون و اطمینان کے ساتھ اس طرح تقریریں سنتے رہے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو، بلکہ مسلسل سونگھ رہا ہو''۔ [2]

مشفق خواجہ کے مطابق ہندوستانی ادیب باقر مہدی قیام پاکستان کے دوران لاہور میں ادبی محفلوں میں صبح و شام شرکت کرتے ہیں اور چہکتے رہے ہیں، لہٰذا باقر مہدی کے چہکنے کی وجہ بتاتے ہوئے یہاں انہوں نے ضرب الامثال کا بڑے فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سننے میں آیا ہے کہ باقر صاحب آج کل لاہور میں ہیں اور وہاں کی ادبی محفلوں میں صبح و شام شرکت کر رہے ہیں اور چہک رہے ہیں۔ چہکنے کی وجہ یہ ہے کہ کشور ناہید ان کی میزبان ہیں۔ گویا 'بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں' والا معاملہ ہے'' [3]

۱۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:29 ۲۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:280
۳۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:171

پاکستان کے مشہور ادیب عبدالعزیز خالد کے بارے میں مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ خالد کو ہم عصروں سے جتنی داد ملی ہے اتنی شاید ہی کسی کو ملی ہوگی، چنانچہ اپنے ہم عصروں میں ان کی شہرت پر اظہار کرتے ہوئے انہوں نے محاورے وضرب الامثال کا بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے،فرماتے ہیں:

''خالد کو ہم عصروں سے جتنی داد ملی ہے اتنی شاید ہی کسی کو ملی ہوگی۔کئی کئی ہزار صفحوں کے خالد نمبروں اور زیرِ نظر کتاب (ارمغان خالد) سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم عصروں نے خالد کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض حسد پیشہ ہم عصروں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے''۔ [1]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں نقادوں کی اہمیت کم ہوکر رہ گئی ہے کیونکہ ان کی تنقید میں اب وہ پختگی نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھی لہٰذا نقادوں کی اس صورت حال پر انھوں نے محاورے کے ذریعہ طنز کا نشانہ بنایا ہے، کہتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا کہ نقادوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا لیکن جب سے ہمارے ادیبوں نے سر اور آنکھوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے تب سے نقادوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے''۔[2]

تحقیق میں اکثر زندہ ادیبوں کی بہ نسبت دارِفانی سے کوچ کر گئے ادیبوں کو زیادہ موضوع تحقیق بنایا جاتا ہے۔اس لیے مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ محققوں کو زندہ ادیبوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور جوں ہی کسی ادیب کا انتقال ہوتا ہے،اس کے حالات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔لہٰذا اس کی وجہ دریافت کرنے کے لیے مشفق خواجہ ایک محقق سے رجوع ہوئے اور پوچھا کہ ''حضرت آپ کسی زندہ شخص پر تحقیق کیوں نہیں کرتے''؟ محقق نے کہا کہ ''زندہ ادیب پر تحقیق کی جائے تو اس کا امکان ہے کہ وہ ہمارے نتائج تحقیق کی تردید کر دے،مردہ ادیب دخل در معقولات کا مرتکب نہیں ہوتا'' چنانچہ محقق کے اس حکیمانہ خیال پر ضرب

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:13

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:107

الامثال کے ذریعہ جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس پر ہم نے عرض کیا: ''تحقیق کیا ہوئی مردوں پر مٹی ڈالنے کا کام ہوا''۔

انہوں نے فرمایا: ''جی ہاں نقاد زندوں پر مٹی ڈالتے ہیں اور ہم مردوں پر''۔[1]

مشفق خواجہ نے جہاں محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ اپنی تحریر کی شگفتگی میں اضافہ کیا ہے وہیں وہ ان محاوروں اور ضرب الامثال میں تحریف کر کے نئے معنی بھی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان محاوروں کی ترتیب اور لفظوں کے الٹ پھیر سے طنز و مزاح کا کام لیتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے مطابق جمیلہ ہاشمی انگریزی میں ایم اے ہیں، اس لیے فرماتی ہیں کہ جو انگریزی میں ایم اے نہیں وہ اچھا ادیب نہیں ہوسکتا لیکن جمیلہ ہاشمی کے اس بیان سے مشفق خواجہ کو اختلاف ہے لہٰذا جمیلہ ہاشمی کے اس بیان کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے برے مزے کی بات کہی ہے:

''محترمہ کی اس بات کو اگر مان لیا جائے (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں) تو پھر غالب، اقبال اور پریم چند جیسے اکابر کے بارے میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ادب تخلیق نہیں کرتے تھے، گھاس کاٹتے تھے اور گھاس منڈی جانے کی بجائے غلطی سے دنیائے ادب کی طرف آ نکلے''۔[2]

موجودہ دور کی ادبی سرگرمیوں میں ادیبوں کا جشن منانا بھی شامل ہے، مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ کوئی ادیب جب پچاس سال مکمل کر لیتا ہے تو اس کی حیات اور خدمات کے سلسلے میں ایک ادبی اجلاس منعقد کیا جاتا ہے اور اس کی ''شخصیت اور فن'' کے تعلق سے ایک عدد کتاب شائع کی جاتی ہے۔ اس طرح کی روایت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی حلقوں میں پائی جاتی ہے، چنانچہ مشفق خواجہ کے مطابق پاکستان میں ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن پر بھی دو کتابیں شائع کی گئیں دو اس لیے کہ ان کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنے کے لیے ایک کتاب ناکافی تھی، چنانچہ انھوں نے محاورے کی تحریف کے ذریعہ موجودہ دور کی

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:148

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص:192

اس روایت پر یوں تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ زمانہ گیا جب کوزے میں دریا سمیٹ لیے جاتے تھے، اب کوزے سے دریا بہائے جاتے ہیں۔ بہر حال اس قسم کی کتابوں سے یہ ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کی ایک عدد شخصیت بھی ہوتی ہے جو ان کے پاس ہو نہ ہو ان سے متعلق کتابوں میں لازماً دکھائی دیتی ہے''۔ [1]

اسی طرح ایک جگہ صادق الخیری کی ٹکسالی اردو کے معیار کو محاورے کی تحریف کے ذریعہ یوں سراہا ہے، لکھتے ہیں:

''صادق الخیری علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے باپ کے چھوٹے بیٹے۔ یعنی مولانا رازق الخیری بڑے بھائی تھے اور وہ چھوٹے ہیں۔ اسی وجہ سے معیاری اور ٹکسالی اردو لکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، وہ دائیں ہاتھ سے اردو لکھتے تو خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے''۔ [2]

تنقید لکھنے کا ایک طریقۂ کار یہ بھی ہے کہ مختلف نقادوں کی تنقیدی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ایک تنقیدی رائے قائم کرنا جس کو محاورتاً چراغ سے چراغ جلانا کہتے ہیں چنانچہ مشفق خواجہ نے اس محاورے کی تحریف کرتے ہوئے اس طرح کے نقادوں کو مزاح کا ہدف بنایا ہے، لکھتے ہیں:

''آج کل بعض محقق نقادوں کے بارے میں بھی چھان بین کر رہے ہیں کہ انہوں نے کس کس چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ حالاں کہ ذہن نقاد، چراغ سے چراغ نہیں جلاتے، دوسروں کا چراغ ہی اٹھالاتے ہیں''۔ [3]

مظہر امام ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں جن کی ادبی خدمات کو مشفق خواجہ نے ادبی نیکیاں کہہ کر ''نیکی کر دریا میں ڈال'' محاورے کی تحریف کر کے ان کی ادبی خدمات کو اس طرح سراہا ہے، فرماتے ہیں:

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص:87

[2] سخن ہائے گسترانہ۔ ص:311 [3] سخن ہائے گسترانہ، ص:123

''مشہور ہندوستانی ادیب مظہر امام کمال کے آدمی ہیں۔ان کی ادبی نیکیاں بے شمار ہیں جنہیں وہ دریا میں نہیں ڈالتے کتابوں کی صورت میں شائع کر دیتے ہیں، یہ نیکیاں کسی اور کے کام آئیں یا نہ آئیں، خود ان کے اپنے کام ضرور آتی ہیں'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق خورشید علی خاں اپنی تصنیف ''کیفی اعظمی شخصیت اور فن کے آئینے میں'' میں مواد کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جو بات جہاں یاد آ گئی وہیں لکھ دی اور لگتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح موصوف کو بھی تحریر میں اشعار نوٹ کرنے کا بہت شوق ہے لیکن آزاد کے پاس اشعار 'آٹے میں نمک کے برابر' ہوتے تھے، لیکن خورشید علی خاں کے پاس معاملہ اس کے برعکس ہے، چنانچہ مشفق خواجہ ''آٹے میں نمک'' محاورے کی تحریف کے ذریعہ خورشید علی خان کے اس انداز تحریر کو اس طرح مزاح کا نشانہ بنایا ہے، کہتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح انہیں بھی شعر استعمال کرنے کا بہت شوق ہے۔مولانا آزاد کے ہاں شعر آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں لیکن خورشید صاحب کے ہاں نمک ہی نمک ہوتا ہے، آٹا چٹکی دو چٹکی سے زیادہ نہیں ہوتا''۔ [1]

الغرض مذکورہ اقتباسات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مشفق خواجہ کو محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال میں کس قدر قدرت حاصل ہے وہ موضوع و مناسبت کے لحاظ سے کبھی سالم محاورے نقل کرتے ہیں تو کبھی حسب منشا ان محاوروں اور ضرب الامثال میں تحریف کر کے طنز و مزاح پیدا کرتے ہیں۔محاوروں اور ضرب الامثال میں تحریف کر کے وہ جس طرح قاری کو محظوظ فرماتے ہیں وہ انھیں کا خاصا ہے۔

---

[1] سخن در سخن۔ص:100

[1] سخن در سخن۔ص:111

تراکیب

مشفق خواجہ نے اپنی تحریروں میں محاوروں وضرب الامثال اور کہاوتوں کے علاوہ ترکیبوں کا بھی بر محل استعمال کیا ہے۔ یہ اپنی تحریر کی روانی میں موقع ومناسبت سے ترکیبوں کا استعمال اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ وہ ترکیبیں ایک خاص معنی ومفہوم دے جاتی ہیں اور ان ترکیبوں کے ذریعہ وہ کبھی موضوع پر طنز کے تیر چلاتے ہیں تو کبھی مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں۔ ذیل میں ان ترکیبوں کی چند مثالیں درج کی جارہی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

''بہر حال اس میں شک نہیں کہ خالد نے اردو زبان کو نئے نئے لفظوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لفظ اتنے بھاری ہیں کہ ان سے آلات حرب وضرب کا کام لیا جاسکتا ہے اور قارئین کو سنگ سار بھی کیا جاسکتا ہے۔ [1]

☆..... جب ایک بڑا محقق ایک بڑے شاعر سے دست وگریباں ہوتا ہے تو قاری کبھی دست بہ دل ہوتا ہے اور کبھی دست بہ سر۔ [2]

☆..... عتیق احمد سے ہمیں ذاتی نیاز مندی کا شرف حاصل اور ان کے صاحب مطالعہ ہونے کے ہم چشم دید بلکہ بچشم گریاں گواہ ہیں۔ [3]

☆..... ممتاز مفتی صاحب نے نمک خوار ہونے کا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا ہے جس کا مقصد محض یہ جتانا ہے کہ وہ قدرت اللہ شہاب کے صرف ہم پیالہ وہم نوالہ ہی نہیں ہم دیگچہ بھی تھے''۔ [4]

☆..... ڈاکٹر نارنگ کی شخصی وجاہت کے ہمیں قتیل نہیں جمیل الدین عالی اور سلیم احمد مرحوم کا شمار بھی زخم خوردگان نارنگ میں ہوتا ہے۔ [5]

☆..... اس کتاب (ہمارے جوش صاحب) میں درجنوں مقامات پر

---

[1] تا [4] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ص: 196, 157, 134, 10 [5] ۔سخن در سخن، ص: 228

دعوتوں کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ان کی مدد سے ایک اچھی خاصی ''لغات طعام، مرتب کی جاسکتی ہے۔[1]

☆.....سید ضمیر جعفری صاحب عمر کی اس منزل میں ہیں جو کام سے زیادہ آرام کی عمر ہے لیکن کام ہی ان کا آرام ہے، اس لیے اگر انہیں اردو کا ''پیر جواں سال'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ [2]

☆.....مختصر یہ کہ اس کتاب (رفیق دل فگاراں) میں عشق و عاشقی کے پیچیدہ مسائل ایسی عمدگی سے حل کیے گئے ہیں کہ تازہ واردان بساط ہوائے عشق کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔اس مناسبت سے اگر کتاب کا نام ''رفیق دِل فگاراں'' کی بجائے ''رہبر دل فگاراں'' ہوتا تو اچھا تھا۔ [3]

☆.....جاذب قریشی کا یہ احسان بھی ہے کہ انہوں نے انجم اعظمی سے کچھ پہلے کے شاعروں یعنی جوش، فراق اور یگانہ وغیرہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اگر وہ انہیں تلاش نہ کرتے تو ان کا شمار کمشدگانِ ادب میں ہوتا''۔ [4]

درج بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تراکیب سے اپنے اسلوب کو خوب سے خوب تر بنانا جانتے ہیں۔اس طرح کی اور بھی بہت سی ترکیبیں مثال کے لیے یہاں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن مقالے کی ضخامت مانع ہے ورنہ مزید مثلیں پیش کی جاتیں۔

اشعار و مصرعوں کا برمحل استعمال:

مشفق خواجہ کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں موقع و مناسبت سے اشعار و مصرعوں کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔وہ اپنی تحریر میں اشعار و مصرعوں کو اس قدر خوبصورتی سے بروئے کار لاتے ہیں کہ وہ اشعار یا مصرعے ان کی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔تحریر میں موقع و مناسبت سے اشعار یا

---

[1] سخن در سخن، ص: 62, 168,۔

[3] سخن ہائے گفتنی۔ص:169 [4] سخن ہائے گسترانہ۔ص:347

مصرعوں کا استعمال کرنے کے لیے بہتر حافظے اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خوبی مشفق خواجہ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مشفق خواجہ جب موقع و مناسبت سے اشعار و مصرعوں کا استعمال کر کے اپنی تحریروں کو شگفتہ بناتے ہیں تو ان کی تحریر کی برجستگی اور معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ نقاد شمیم احمد ایک علاحدہ قسم کے نقاد ہیں، جن کا شمار کسی قسم کے نقادوں میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے میرؔ کے ایک شعر کے ذریعہ بحیثیت نقاد شمیم احمد کی شخصیت پر یوں روشنی ڈالی ہے، کہتے ہیں:

> ''نقادوں کی معروف اقسام کے تحت شمیم احمد کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا حال تو میر تقی میرؔ جیسا ہے
>
> تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
> تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے [1]

مشفق خواجہ کے مطابق طاہر مسعود نے افتخار عارف کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ افتخار عارف کا تعلق دائیں بازو سے ہے یا بائیں بازو سے، وہ ہر مسلک و مشرب کے لوگوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی اپنی شناخت گم ہو جاتی ہے لیکن مشفق خواجہ طاہر مسعود کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ افتخار عارف جس مقام پر ہیں وہاں کسی اور کے بازو ان کے کسی کام کے نہیں ہیں انہوں نے اپنی شناخت خود اپنے بازوؤں کے زور پر قائم کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے افتخار عارف کے زورِ بازو پر امام بخش ناسخ کے ایک شعر ذریعہ یوں روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> ''افتخار عارف جس مقام پر ہیں وہاں دوسروں کا بازو، خواہ بایاں ہو خواہ دایاں، ان کے کسی کام نہیں آسکتا، خود ان کے بازو سلامت رہیں کہ انہیں کے زور پر انہوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ استاد امام بخش ناسخ کے بازو بھی کچھ

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص:139

اس قسم کے تھے جن کا ذکر ان کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

بے قرار کا ہو پتلا مثل موج اے بحر حسن
کیوں نہ ہر بازو کی مچھلی ماہی بے آب ہو [1]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ محمد عقیل کی کتاب ''گئو دھول'' اسم بامسمّٰی کتاب ہے جس میں ہر طرف زندگی کے نشیب و فراز کی دھول ہی دھول نظر آتی ہے اور کہتے ہیں کہ دھول سے یہ مراد نہ لیں کہ دھول جھونک دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''گئو دھول'' اسم بامسمّٰی کتاب ہے۔ ہر طرف دھول ہی دھول نظر آتی ہے۔ مگر یہ دھول سلسلہ روز شب کی ہے نہ کہ اس محاورے کی جو کسی شاعر نے اس شعر میں باندھا ہے:

یہ تو بڑا غضب ہوا، آتے ہی دھول جھونک دی
آپ کی چال ڈھال نے دیدۂ انتظار میں [2]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے ڈاکٹر انور سدید کی دوستی مثالی ہے یہاں تک کہ لفظ ''دوستی'' ان دونوں کے تعلقات کی گہرائی اور نوعیت کا پوری طرح سے احاطہ نہیں کر سکتا۔ ان کے مطابق ایک مرتبہ ڈاکٹر انور سدید سے سوال کیا گیا کہ اگر آپ کی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا سے نہ ہوتی تو آپ کی زندگی میں کس چیز کی کمی ہوتی؟ اس سوال کے جواب میں انور سدید نے فرمایا کہ ''میری زندگی ادھوری رہتی''، چنانچہ مشفق خواجہ نے وزیر آغا سے انور سدید کی اس بے پناہ عقیدت پر انعام اللہ خان یقینؔ کے ایک شعر کے ذریعہ یوں روشنی ڈالی ہے:

''ڈاکٹر انور سدید کو ڈاکٹر وزیر آغا سے بے پناہ عقیدت ہے، یہ عقیدت ایسی ہی ہے جیسی انعام اللہ خاں یقینؔ کو حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے تھی اور جس کا اظہار یقینؔ نے اس شعر میں کیا ہے ؎

---

[1] [2] سخن در سخن، ص:193

سایہ بے شخص نہیں رہتا ہے، کہتا ہے یقیںؔ
آپ سے مجھ کو جدا حضرت مظہر نہ کرو [1]

مشفق خواجہ کے مطابق ایک انٹرویو میں قمر جمیل سے سوال کیا گیا کہ آپ پر الزام ہے کہ جدید ادب کے حوالے سے آپ نے ایک نسل کو بگاڑنے کا کام کیا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ بگاڑنے کا تصور کیوں سامنے آیا؟ قمر جمیل نے اس الزام کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ''ادب میں چرواہے کی طرح بھیڑ بکریوں کو ہنکایا نہیں جاتا''۔ مشفق خواجہ اس سوال سے متفق ہیں نہ جواب سے۔ ان کا کہنا ہے کہ سوال بھی غلط ہے اور جواب بھی۔ جواب اس لیے غلط ہے کہ ہمارے ادبی معاشرے میں ادیبوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا ہی سلوک کیا گیا ہے۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے حالؔی کا ایک شعر درج کیا ہے فرماتے ہیں:

''جواب اس لیے غلط ہے کہ کم از کم ہمارے ہاں ادیبوں سے ہمیشہ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک ہی کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک ہو یا اس کے ردِ عمل میں پیدا ہونے والی جدیدیت کی تحریک، ان دونوں تحریکوں کے علم برداروں نے ادیبوں سے جو خلوص برتا، اسے دیکھ کر، مولانا الطاف حسین حالؔی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

؎ صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

بکریاں مولانا حالی کی ہوں، ترقی پسندی کی جدیدیت کی یا قمر جمیل کی، انجام سب کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے''۔ [2]

مشفق خواجہ اپنی تحریر کو شگفتہ بنانے کے لیے مکمل شعر کے علاوہ موقع مناسبت سے صرف ایک مصرعے کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ استعمال شدہ مصرع ان کی تحریر کا ایک اہم جز بن جاتا ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

---

[1] سخن در سخن، ص: 231
[2] سخن در سخن، ص: 107

مشفق خواجہ کے مطابق رفیق چوہدری بے حد شریف وضع دار اور دوست نواز انسان ہیں حالاں کہ وہ ترقی پسند ہیں، جس سے ان کی بہت سی خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے لیکن پھر بھی ان کی شخصیت بے شمار خوبیوں کی حامل ہے انھوں نے رفیق چوہدری کی پہلو دار شخصیت پر ایک مصرعے کے ذریعہ یوں روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> رفیق چوہدری بے حد شریف، وضع دار اور دوست نواز انسان ہیں اگر ان کی تمام خوبیاں گنوائی جائیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے خدا کے فضل سے وہ ترقی پسند بھی ہیں اگر چہ یہ وصف ان کی بہت سی خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے لیکن پھر بھی اتنی خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں کہ ان کی بنا پر رفیق چوہدری کا نام سن کر یہ مصرعہ بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔
>
> ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں'' [1]

مشفق خواجہ کے مطابق افتخار عارف نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ شہرت ان کے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہی۔ مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ اچھا ہے افتخار عارف نے شہرت کو مسئلہ نہیں بنایا بلکہ اس کو مسائل کے حل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے شہرت ان کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلی ہے اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں عشاق کے پیچھے رسوائی چلا کرتی تھی، لکھتے ہیں:

> ''افتخار عارف نے شہرت کو مسئلہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسے بعض مسائل کے حل کا ذریعہ سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شہرت ان کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں عشاق کے پیچھے رسوائی چلا کرتی تھی۔
>
> آگے آگے تیرا عاشق پیچھے رسوائی چلی [2]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی تحریروں کی بنا پر وہ انہیں ایک نوجوان ادیب تصور

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے، ۔ص:198 [2] ۔سخن در سخن ۔ص:54

کرتے تھے۔اپنے اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مثنوی سحر البیان سے ایک مصرع درجہ کیا ہے۔تحریر کرتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا،لیکن دبستان سرکودھا کے دفاع میں ان کی تحریروں کو ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔ان تحریروں کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ نوجوان ہوں گے۔ویسے ہی نوجوان جس کے حوالے سے میر حسن کا یہ مصرع مشہور ہے: جوانی کی راتیں مرادوں کے دن"۔ [1]

مشفق خواجہ کے مطابق ڈاکٹر انور سدید کی ساٹھویں سالگرہ پر بے شمار ادیبوں نے ان کی علمی و ادبی خدمات پر مضامین لکھ کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے،جن میں سے ایک اہم نام مرزا دیب کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں انور سدید کا ایک قول بھی نقل کیا ہے کہ "روز قیامت میرے اعمال کی پرشس ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور میں پیش کردوں گا کہ یہی میرا اعمال نامہ ہے، چنانچہ مشفق خواجہ نے انور سدید کے اس قول پر غالب کے ایک مصرعے کے ذریعہ یوں طنز کے تیر چلائے ہیں، کہتے ہیں:

> "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انور سدید خود لکھے پر پکڑے جائیں گے انہیں غالب کی طرح شکوہ نہیں ہوگا:
>
> ے پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق [2]

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ خود بھی فکاہی ادب لکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں، چنانچہ ان دونوں کی اس مشترکہ عادت پر ایک مصرع کے ذریعہ انھوں نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> "جعفری صاحب اور کرنل صاحب کا اک مشترکہ کمال یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف خود فکاہی ادب لکھتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں گویا

---

[1] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:114

[2] ۔خامہ بگوش کے قلم سے،ص:117

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے [1]

مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ اخبارات کی صورت حال بہت خراب ہے اب اخبار پڑھنے میں وہ لطف نہیں آتا جو پہلے آتا تھا۔ چنانچہ اخباروں کی اس صورت حال پر فیض احمد فیض کے ایک مصرعے کے ذریعہ یوں روشنی ڈالی ہے۔ کہتے ہیں:

سچی بات یہ ہے کہ اب اخبار پڑھنے میں وہ مزہ نہیں رہا۔ جو کبھی پہلے تھا۔ اب اخبار آتا ہے تو بقول فیض احمد فیض اس طرح آتا ہے جیسے قاصد

کوچۂ یار سے بے نیل مرام آتا ہے [2]

مشفق خواجہ بعض اوقات جملے کی ساخت میں بھی شاعری سے مدد لیتے ہیں، جس سے تحریر میں شعریت کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجیے

اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دلِ ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔

(خامہ بگوش کے قلم سے ص 232)

پہلے کوچۂ صحافت میں وہی آئے تھے جنھیں جان و دل عزیز نہیں ہوتے تھے اب جان و دل کی جگہ ایمان نے لے لی ہے۔

(خامہ بگوش کے قلم سے ص 277)

چہار سو کا تازہ شمارہ ڈاکٹر انور سدید کے ذکر خیر کے لیے وقف ہے، اس میں ڈاکٹر وزیر آغا ڈاکٹر وحید قریشی، جوگیندر پال اور دوسرے کئی اہم ادیبوں نے اک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ (سخن در سخن ص 229)

اب قمر جمیل نے تنقید کے بحر ظلمات میں بھی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے ہیں۔ (سخن در سخن ص 108)

---

[1] سخن ہائے گستراندہ، ص:45

[2] سخن ہائے گستراندہ، ص65

تشبیہات

مشفق خواجہ اپنی تحریروں میں جابجا تشبیہات کے استعمال سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان تشبیہات کے ذریعہ وہ اکثر ہجو ملیح کا کام لیتے ہیں۔یعنی بظاہر تعریف معلوم ہوتی ہے لیکن اصل مقصد طنز کرنا ہوتا ہے۔جیسے ایک جگہ مشفق خواجہ نے منیر نیازی کی شاعری کو قوس قزح کے رنگوں سے تشبیہہ دی ہے اور ان کی باتوں کو بارش سے تشبیہہ دی ہے۔لکھتے ہیں:

> ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ منیر نیازی شاعری اچھی کرتے ہیں یا باتیں۔ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف قوس قزح کے رنگ برس رہے ہوں اور ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے وہ خود برس رہے ہوں۔[1]

اسی طرح آگے ایک جگہ انیس ناگی کی کتاب کی اشاعت کو تازہ ہوا کے جھونکے سے تشبیہہ دیتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو یوں ہجو ملیح کا نشانہ بنایا ہے:

> انیس ناگی کی جب کوئی کتاب چھپتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا ہے۔وہ کسی کے مقلد نہیں نہ کسی کو رہنما مانتے ہیں۔گویا وہ اپنی خوبیوں کے ذمہ دار اور خامیوں کے ماخذ بہ نفس نفیس خود ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔[2]

مشفق خواجہ کے مطابق رسالہ ''شب خون'' صرف رسالہ نہیں ہے بلکہ ایک تحریک ہے۔اس کے قارئین کو انھوں نے آفاتِ ارضی کے متاثرین سے تشبیہہ دی ہے لکھتے ہیں

> ''شب خون رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آبیاری کر رہا ہے۔جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفاتِ ارضی

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے ص 100

[2] خامہ بگوش کے قلم سے،ص 85

کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اسی طرح ''شب خون'' سے متاثر ہونے والوں
کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے [1]

وارث علوی موجودہ دور کے ایک اہم نقاد ہیں۔ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ وہ قلم سے چھری کا کام لیتے ہیں اور ان کے قلم کی چھری بقرعید کے قصابوں جیسی خصوصیات رکھتی ہے۔ یعنی عجلت میں مذبوح سے انصاف نہیں کر پاتی۔ چنانچہ انھوں نے وارث علوی کے قلم کو قصائی کی چھری سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی تنقید نگاری پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ علوی نے قلم سے چھری کا کام لیا ہے لکن یہ کام
بقرعید کے قصائیوں جیسا ہے کہ بربنائے عجلت وہ مذبوح سے انصاف نہیں
کر پاتے اور بعض اوقات تو اتنی عجلت میں ہوتے ہیں کہ بیک وقت کئی بکروں کی
گردنوں پر ان کی چھری چلتی ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ وارث علوی
کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم ہو چکا ہے۔ [2]

مشفق خواجہ نے جہاں اپنی تحریروں میں جابجا اشعار اور مصرعوں کے علاوہ تشبیہات کا استعمال کیا ہے وہیں وہ تلمیحات کو بھی موقع و مناسبت سے اس قدر خوبصورتی سے بروے کار لاتے ہیں کہ وہ تلمیحات ایک علاحدہ معنوں کے ساتھ ایک خاص لطف بھی دے جاتی ہیں۔ جیسے ''کاغذی پیرہن'' یعنی ایران میں ایک روایت یہ تھی کہ فریادی اپنی فریاد کو ایک کاغذ پر تحریر کر کے اپنے جسم پر پہن کر بادشاہ کے حضور میں جاتا تھا۔ اس لباس کو کاغذی پیرہن کہا کرتے تھے۔ مشفق خواجہ نے اس تلمیح کو عبدالعزیز خالد کی تصانیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں برتا ہے۔ لکھتے ہیں

خالد کی کتابوں میں نہایت دبیز اور مضبوط کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ
وہی ہے جس سے پرانے زمانے میں کاغذی پیرہن تیار کیے جاتے تھے۔ فریادی

---

[1] سخن ہائے ناگفتنی، ص 17

[2] سخن ہائے گسترانہ ص 39۔

انھیں پہن کر فریاد کرتے تھے اب کاغذی پیرہن کا رواج نہیں رہا اس لیے کاغذ پر
جو کچھ لکھا ہوتا ہے اسی کو پڑھ کر فریاد کی لے تیز ہو جاتی ہے۔[1]

اسی طرح ایک اور جگہ انھوں نے ''محمود وایاز'' تلمیح کا استعمال کر کے مزاح پیدا کیا ہے۔ محمود وایاز کے ذکر کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں بادشاہ محمود غزنوی کے مساوات کا خیال آتا ہے۔ چنانچہ اس تلمیح کے ذریعے مشفق خواجہ نے اردو ادب کی ناہموار صورتِ حال اور ادیبوں کے ناگفتہ حالات پر یوں طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ڈاکٹر سید محمد عقیل ہندوستان کے صف اول کے نقاد اور محقق ہیں۔ صف دوم یا
سوم کے اس لیے نہیں کہ دیوان اردو میں دوسری اور تیسری صفیں بچھائی ہی نہیں
جاتیں، تمام ادیب ایک ہی صف میں محمود وایاز کی طرح کھڑے رہتے ہیں اور ہر
ایاز اپنے آپ کو محمود سمجھتا ہے۔[2]

زبان و بیان

مشفق خواجہ کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب سادگی، سلاست اور روانی سے عبارت ہے۔ ان کا یہ ظریفانہ اسلوب بظاہر سادہ و آسان دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں کمال درجے کی پرکاری بھی موجود ہے۔ مشفق خواجہ سادہ اور آسان زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں وہ مشکل پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ صحیح اور معیاری زبان لکھنے کے علاوہ وہ درست املا کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی زبان کو بلاشبہ ہم خالص اردو کی ترجمان قرار دے سکتے ہیں۔ ان کا اسلوب گنجلک اور پیچ دار بھی نہیں ہے۔ وضاحت اور ابلاغ ان کے انداز تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ چنانچہ ان کے اسلوب اور زبان و بیان کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 9
[2] سخن در سخن ص 192

> خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے فقروں میں ہمیشہ وہ ارتکاز، بلاغت اور ایجاز پایا جاتا ہے جس کا تصور زبان و بیان کے اسالیب پر گرفت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔[1]

مشفق خواجہ اپنی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں میں زبان اور لغت کے ماہر کی حیثیت سے متعارف ہوئے ہیں۔ انہیں زبان کو تخلیقی اور فنکارانہ مہارت سے برتنے کا فن خوب آتا ہے۔ ان کی زبان میں چاشنی اور لفظوں میں دل آویزی حد درجہ تک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ معصوم مرادآبادی ان کی زبان کی چاشنی اور لفظوں کی دل آویزی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب زبان کی چاشنی، لفظوں کی دل آویزی اور جملوں کی جلوہ گری کا ذکر ہوگا تو خامہ بگوش کی تحریریں مشفق خواجہ کے عالی جاہ ہونے کی گواہی میں از خود صف باندھے نظر آئیں گی۔[2]

مشفق خواجہ کی زبان پھکڑ پن سے عاری ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی ناہموار صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے شدید غم وغصے کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن کسی بھی حال میں اپنی زبان کو بگڑنے نہیں دیتے بہت ہی شائستہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ شمیم حنفی ان کے کالموں کے ایک انتخاب ''خامہ بگوش کے قلم سے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی زبان پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> اس کتاب کے کچھ کالم شدید غم وغصے کی ایک تہہ نشیں موج کا پتہ بھی دیتے ہیں لیکن زبان کسی بھی حال میں بگڑتی نہیں اور ردعمل بے قابو نہیں ہوتا۔ ان تحریروں میں کچھ لوگوں اور باتوں کی طرف بار بار اشارے سے یہ پہلو ضرور نکلتا ہے کہ خامہ بگوش کا جی ابھی بھرا نہیں ہے اور ان باتوں کے دہرائے جانے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔[3]

---

[1] بحوالہ، شمیم حنفی، خامہ بگوش کے قلم ''کتاب نما، دہلی، جولائی 1995ء ص 59۔

[2] بحوالہ، معصوم مرادآبادی، مشفق خواجہ سے ملاقات، ماہنامہ کتاب نما، دہلی، مئی 2005، ص 56

[3] شمیم حنفی، خامہ بگوش کے قلم سے، کتاب نما، دہلی جولائی 1995، ص 59

ایک کامیاب مزاح نگار کے لیے زبان کے علم سے آشنائی بنیادی شرط ہوتی ہے۔ مشفق خواجہ بحیثیت مزاح نگار اس شرط پر پوری طرح کھرے اترتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، ان کے کسی جملے سے کوئی لفظ حذف کر دینا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان کے جملوں کا ہر لفظ ایک مخصوص پس منظر میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محبوب الرحمٰن فاروقی مشفق خواجہ کی زبان پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں مشتاق احمد یوسفی کا ہم پلہ قرار دے کر انہیں لفظوں کا جادوگر کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> خامہ بگوش، یوسفی کے ساتھ ہندوپاک کے ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ایک ہیں جن کی نثر بہت ہی شگفتہ ہوتی ہے۔ جو ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور جن کے جملوں سے کبھی کوئی ایک لفظ حذف کر دینا یا بدل دینا ممکن نہیں۔ ایک ہی لفظ سے کئی معنی پیدا کرنا ان کا خاص وصف ہے۔ وہ لفظوں کے جادوگر ہیں۔ یوسفی کو سمجھنے کے لیے زبان پر پوری قدرت ضروری ہے اور زبان کے ساتھ ہی ہر لفظ کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ لیکن خامہ بگوش کی نثر اور ان کی عبارت میں جو سلاست اور روانہ ہے اور ان کے بیان میں جو سادگی ہے اس کی مثال شاید کہیں اور نہیں ملتی۔ [1]

مشفق خواجہ زبان و بیان کو اس سلیقے سے برتتے ہیں کہ ان کی یہ تحریریں ظریفانہ ہونے کے باوجود بھی سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک کھرے مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ محقق بھی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی تحریروں میں جو بھی بولتے ہیں ایک ادب کے سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے تحریر کرتے ہیں۔ محض طنز و مزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں، وہ خود اپنے مخصوص ظریفانہ اسلوب میں اپنی تحریروں میں موجود سنجیدگی پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے۔ [2]

---

[1] محبوب الرحمٰن فارقی، سخن در سخن، ماہنامہ کتاب نما، دہلی جولائی 1995، ص 87

[2] خامہ بگوش کے قلم سے، ص 5

مشفق خواجہ کی تحریروں میں ظرافت گہری سنجیدگی کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ وہ ظرافت برائے ظرافت کے قائل نہیں ہیں وہ مزاح کو لطفِ کلام کے لیے ضرور بروئے کار لاتے ہیں لیکن ان کا کلام سنجیدہ معنویت اور مقصدیت کا حامل ہوتا ہے۔ بقول محبوب الرحمٰن فاروقی کے:

> خامہ بگوش (مشفق خواجہ نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کا مقصد ادیبوں اور شاعروں کی اصلاح کرنا ہے، اس اصلاح کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا بس سہارا بھر لیا ہے۔[1]

الغرض مشفق خواجہ ''مزاح برائے مزاح کے نہیں بلکہ ''مزاح برائے اصلاح'' کے قائل ہیں۔ ان کی ظرافت مصلحانہ اور مقصدی ظرافت ہے، جس میں علم و آگہی اور دانش مندی کی روایت موجود ہے۔

***

---

[1] محبوب الرحمٰن فارقی، سخن در سخن، ماہنامہ کتاب نما، دہلی جولائی 1995، ص 85

باب ششم

اختتامیہ

اختتامیہ

مشفق خواجہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت اعلیٰ پائے کے محقق، منفرد طنز و مزاح نگار، ممتاز کالم نگار اور ایک اچھے شاعر تھے۔ برصغیر ہندو پاک میں ان کی تحقیق نگاری کو ایک خاص وصف حاصل ہے۔ تحقیق میں وہ جس قدر سنجیدہ تھے اس کو پڑھتے ہوئے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں ہو پاتا کہ یہ شخص اپنی طبیعت میں اس قدر بزلہ سنجی لیے ہوئے ہے۔ ہم ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو کہیں سے بھی ہمیشہ یہ اشارہ نہیں ملتا کہ یہ شخص جو ہمیں مسکرانے پر مجبور کر رہا ہے، اس کی طبیعت میں اس قدر سنجیدگی بھی ہے۔ یہ دو خصوصیتیں جو آپس میں متضاد ہیں اور جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، مشفق خواجہ اپنی طبیعت میں اس طرح سموئے ہوئے تھے کہ جب ایک کا استعمال کرتے تھے تو دوسری آڑے نہیں آتی تھی۔ یہ خصوصیتیں کسی بھی شخص کی شخصیت کو بنانے کے لیے کافی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ مشفق خواجہ اردو دنیا میں ان خصوصیتوں کے ساتھ اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔

جیسے کہ پہلے بھی مذکورہ ہو چکا ہے کہ مشفق خواجہ کی مزاح نگاری کی ابتداء کالم نویسی سے ہوتی ہے ان کا پہلا فکاہیہ کالم 15 نومبر 1970 کو روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں ''اندیشہ شہر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس کے لیے انھوں نے قلمی نام ''غریب شہر'' اختیار کیا تھا۔ یہیں سے ان کی فکاہیہ کالم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ انھوں نے 1970 سے 1997 تک مختلف اوقات میں مختلف اخبارات کے لیے فکاہیہ کالم لکھے۔ ان اخباروں میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف فرضی ناموں سے یہ کالم شائع ہوتے رہے لیکن ان کا سب سے مشہور فکاہیہ کالم ''سخن در سخن'' ہے جو ''خامہ بگوش'' کے فرضی نام سے شائع ہوتا تھا، اور اسی کی بدولت انھیں بے پناہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ ان کے کالموں کا اسلوب مکمل ظریفانہ اور طنز آمیز ہوتا ہے۔

چنانچہ وہ اپنی شگفتہ اور پر لطف تحریروں کی بدولت ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ان کی فکاہیہ تحریروں میں سیاسی یا سماجی حالات کوموضوع نہیں بنایا بلکہ ادب،ادیب اورادبی دنیا کے مختلف مسائل کے علاوہ ادبی سرگرمیوں کی ناہموارصورتِ حال کونشانۂ تمسخر بنایا ہے۔خالص ادبی موضوعات کوان سے پہلے کسی مزاح نگار نے باقاعدہ استعمال نہیں کیا تھا۔وہ ادب کے شیدائی تھےاس لیےان کے طنز و مزاح کا مقصداورادبی صورتحال کی اصلاح تھا۔

مشفق خواجہ کا مطالعۂ بہت وسیع ہے۔ادب کے تقریباً تمام موضوعات پر انھیں بھرپور دسترس حاصل ہے۔ادب ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کی علمیت اور وسیع معلومات کے قدرداں نظر آتے ہیں۔عطاالحق قاسمی ان کے ذخیرۂ معلومات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان کی شوخی تحریر کا کمال یہ تھا کہ ان کا طنز ومزاح بے پایاں علم میں رچا بسا ہوتا تھا۔معلومات کا ایک ذخیرہ تھا جوان کے فکاہی کالم میں نظر آتا تھا۔مگر ایک اچھے ''باورچی'' کی طرح وہ اپنا ادبی پکوان اس مہارت سے تیار کرتے کہ مرچ مصالحہ الگ تیرتا نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ پکوان کا حصہ بن کر اس کی لذت میں اضافہ کرتا تھا۔علم اورطنز ومزاح کا یہ سنگم ہمارے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے[1]

[1] عطاء الحق قاسمی،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے،مشفق من خواجہ من۔ص 47

مشفق خواجہ کے وسیع مطالعہ کی ستائش جمیل الدین عالی نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ان کی طنزیات کےلفظ لفظ سےان کے انتہائی وسیع مطالعہ ادب (بطور خاص کلاسیسک کی روشنیاں پھوٹی تھیں[2]

[2] جمیل الدین عالی،مشفق خواجہ: اردو ادب کاایک زندہ دل درویش ، urdustan.com،یکم نومبر 2002،ص5

مشفق خواجہ خواہ کسی موضوع پر بھرپور طنز کریں،شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔یہی

وجہ ہے کہ ان کے مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہے۔ نہایت ہی شائستگی سے وہ ادب، ادیبوں، شاعروں اور ناقدین پر چوٹ کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے اسدرضا لکھتے ہیں:

> مرحوم مشفق خواجہ کو اردو زبان وادب کی تاریخ میں ایک محقق کے طور پر تو یاد کیا ہی جائے گا لیکن ایک طنز ومزاح نگار کے طور پر انھوں نے خامہ بگوش کے قلمی نام سے جو کالم یا مضامین تحریر کیے وہ نہ صرف برصغیر ہندو پاک بلکہ عالمی اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مشفق خواجہ نے ادب، ادیب، ناقد وشاعر اور محقق وطنز ومزاح نگار کے بارے میں جس ادبی شان وشگفتگی سے لکھا ہے، اس کا مقابلہ کوئی مرحوم یا زندہ طنز ومزاح نگار نہیں کرسکتا، مرحوم مشفق خواجہ کی تحریریں پھکڑ پن سے مبرا ہیں۔ طنزیہ ومزاحیہ ادب کو سب سے پہلے ادب ہونا چاہئے۔ اس کسوٹی پر مشفق خواجہ کی تقریباً تمام مزاحیہ وطنزیہ تحریریں کھری اترتی ہیں [1]

[1] اسدرضا، ایک شگفتہ مزاج تھا نہ رہا، ماہنامہ کتاب، نما دہلی، مئی 2005ء، ص 63

مشفق خواجہ کی تحریروں میں طنز کی گہری کاٹ ضرور ملتی ہے لیکن اتنی نہیں کہ مردم بیزاری کی حد کو چھولیں یہی نہیں بلکہ ان کے طنز کی کاٹ میں دل آزاری یا جذبہ انتقام جیسے عناصر بھی نہیں پائے جاتے وہ صرف اصلاح کے مقصد سے کسی ادبی مسئلہ کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین ان کے طنز کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی طنز نگاری کو بے مثال کہا ہے اور ان کی طنز کی کاٹ کو برداشت کرنے کے لیے گہرے ظرف کا ہونا لازمی سمجھتے ہیں:

> کبھی کبھی ان کی تحریروں میں طنز کا وار گہرا ہو جاتا تھا لیکن ان کی نیت ہمیشہ صاف رہتی تھی۔ اچھے طنز سے محظوظ ہونے اور اسے برداشت کرنے کے لے گہرے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض حلقے ان سے ناراض بھی رہتے تھے لیکن ان کی بے مثال طنز نگاری کے معترف بھی تھے۔''[1]

[1] مجتبیٰ حسین، مشفق خواجہ کی یاد میں، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی اپریل 2005، ص 32

مشفق خواجہ جب کسی ادبی شخصیت یا اس کی کسی ادبی تخلیق کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں تو وہ پوری ایمانداری اور دیانتداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی قسم کے تعلقات کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن ان کے طنز کا انداز شائستہ اور مہذب ہوتا ہے۔ لوگ باوجود ہدفِ تنقید کے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ محمد خالد اختر نے ان کے غیر جانبدارانہ طنز کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ان کے قلم کا ڈسا پانی نہیں مانگتا! اس سلسلے میں وہ دوست دشمن کا امتیاز روا نہیں رکھتے۔[1]

[1] محمد خالد اختر، مشفق خواجہ: اردو ادب کا ایک زندہ دل درویش، urdustan.com، یکم نومبر 2002، ص 5

مشفق خواجہ حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کی کسی بھی ناہموار صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں اور بلا کسی خوف کے وہ سچ بات کو نہایت شائستگی سے کہہ دیتے ہیں۔ جو ان کی بات کو سمجھ لیتے ہیں وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں اور جن کے یہاں حس مزاح نہیں ہے وہ ناراض ہو جاتے ہیں لیکن اکثر ان کے طنز کی صداقت کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے طنز کی کاٹ اور ان کی اس حقیقت پسندی کی ستائش کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

> خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے طنز و مزاح کی بنیاد عام طور سے سچائی اور حقیقت پر ہوتی ہے۔ جس بات کو سنجیدگی کے ساتھ کہنے میں خوف، فسادِ خلق مانع ہوتا ہے، اسے خامہ بگوش طنز و مزاح کے سہارے کہہ دیتے ہیں اور جس کے بارے میں کہتے ہیں اگر وہ اصل بات کو سمجھ لے اور ہنس کر خاموش ہو جائے تو گویا تیر نشانے پر لگ گیا اور اگر برا مان جائے تو یہ کہنے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے کہ بھائی! یہ تو محض مذاق ہے اور آپ میں اتنی حس مزاح بھی نہیں کہ مذاق

سمجھا کریں۔ چوں کہ لوگ اپنی ذہانت اور حس مزاح پر بات نہیں آنے دیتے اس لیے عام طور سے ہنس ہنس کر یہ تیر کھا لیتے ہیں۔ گویا خامہ بگوش کے تیر غالب کے ''تیر نیم کش'' بن جاتے ہیں۔ ہم نے شروع میں ادب میں قاضی عبدالودود کے ظلم و ستم اور نادر شاہی رویے کا ذکر کیا تھا مگر ان کا مارا آہ زاری اور فریاد تو کر لیتا تھا، خامہ بگوش کا کمال یہ ہے کہ ''مارے اور رونے بھی نہ دے''۔[1]

[1] خلیق انجم، کچھ خامہ بگوش کے بارے میں، ماہنامہ کتاب نما، دہلی، جولائی 1995ء، ص 51

مشفق خواجہ کی تحریروں کی اسی صداقت کی بہت سے لوگوں نے تعریفیں کی ہیں۔ محمد اقبال جاوید رقم طراز ہیں:

حق یہ ہے کہ مشفق خواجہ ایک سچے قلمکار تھے۔ ان کی تحریروں میں جذبات کی صداقت، احساس کی لطافت اور انداز کی نفاست جلوہ گر تھی اور باتوں باتوں میں قارئین کے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھیں کہ ادب زندگی سے نکھرتا اور زندگی ،ادب سے سنورتی ہے۔[1]

[1] محمد اقبال جاوید، مضمون اٹھ گیا ناوک فگن، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص 31

جمیل الدین عالی نے بھی ان کی طنز کی اسی کاٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی ظرافت میں جس قدر ذکاوت، قدرت تحریر، بلاغت اور کاٹ کا عنصر پایا جاتا ہے وہ ماہرین مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ پاک و ہند کے کسی اور مزاح نگار کی تحریر میں یہ عنصر نہیں دیکھائی دیتا وہ لکھتے ہیں:

معاصرین میں جناب مشتاق احمد یوسفی کا مقام تو گویا ایک بے مثال کرامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلاتکلف خواجہ صاحب کی سی ذکاوت، قدرت تحریر، بلاغت اور کاٹ پاک و ہند اردو میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔[1]

ے جمیل الدین عالی، مشفق من خواجہ من، مرتب محمد عالم مختار حق، مشفق خواجہ
ہمہ صف نا دررروزگار شخصیت تھے۔ص 86

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جس طرح سے ادبی سرگرمیوں کی ناہموار صورتِ حال کو طرح دار جملوں اور طنز کی گہری کاٹ کے ذریعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ یہ کالم ادبی کوتاہوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ان کے کالموں کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی مقبولیت کو یوں سراہا یا ہے وہ لکھتے ہیں:

> جب انھوں نے پہلے روزانہ جسارت، کراچی اور پھر ہفت روزہ تکبیر (کراچی) میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی شخصیات پر کالم نگاری کا آغاز کیا تو یہ اچھنبے کا تماشا ثابت ہوا اور بطورِ طنز نگاران کے جوہر کھلے، ایسے ایسے کاٹ وار فقرے، طرح دار جملے اور پہلو دار کنایے کہ خامہ کی مانندی عالم انگشت بدندان والا عالم ہوگیا۔ جس پر کالم لکھا اس کے علاوہ ہر شخص دوسروں کو کالم کے خاص خاص جملے سناتا۔ دراصل ادبی کوتاہیوں جھوٹ، منافقت اور نالائقیوں کے خلاف یہ کالم ایک نوع کے صدائے احتجاج تھے۔
>
> ڈاکٹر سلیم اختر، مشفق خواجہ، ہفتہ روزہ، ہماری زبان، نئی دہلی، 8 تا 28 اکتوبر 2005، مشفق خواجہ نمبر۔ص 10

مشفق خواجہ کی طنز و مزاح نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اس سے متعلق پوری جانکاری حاصل کرتے ہیں اور تمام متعلقہ معلومات سے استفادہ کے بعد ہی وہ اپنے طنز کے تیر چلاتے ہیں وہ نہ تو کسی تعصیب کی بنا پر طنز کرتے ہیں اور نہ ہی کسی سے مرعوبیت کو ان کے یہاں دخل ہے بلکہ وہ بغیر کسی مفاد کے صرف ادب، ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کی اصلاح کو مدنظر رکھ کر اپنی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی ایمانداری، سچائی وصداقت، بھرپور معلومات، غیر جانبداری اور

بے باکی کی وجہ سے اکثر ناقدین ودانشوران کی تعریفیں کرتے ہیں۔عرفان احمد خان کے مطابق ان کی اسی بے باکی اور بے لحاظی نے انھیں طنز ومزاح نگاروں میں منفرد مقام عطا کر دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ادیبوں کے حوالے سے ان کی معلومات بڑی اپ ٹو ڈیٹ تھیں اور وہ ادیبوں کی ISI کا درجہ رکھتے تھے۔بیشتر ادیبوں کی تو انھوں نے با قاعدہ فائلیں بنا رکھی تھیں۔خدا خیر کرے، وہ فائلیں غلط ہاتھوں میں نہ چلی جاتیں۔ان ہی معلومات کا بھرپور استعمال وہ ادیبوں کے حوالے سے اپنے مشہور کالم لکھتے ہوئے کرتے تھے۔دو چار خوش قسمت ادیبوں کے سوا کوئی ان کی طنز نگاری سے بچ نہ پایا جس میں بے باکی اور بے لحاظی کا عنصر پڑا نمایاں تھا اور اسی چیز نے انہیں طنز مزاح نگاریں میں منفرد مقام عطا کر دیا۔''[1]

[1] عرفان احمد خان، مضمون آدھا کراچی، مشمولہ مشفق من خواجہ من، ص 77

مشفق خواجہ کا طنز ومزاح سپاٹ نہیں ہے یا ظرافت کے عام مضمون میں نہیں آتا جو صرف ہنسی مذاق تک ہی محدود ہے بلکہ ان کے طنز ومزاح میں کئی رنگ ملتے ہیں ایک طرف دل لگی خوش طبع اور ہنسی مذاق کا عنصر ہے تو دوسری طرف ان کا مزاح نہایت سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے چنانچہ ان کے طنز ومزاح کی اس ہمہ رنگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوسف ناظم نے انھیں ظرافت نگاری کا انشاء اللہ خان قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

> کچھ لوگ خامہ بگوش کے مزاح کو ''اصولِ ظرافت'' کے پیمانوں پر جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ خامہ بگوش نے خود اپنے مزاح سے خود اصولِ ظرافت متعین کیے ہیں۔ہم چونکہ ان کے طرف داروں میں سے ہیں اس لیے ہم انھیں ظرافت نگاری کا انشاء اللہ خان انشاء ماننے میں پیش پیش ہیں اور بات یہ ہے کہ یہ ان کی طرف داری نہیں بلکہ ان کی طرح داری کا اعتراف ہے۔ان کے مزاح کے کئی رنگ ہیں۔قرمزی بھی اور تفنن بھرا رنگ بھی۔[1]

ایوسف ناظم، قلم کوید کہ من خامہ بگوشم، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، جولائی 1995ء، ص 70

مشفق خواجہ کے طنز وظرافت میں برجستگی کا عنصر بہت نمایاں ہے وہ کسی بھی موضوع پر بے تامل و بے ساختگی سے عمدہ مزاح لکھنے میں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی اس قلم برداشتگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ان کی مزاحیہ تحریروں کو ابن انشاء کی تحریروں کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> وہ طنز وظرافت سے گفتگو میں کام نہیں لیتے تھے، قلم برداشت نہایت عمدہ مزاح لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ مختلف ناموں سے مختلف اخبارات و رسائل میں کالم لکھتے تھے۔ ان کا ایک مشہور قلمی نام خامہ بگوش تھا۔ اس نام سے ان کے بے شمار کالم ہفت روزہ تکبیر کراچی میں شائع ہوئے ہیں جن کا انتخاب مظفر علی سید نے تین جلدوں میں کیا ہے۔ پہلی جلد ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کئی سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ مزید دو جلدیں 2004ء میں سخن ہائے ناگفتنی اور سخن در سخن کے عنوانات سے حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں بے ساختہ مزاح کی اعلیٰ پائے کی تصانیف ہیں اور میرے نزدیک ابن انشاء کی مزاحیہ تحریروں کے ہم پلہ ہیں [1]

[1] ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مشفق انسان، لاجواب محقق، مشفق من خواجہ من، ۔ ص 38

مشفق خواجہ کی ظرافت نگاری میں ایک طرح کی ہیئت کذائی ہے یعنی کسی موضوع کے مضحکہ پہلو کو نمایاں کرنے یا ہجو کرنے کے لیے جو خاکہ تیار کرتے ہیں اس میں دلچسپی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے چاہے وہ خاکہ کتنا ہی ناقابل قبول ہی کیوں نہ ہو، کیوں وہ تفکر اور بصیرت کے عناصر سے مالا مال ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلوب احمد انصاری ان کی ظرافت کی ہیئت کذائی کو رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے یہاں اور ان سے ذرا پہلے فرحت اللہ بیگ کے یہاں ان عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے مشفق خواجہ کی بصیرت اور فکری

عناصر کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

ان کے ہاں ایک طرح کی کردار نگاری ہی نہیں بلکہ ایک نوع کی ہیئت کذائی یعنی caricaturing سے دل چسپی کا اظہار بھی ملتا ہے۔جدید دور میں طنز و مزاح کے سیاق وسباق میں صرف دو ہی درجہ اول کے اہل قلم ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کہ ان دونوں کے ہاں تفکر کے جو عنصر اور بصیرت اور دانائی ہے۔شاہد ہی کہیں اور نظر آئے گی اور ان سے ذرا پہلے نظر مرزا فرحت اللہ بیگ پر جم کر رہ جاتی ہے۔

[1] اسلوب احمد انصاری، مشفق خواجہ کی یاد میں، ہفتہ روزہ، ہماری زبان، نئی دہلی 8 تا 28 اکتوبر 2005ء، ص 5

اس طرح آگے وہ ان کی ظرافت میں موجود احساس کی نرمی اور لطافت کی بھی ستائش کرتے ہیں اور مشفق خواجہ کی ظرافت کو پطرس بخاری کی ظرافت نگاری کے مماثل قرار دیتے ہیں۔لکھتے ہیں:

ان کے ہاں جو ہلکی پھلکی ظرافت، احساس کی جو نرمی اور لطافت اور سادہ رنگوں سے تصویر کو مزین کرنے کا جو ملکہ ہے وہ ہمیں البتہ پطرس بخاری کی یاد دلاتا ہے۔وہ اپنے مورد طنز کے جسم میں ایسی مہین مہین چٹکیاں لیتے ہیں کہ وہ تلملانے لگتا ہے اور اسکے جھوٹے ایغو کا نشہ تھوڑی دیر کے لیے ہرن ہو جاتا ہے۔

[1] اسلوب احمد انصاری، مشفق خواجہ کی یاد میں، ہفتہ روزہ، ہماری زبان، نئی دہلی، 8 تا 28 اکتوبر، 2005ء، مشفق خواجہ نمبر، ص 5

مشفق خواجہ کے طنز و مزاح کی ایک خصوصیت ان کا منفرد اسلوب بھی ہے ان کے اسلوب میں ادبی چاشنی ملتی ہے۔وہ تشبیہات، محاوروں اور مختلف صنعتوں کے عمدہ استعمال سے ادب کو ایک ایسا انوکھا اسلوب دیا ہے جس کے وہ خود بانی بھی تھے اور خاتم بھی۔ان کے اس اسلوب کی اسی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجتبیٰ حسین ان کی موت کو ادب کا بڑا نقصان قرار دیتے ہیں۔فرماتے ہیں:

مشفق خواجہ کی موت ہمارے ادب کا کوئی معمولی نقصان نہیں ہے کہ وہ اپنے پیچھے جو خلاء چھوڑ گئے ہیں وہ ایسا نہیں ہے۔ جو پر ہو جائے گا کیوں کہ وہ ادبی طنز نگاری کے ایک مخصوص اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔

(ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، اپریل 2005، مشفق خواجہ کی یاد میں، از مجتبیٰ حسین، ص 30)

مجتبیٰ حسین کی طرح نامی انصاری نے بھی ان کے اسلوب کی اس انفرادیت کو سراہاتے ہوئے مشفق خواجہ کے نثر کو مشتاق احمد یوسفی کی نثر کی طرح دوٹوک اور سجی ہوئی نثر قرار دیا ہے اور خاص لوگوں میں ان کا شمار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

اس کو مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ جس نے مشفق خواجہ اور مشتاق احمد یوسفی کو نہیں پڑھا، اس نے گویا جدید اردو نثر کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ایسی چٹیلی و دوٹوک اور سجی ہوئی نثر لکھنے کے لیے جس ذہانت، ذکاوت، طباعی، مجادلت، ذہنی تربیت اور فطری مناسبت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قدرت بڑی فیاض سے ہر ایک کو نہیں عطا کر دیتی بلکہ خاص خاص لوگوں کو کوچی ودیعت کرتی ہے۔ مشفق خواجہ ان ہی خاص لوگوں میں سے ایک تھے۔

(نامی انصاری، مشفق خواجہ: ایک بے مثل، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2005ء، ص 27)

مشفق خواجہ ایک کامیاب مزاح نگار ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں بھرپور قدرت و مہارت حاصل ہے وہ اپنی تحریروں میں ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں ان کے کسی جملے سے کسی لفظ کو حذف کر دینا یا بدل دینا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان کے جملے کا ہر لفظ ایک مخصوص پس منظر میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ زبان کو اس سلیقے سے برتتے ہیں کہ ان کی یہ تحریریں اپنی ظرافت کے باوجود سنجیدہ نظر آتی ہیں۔ وہ ایک کھرے مزاح نگار ہونے کے ساتھ سنجیدہ نقاد اور محقق بھی ہیں اس لیے وہ اپنی ظریفانہ

تحریروں میں جو کہتے ہیں ادب کے ایک سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے کہتے ہیں۔ محض طنز ومزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں کیوں کہ وہ مزاح برائے مزاح کے نہیں بلکہ مزاح برائے اصلاح کے قائل ہیں ان کی ظرافت مصلحانہ ظرافت ہے جس میں علم آگہی اور دانش مندی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

مشفق خواجہ کی مزاح نگاری ان کی کالم نگاری کے حوالے سے ہی مشہور ہے کیوں کہ ان کے عہد میں طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا رواج تھا اور کالم نگار سماج کی ناہموار صورتحال پر اپنی طنز ومزاح نگاری کے تیر چلاتے تھے۔ مشفق خواجہ کے کالم مشکل موضوعات سے متعلق نہیں ہوتے تھے اور نا ہی انھوں نے پیشہ وار کالم نویسوں کی طرح کسی سماجی وسیاسی مسئلہ کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا بلکہ ادب، ادیب اور ادبی ناہمواریوں کے علاوہ ادیبوں کی تحریروں اور ان کے ارشادات کو موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ اپنے کالموں کے انھیں موضوعات کی جدت پسندی کی وجہ سے انھوں نے پوری ادبی دنیا کو متاثر کیا ہے۔

مشفق خواجہ کے ادبی کالموں کا ہر جملہ ان کے مزاج کی تازگی، طنز کی برجستگی اور تنقیدی بصیرت کا احاطہ کرتا ہے۔ اپنی اسی انفرادیت کی بدولت انھوں نے پوری اردو دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ ان کے کالموں کے جملے ادبی محفلوں میں بہت مقبول تھے چنانچہ انور سدید ان کے کالموں کی اسی مقبولیت کو سراہاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ اردو صحافت کے ایسے کالم نگار تھے جن کے کالم ہندو پاک کے نامور اخبارات میں مکرر پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کالموں کی تخلیقی حرارت نشریت اور اظہار کے قرینے اور کاٹ دار زاویوں کا تذکرہ ادبی محفلوں میں ہوتا ہے اور ان کے جملے غزل کے اشعار کی طرح دہرائے جاتے ہے۔[1]

[1] انور سدید۔ مشفق خواجہ کے سخن ہائے گسترانہ، ہفتہ روزہ ہماری زبان، نئی دہلی 15 تا 21 مارچ 2007ء،

مشفق خواجہ کے کالم اپنے موضوعات کی مناسبت سے ادبی طنز ومزاح کے مثالی مرقع بن گئے

ہیں۔اسی سبب نامی انصاری نے بھی ان کے ہر کالم کو ایک مرقع غزل قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> مشفق خواجہ کے ان فکاہیہ کالموں میں دنیا جہاں کی باتیں نہیں ہیں۔ان میں صرف کتاب، مصنف اور اردو کی ادبی دنیا کے نشیب وفراز پر ہی خامہ فرسائی کی گئی ہے لیکن اس طور سے کہ ایک ایک کالم ادبی طنز ومزاح کا مثالی مرقع بن گیا ہے گویا ہر کالم ایک مرقع غزل ہے جس کا ہر شعر (واقعہ یا پیراگراف) قاری سے بے ساختہ خراجِ تحسین وصول کرلیتا ہے۔[1]

[1] مشفق خواجہ: ایک مثل، از نامی انصاری، ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی ستمبر 2005، ص 27

انور سدید ہی کی طرح ان کے چٹخارے دار طنزیہ جملوں کی مقبولیت کو سراہتے ہوئے خلیق انجم نے انھیں مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی کے زمرے میں شامل کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

> ہمارے زمانے کے تین مزاح نگار اور کالم نویس ایسے ہیں جن کے چٹخارے دار طنزیہ فقرے لوگ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے موقع بے موقع اچھے اور برے شعر پڑھے جاتے ہیں۔ یہ تین حضرات ہیں، ہندوستان کے مجتبیٰ حسین اور پاکستان کے خامہ بگوش، مشتاق احمد یوسفی۔[1]

[1] خلیق انجم، کچھ خامہ بگوش کے بارے میں، ماہنامہ کتاب، نمائی دہلی، جولائی 1995ء، ص 53

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں ادیبوں کو ان کی تحریروں اور ان کے ارشادات کے حوالے سے کچھ اس انداز سے ہدف طنز بناتے ہیں کہ مضروب، ضرب سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ مزاحیہ جملہ کو اس فنکاری سے تراشتے ہیں کہ ان کے طنز ومزاح کے امتزاج سے ایک ایسا لطف پیدا ہوتا کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔لہٰذا ان کے مزاحیہ کالمون کی ان ہی خوبیوں کی بنا پر ممتاز احمد خان نے ان کے کالموں کے مجموعوں کو نا قابل فراموش ادبی سرمایہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں

> وہ ادیبوں کوان کی تحریروں اورانٹرویواورارشادات کے حوالے سے مزاح اورطنز کانشانہ اس طرح بناتے تھے کہ مضروب کوبھی ضرب سے لطف سے لطف کا مزا حاصل ہوتا تھا۔ان کا اسلوب مزاح اورطنز ایک علیحدہ ہی طرز رکھتا تھا۔مشفق خواجہ جملے میں سے مزاحیہ جملہ تراشنے کا فن جانتے ہیں جن میں سے دو متضاد مزاحیہ وطنزیہ صورت ہائے احوال کے امتزاج سے ایک ایسا منظر نامہ وجود میں آتا تھا جس سے کوئی بھی قاری محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتا تھا۔ان کے کالم کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ معاندانہ نہیں ہوا کرتا تھا۔خامہ بگوش کے قلم سے سخن درسخن اور سخن ہائے ناگفتنی ناقبال فراموش ادبی سرمایہ ہے۔

[1] ممتاز احمد خان، مشفق خواجہ نگینہ شخص رخصت ہوا۔سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو، دہلی جولائی اگست ستمبر 2005ء، ص48

مشفق خواجہ کے یہ کالم ان کی ادبی شخصیت کے آئینہ دار ہیں ان کالموں کے ذریعہ وہ نہایت ذی علم، وسیع المطالعہ اور ہر اعتبار سے باخبر شخص ظاہر ہوتے ہیں۔یہی وہ وصف ہے جس سے وہ چند گنے چنے اہل علم میں شمار ہوتے ہیں۔غرض معصوم مرادآبادی ان کے کالموں کی علمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اپنے عہد کے چند اہم اہل علم لوگوں میں شمار کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> خامہ بگوش، کی تحریریں پڑھ کر ذہن میں ان کی جو تصویر نقش ہوئی تھی ان سے ملنے کے بعد اس میں نئے رنگ پیدا ہوئے۔میں نے انہیں ایک نہایت ذی علم وسیع المطالعہ اور ہر اعتبار سے باخبر شخص پایا۔ان کے کالم پڑھ کر ان کی علمیت، باخبری، بزلہ سنجی، شوخی تحریر کا جو نقش ذہن پر مرتسم تھا اس میں یہ بھی اضافہ ہوا کہ وہ اپنے عہد کے ان معدودے چند اہل علم میں سے ایک ہیں جن کی تاب یہ زمانہ مشکل سے ہی لاپائے گا۔[1]

[1] معصوم مرادابادی، خامہ بگوش سے ملاقات، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مئی

2005ء، ص 59

مشفق خواجہ کے کالموں کے موضوعات میں ادب، ادیب کے علاوہ ادبی کتابیں بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے کالموں میں بے شمار ادبی کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ ان تبصروں میں ان کی تنقیدی بصیرت کے جوہر کھلتے ہیں۔ ادب پاروں کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تنقید ظریفانہ تنقید کے ذیل میں آتی ہے جسے شگفتہ تنقید بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تنقید میں وسیع مطالعہ دیانتداری غیر جانبداری کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے، مشفق خواجہ اپنے تبصروں میں جب کسی تصنیف یا ادب پارے کو موضوع تنقید بناتے تو اس تصنیف یا ادب پارے کا مکمل تجزیہ پیش نہیں کرتے بلکہ اس تصنیف کے چند ایسے پہلوؤں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جن تک عام قاری کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ زیر مطالعہ ادب پارے پر تھوڑی دیر کے لے ایسے زاویوں سے روشنی ڈالتے کہ اس کی خوبیاں و خامیاں ایک نظر میں سامنے آجاتی ہیں۔ یہ اپنی تنقیدی رائے دینے کے لیے طویل طویل بحثیں یا قدم قدم پر نظریہ سازی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے ذوق سلیم و وسعت مطالعہ کی روشنی میں اس ادب پارے کے تعلق سے ایسے محاکے پیش کرتے ہیں کہ قاری کی تنقیدی بصیرت میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ کسی ادب پارے پر تنقید کرتے ہوئے جس شگفتگی سے خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں اسی شگفتگی سے ادب پارے کی اصلاح بھی کرتے ہیں یہ ان کی تنقید کی ایک اور اہم خصوصیت ہے چنانچہ ان کی اس شگفتہ تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمد اقبال جاوید لکھتے ہیں:

> مشفق خواجہ کی تنقید میں شگفتگی کا بانکپن تھا اور ان کی شگفتگی میں نقد و نظر کی ایک ایسی کاٹ کہ زد میں آنے والا بھی، نہ صرف کیف اندوز ہوتا ہے بلکہ لاشعوری طور پر اپنی اصلاح بھی کرتا چلاتا تھا کیونکہ ادب کے جس نقطۂ عروج پر بیان کی خوبیاں، ذہن کے تنقیدی زاویے اور قلم کی تعمیری شوخیاں، پختہ تر ہو کر ایک معیاری لطافت بن جاتی ہیں۔ وہ مزاح کہلاتا ہے۔ مشاہدے کی قوت اسے

ابھارتی،سوچ کی سچائی اسے سنوارتی اور خیال کی رفعت اسے پرنم کش بنا دیتی

ہے۔

[1] پروفیسر محمد اقبال جاوید، اٹھ گیا ناوک فگن، مشفق من خواجہ من، ص 26

مشفق خواجہ بنیادی طور پر شگفتہ مزاج رکھتے ہیں۔لہٰذا ان کی تنقید میں بھی ان کی شگفتہ مزاجی کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ وہ روایتی ناقدین کی طرح اپنی تنقید میں خشک مزاجی اور بیزار رویئے سے کام نہیں لیتے بلکہ انتہائی بذلہ سنجی سے ادب پاروں کے محاسن بیان کرتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ان کی تنقید نگاری کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تنقید کو روایت سے ہٹ کر لکھی گئی تنقید کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

> یوں تو متعدد تخلیق کاران کے پاس اپنی تصانیف لاتے اور مقدمے لکھوا کر اپنی ''بھول چوک'' پر خود ہی ماہی بے آب کی طرح لوٹتے اور پھر اگلی بار دوبارہ مشفق خواجہ کے قلم کا ''امرت'' لینے پہنچ جاتے۔ وہ عام روایت سے ہٹ کر رہنے والے ناقد تھے۔انھوں نے کبھی روایتی ناقدین جیسا خشک، بیزار اور نفرین رویہ کسی کے ساتھ نہیں رکھا بلکہ اس کی نسبت وہ انتہائی بذلہ سنجی ہنس مکھ اور حاضر جواب تھے۔شگفتہ مزاجی ان کے اخلاق کا حصہ تھی۔[1]

[1] ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، مشفق خواجہ علم و ادب کا خزینہ تھے، مشفق من خواجہ من۔ص 113

مشفق خواجہ نے جس طرح سے ادبی معاشرے کی ناہموار صورتِ حال اور شاعروں، ادیبوں اور ناقدین کی جملہ کوتاہیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اس کی مثال اردو تنقید نگاری میں بہت کم ملتی ہے۔ان کی تنقید کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیق انجم نے انھیں اردو تنقید نگاری میں قاضی عبدالودود کا ہم پلہ قرار دیا ہے کہتے ہیں:

> ہمارے زمانے میں دو حضرات ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اردو ادیبوں اور شاعروں کی زندگی خاصی حرام کی ہے۔ان میں پہلے تو خدا مغفرت

کرے ہمارے بزرگ قاضی عبدالودود تھے جو اپنے علم، مطالعے اور حافظے کے زور پر محققوں کی اتنی غلطیاں نکالتے تھے کہ جو ادیب یا محقق بھی ان کا شکار رہتا تھا وہ اور اس کے اساتذہ اور اس کے اعزہ اور احباب بھی منہ چھپائے پھرتے تھے اور دوسرے ہیں، خدا انھیں سلامت رکھے خامہ بگوش جو اپنے طنز و مزاح کے نشتروں اور ذہانت سے کام لے کر ادیبوں اور شاعروں کی رسوائی کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں۔

[1] خلیق انجم، کچھ خامہ بگوش کے بارے، ماہنامہ کتانما ئی دہلی، جولائی 1995ء، ص 49

مشفق خواجہ کی تنقید میں غیر جانبداری انتہائی درجہ کی ہے وہ کسی ادب پارے کی خوبیاں وخامیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے جو بھی لکھتے ہیں بے لاگ اور غیر جانبدار ہو کر لکھتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ان کی تنقید کی اس غیر جانبداری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مشفق خواجہ عبدالحئی درحقیقت ہر ادبی حوالے سے بے مثل تھے لیکن تنقیدیں ان کا جتنا نام معتبر ہے، اتنا ہی تمام حلقوں میں مانا ہوا بھی ہے۔ اپنے خاص قلم کی نوک سے انھوں نے کبھی سوچے سمجھے بغیر کسی پروا نہیں کیا اور جب بھی لکھا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ البتہ ان کے قلم کی میٹھی مگر گہری چوٹ کھانے والا جہاں اپنے گھاؤ پر تڑپے بیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خود ناقد کی چوٹ لگاتے تو مسیحائی بھی اپنے ہی ہاتھوں سے کر دیتے۔

[1] ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، مشفق خواجہ علم وادب کا خزینہ تھے، مشفق من خواجہ من۔ ص 113

مشفق خواجہ کے کالم بظاہر ان کے حس مزاح کے آئینہ دار ضرور ہیں لیکن قدیم وجدید ادب پر ان کی گہری وناقدانہ نظر کے ترجمان بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریروں کی اس خصوصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مخمور سعید لکھتے ہیں:

روزمانہ ''جسارت'' کے لیے خامہ بگوش کے قلمی نام سے انھوں نے جو کالم لکھے ہیں وہ ان کی لطیف حس مزاح کے ہی آئینہ دار نہیں، قدیم وجدید ادب پر ان کی گہری ناقدانہ نظر اور ہم عصر ادبی صورت حال سے ان کی مکمل باخبری کے بھی گواہ ہیں۔[1]

[1] مخمور سعیدی، مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ص 65

مذکورہ بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تنقیدی شعور بہت پختہ اور قوی ہے اس کے علاوہ ان کی تنقید کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے تنقید جیسی سنجیدہ صنف کو بھی طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں برتا ہے۔

مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالموں کے مطالعہ اور ناقدین و دانشوروں کی آراء کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ مشفق خواجہ ایک ایسے کالم نگار تھے جنھوں نے اپنی تحریروں میں دیگر مزاح نگاروں کی طرح سماجی و سیاسی صورت حال کو نشانہ تمسخر نہیں بنایا بلکہ اپنے عہد کے تمام طنز و مزاح نگاروں سے ہٹ کر اپنی الگ راہ نکالی۔ ادب، ادیب اور ادبی صورتحال ان کا خاص موضوع رہا۔ وہ شاعروں، ادیبوں اور ناقدین کی ادبی کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے انھیں ان کی اصلاح پر مجبور کرتے تھے۔ ان کے طنز کا وار بہت گہرا ہوتا تھا اور مضروب چھوٹ کی گہرائی کو محسوس ضرور کرتا، لیکن ان کے پیچھے ان کے خلوص اور جذبے کی شدت کو بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے بے لاگ اور بے لحاظ طنز کی زد میں آنے کے بعد بڑے بڑے ادیب ان سے اپنی کتابوں پر رائے دینے کی فرمائش کرتے تھے اور یہ ان کے طنز کی خوبی تھی۔

ان کے مزاحیہ کالموں کا موضوع چونکہ ادب، ادیب اور ادبی موضوعات رہے ہیں اسی لیے وہ جہاں کتابوں پر رائے دیتے ہیں وہاں ان کا تنقیدی شعور بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی تنقید میں اعتدال نظر آتا ہے۔ وہ غیر جانبداری سے موضوع پر اظہار خیال کرتے اور ان کی کوتاہیوں کو بڑے عالمانہ لیکن شگفتہ انداز میں نشاندہی کرتے۔ ان کی شگفتہ مزاجی کی جھلکیاں بلاشبہ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں یہی

وجہ ہے کہ ان کی تنقید بھی شگفتہ تنقید کہلاتی ہے۔

غرض مشفق خواجہ نے بغیر کسی مفاد کے ادب کے لیے اپنے طنز ومزاح کے ذریعہ جو خدمات انجام دیں ہیں اسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا وہ اردو ادب سے بے پناہ محبت کرتے تھے کیوں کہ ادب ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ اس لیے جب کبھی وہ ادب کی کسی ناہمواروناگوار صورت حال سے گذرتے تو انھیں شدید تکلیف ہوتی اور وہ فوراً اس پر قلم اٹھاتے تھے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف اصلاح ادب ہوتا تھا وہ چاہتے تھے کہ ادیبوں اور شاعروں کے یہاں جو خامیاں در آئیں انھیں دور کیا جائے اور ان کی اصلاح کی جائے ان کے طنز کے پیچھے ان کے اصلاح کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ ان کے بے باکانہ اور بے لحاظ طنز کی چوٹ اتنی گہری ہوتی جو نہ صرف مضروب ادیب کو متاثر کرتی بلکہ پوری ادبی دنیا اس سے متاثر ہوتی برسوں تک ان کے لگائے سوالوں کے نشان لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہوتے تھے اور یہی ان کے طنز ومزاح کی خوبی تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں نئی نئی تشبیہات واستعارات، عمدہ محاوروں اور ضرب الامثال اور مختلف صنعتوں کے ذریعہ نہایت ہی شگفتہ اور لطیف انداز میں اس طرح وار کرتے کہ چوٹ کھانے والا بار بار چوٹ کھانے کے لیے تیار ہوجاتا اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے ان کی ان ہی خصوصیات کی بدولت اردو کے نامور ادیب، دانشور اور ناقدین ان کی طنز ومزاح نگاری کے معترف اور قدرداں ہیں۔ مشفق خواجہ کے مزاحیہ کالم اردو ادب میں اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ عصر حاضر کے طنز ومزاح نگاروں کی فہرست میں صف اول میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں اور بلاشبہ جب کبھی اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کی تاریخ لکھی جائے گی مشفق خواجہ کے نام کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔

***

کتابیات

مشفق خواجہ کی تصانیف

1	خوش معرکہ زیبا جلد اول، دوم	مجلس ترقی ادب لاہور،	1970ء
2	ابیات	مکتبہ نیا دور کراچی،	1978
3	اقبال (از احمد دین)	انجمن ترقی اردو پاکستان،	1979
4	جائزہ مخطوطات اردو	مرکزی اردو بورڈ لاہور،	1979ء
5	غالب اور صغیر بلگرامی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی،	1985ء
6	تحقیق نامہ	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی،	1991ء
7	مرزا یگانہ شخصیت فن	آصف پبلی کیشنز، علی گڑھ،	1992ء
8	خامہ بگوش کے قلم سے (کالموں کا مجموعہ)	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور،	1995ء
9	پرانے شاعر نیا کلام	کراچی،	1995ء
10	انتخابِ کلام میرؔ	کراچی،	2000
11	سخن ہائے ناگفتنی (کالموں کا مجموعہ)	اکادمی بازیافت کراچی،	2004ء
12	سخن در سخن (کالموں کا مجموعہ)	اکادمی بازیافت کراچی،	2004ء
13	انور سدید، سخن ہائے گسترانہ، (کالموں کا مجموعہ)	فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی۔	2004ء
14	یادِ ایام،	شعبہ تصنیف و تالیف، و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی	2006
15	کلیاتِ یگانہ،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007ء
16	جوش اور خامہ بگوش (کالموں کا مجموعہ)	.....	.....

دیگر تصانیف

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	ابن اسماعیل	اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب	گلشن پبلشرز سری نگر،	1988
2	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	1979
3	احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	آزاد کتاب گھر دہلی	1952ء
4	احمد جمال پاشاہ	ظرافت اور تنقید	بہار اردو اکادمی پٹنہ	1982ء
5	اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	شاد بک ڈپو، پٹنہ	
6	اشفاق احمد ورک	اردو نثر میں طنز و مزاح	بیت الحکمت، لاہور	2004ء
7	اعجاز حسین	اردو ادب آزادی کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ	-
8	اعجاز حسین	ادب و ادیب،	ادارۂ انیس اردو الہ آباد،	1960ء
10	امداد صابری،	تاریخ صحافت اردو،	-	-
11	امیر خان شاہین،	اردو اسالیب نثر، تاریخ و تجزیہ،	انجمن ترقی اردو دہلی	1934
12	ایسہ سلطانہ،	حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما	حیدرآباد	1986
13	بطرس بخاری،	بطرس کے مضامین،	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی،	
14	جمیل جالبی،	تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ دوم)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1984
15	خلیق انجم،	مشفق خواجہ ایک مطالعہ،	ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر، نئی دہلی	1985ء
16	خلیل الرحمٰن اعظمی،	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ،	1979ء
17	خواجہ عبدالرحمن طارق،	جوش اور خامہ بگوش،	فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی۔	
18	خواجہ عبدالغفور،	طنز و مزاح کا تنقید جائزہ،	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔	1983ء
19	رشید احمد صدیقی،	طنزیات و مضحکات،	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی،	1973
20	سردار جعفری،	ترقی پسند ادب،	انجمن ترقی اردو علی گڑھ،	1951ء
21	سلام سندیلوی،	ادب کا تنقیدی مطالعہ۔	-	1961ء
22	سلطان آزاد،	بہار میں اردو طنز و ظرافت،	مکتبہ آزاد، پٹنہ، بہار	1989ء

23	سلیم اختر،	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،	کتابی دنیا نئی دہلی،	2002ء
24	سلیمان اطہر جاوید،	تنقید افکار،	نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد،	1977ء
25	سید محمد عقیل رضوی،	تنقید اور عصری آگہی،	انجمن تہذیب نو، الہ آباد،	1972ء
26	سید اقبال قادری،	رہبر اخبار نویسی،	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی،	2008
27	طارق سعید،	اسلوب اور اسلوبیات،	لاہور،	1998
28	طارق سعید،	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب،	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ،	1996
29	طاہر تونسوی،	طنز و مزاح تاریخ و تنقید،	نئی دہلی	1986ء
30	طاہر مسعود،	یہ صورت گر کچھ خوابوں کے،	مکتبہ تخلیق ادب کراچی۔	1985ء
31	طیبہ خاتون،	اردو ادب میں نثری تاریخ،	مرکزی پرنٹرز دہلی،	1989ء
32	ظفر عالم ظفری،	اردو صحافت میں طنز و مزاح،	فیروز سنز لاہور،	1996
33	عرشیہ جبین،	شارب ردولوی، شخصیت اور تنقید نگاری،	مصنفہ، حیدر آباد۔	2005ء
34	فرقت کاکوروی،	اردو ادب میں طنز و مزاح،	ادارہ فروغ اردو لکھنو،	1964ء
35	فرمان فتحپوری،	اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	1992ء
36	قمر رئیس،	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر،	ثمر آفسٹ پریس نئی دہلی،	1987ء
37	قمر رئیس،	اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت،	دہلی،	1986
38	گوپی چند نارنگ،	ادبی تنقید اور اسلوبیات،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1989ء
39	مجتبیٰ حسین،	قطع کلام،	مکتبہ ہم زبان کراچی،	1989ء
40	مجنوں گورکھپوری،	ادب اور زندگی،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ،	1988ء
41	محمد شاہد حسین،	ابلاغیات۔		
42	محمد طاہر،	مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات	مصنف، اعظم گڑھ۔	2003ء
43	محمد عالم مختار حق،	مشفق من خواجہ من،	بک مین لاہور،	2006ء
44	محمد یعقوب عامر،	اردو کے ابتداء ادبی معرکے،	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	2000

45	محمد یونس فہمی،	اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی 1947ء کے بعد	الیاس ٹریڈرس پبلشیر، حیدرآباد	1979
46	محمد خان،	بجنگ آمد	کتاب والا دہلی،	1996ء
47	مصباح الحسن قیصر،	اردو طنز و ظرافت	منشی سجاد حسین،	1978
48	مظفر حنفی،	آزادی کے بعد دہلی میں طنز و مزاح،	اردو اکادمی دہلی،	1996ء
49	مظہر احمد،	اردو شاعری میں طنز و مزاح	شبانہ پبلی کیشنز، دہلی۔	2001ء
50	مظہر احمد،	پیروڈی،	شبانہ پبلی کیشنز، دلی۔	1991ء
51	منظر عباس نقوی،	اسلوبیاتی مطالعے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ،	1989ء
52	نامی انصاری،	آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح،	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ،	2003
53	نامی انصاری،	بیسویں صدی میں طنز و مزاح (انتخاب نثر)،	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔	2002ء
54	نورالحسن نقوی،	تاریخ ادب اردو،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	2005
55	وحید الرحمن خان،	خامہ بگوش۔ایک مطالعہ۔	اکادمی بازیافت۔کراچی	2004ء
56	وزیر آغا،	اردو ادب میں طنز و مزاح،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ،	1999
57	لیس۔جے صادق،	اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد،	حیدرآباد،	1975

رسائل و جرائد

1	اردو ادب (سہ ماہی)	انجمن ترقی اردو ہند دی نئی دہلی	جولائی اگست ستمبر 2005
2	اردو دنیا (ماہنامہ)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی،	نومبر 2005
3	ایوان اردو (ماہنامہ)	اردو اکادمی دہلی،	ستمبر 2005
4	شاعر (ماہنامہ)	ممبئی	مئی 2005ء
5	شگوفہ (ماہنامہ)	حیدرآباد دکن	ستمبر 1981ء
6	شگوفہ (ماہنامہ)	حیدرآباد دکن	جون 1995

7	شگوفہ(ماہنامہ)	حیدرآباددکن	جولائی1995
8	شگوفہ(ماہنامہ)	حیدرآباددکن	جون1999ء
9	شگوفہ(ماہنامہ)	حیدرآباددکن	مارچ2004ء
10	شگوفہ(ماہنامہ)	حیدرآباددکن	جون2004ء(خلیج نمبر)
11	شگوفہ(ماہنامہ)	حیدرآباددکن	جنوری2005ء(سالنامہ)
12	کتاب نما(ماہنامہ)	نئی دہلی	جولائی1995ء
13	کتاب نما(ماہنامہ)	نئی دہلی	اپریل2005ء
14	کتاب نما(ماہنامہ)	نئی دہلی	مئی2005ء
15	کتاب نما(ماہنامہ)	نئی دہلی	مارچ2009ء
16	ہماری زبان(ہفتہ روزہ)	نئی دہلی	8تا28/اکتوبر 2005ء
17	ہماری زبان(ہفتہ روزہ)	نئی دہلی	15تا21/مارچ 2007ء
18	ہماری زبان(ہفتہ روزہ)	نئی دہلی	22تا28/مارچ2008ء
19	ہماری زبان(ہفتہ روزہ)	نئی دہلی	22تا28/مارچ2009ء
20	تخلیقی ادب۔۲،(کتابی سلسلہ)	عصری مطبوعات کراچی،	1980
21	پاکستانی ادب(جلد دوم وسوم)(کتابی سلسلہ)	فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی	1981
22	''ادراک''کتاب ششم(کتابی سلسلہ)	مرکزتحقیقات اردو وفارسی گوپال پوربہار	2007
23	نقوش(سہ ماہی)	لاہور	جنوری رفروری 1959ء (طنزومزاح نمبر)

روزنامے

1	منصف (روزنامہ) آئینہ ادب	حیدرآباد دکن۔یکم مارچ	2007
2	منصف (روزنامہ) آئینہ ادب	حیدرآباد دکن۔2 راگست	2007
3	منصف (روزنامہ) آئینہ ادب	حیدرآباد دکن۔23 راگست	2007
4	منصف (روزنامہ) آئینہ ادب	حیدرآباد دکن۔9اپریل	2009

انسائیکلوپیڈیا اور لغات

The New Encyclopedia Britanica 1993, Volume V, Edtion 15, willium beton 1

2	اردو انگلش ڈکشنری	مولوی عبدالحق	2001
3	علمی اردو لغت	مولوی وارث سرہندی	1983
4	فیروز الغات	مولوی فیروز الدین	2000
5	نور الغات	مولوی نور الحسن نیر	1998

اردو ویب سائٹ

1- sherosukhan.com 2- Urdustan.com

3- Urdustan.com 4- kitabghar.com

5- Urdu123.com 6- Urdudost.com

***